اسلام کی دعوت

مولانا سید جلال الدین عمری

فہرست مضامین

تنظیم کیسے مستحکم ہوتی ہے؟ ۳۲۹

☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طبع یازدہم

اسلام اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے نام پیغام ہے۔ وہ روئے زمین کے تمام انسانوں کے لیے ایک دعوت ہے۔ قرآن مجید نے اس دعوت کے مقصد، طریقۂ کار اور دنیا و آخرت میں اس کے انجام کو بڑی وضاحت اور تفصیل سے بیان کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مقدسہ اور احادیث میں اس سلسلے کی بہترین رہ نمائی موجود ہے۔ میں نے قرآن و حدیث کی روشنی میں اس موضوع کو جیسا کچھ اور جتنا کچھ سمجھا ہے، اس کے مختلف پہلوؤں کو اس کتاب میں الفاظ کا بہتر سے بہتر جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے۔ میں نے دعوت کو ایک زندہ موضوع کی حیثیت سے دیکھا ہے اور اسی حیثیت سے اسے اس میں پیش کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان اوراق کے مطالعہ سے یہی نہیں کہ دعوت کا صاف اور واضح تصور ابھر کر سامنے آئے گا، بلکہ کارِ دعوت کے لیے جذبہ اور حرارت بھی محسوس ہوگی۔ اس کتاب کے اندازِ بیان کی وجہ سے بعض دوستوں نے، ازراہِ محبت اسے ہمارے دعوتی لٹریچر کی سب سے مؤثر کتاب کہا ہے۔ مجھے اس کی ورق گردانی کا کبھی اتفاق ہوتا ہے تو کہیں کہیں آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں اور احساسِ ندامت دامن گیر ہونے لگتا ہے کہ چھوٹے منہ سے اس میں بڑی باتیں کہی گئی ہیں اور ایک ناتواں اور کم زور انسان نے عزم و حوصلہ اور استقامت کا درس دیا ہے۔

یہ کتاب، چالیس سال سے بھی زیادہ عرصہ گزرا، ۱۹۶۸ء میں تحریر کی گئی تھی۔ اس کے بعد بھی یہ موضوع میرے پیش نظر رہا۔ اس سلسلے کی بعض تحریریں بھی شائع ہوتی رہیں۔ میرا ارادہ اس کتاب پر تفصیل سے نظر ثانی کا تھا، لیکن اپنی مختلف مصروفیات کی وجہ سے اس کام میں خاصی لمبی مدت لگ گئی۔ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ اب یہ خدمت کسی درجہ میں سرانجام پائی ہے۔ میں نے پوری کتاب پر نظر ڈالی ہے۔ زبان و بیان کے پہلو سے اسے مزید بہتر اور شستہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ جہاں تک مباحث کا تعلق ہے بعض مباحث میں تھوڑی بہت ترمیم اور اصلاح ہوئی ہے۔ بعض کی ترتیب بدلی گئی ہے۔ بعض کو ازسرِ نو لکھا گیا ہے، خاص طور پر 'دعوت کے لیے ضروری اوصاف' کی بحث میں خاصے نئے مواد کا اضافہ ہوا ہے۔ میرا ایک رسالہ 'اسلام - ایک دینِ دعوت' کے نام سے عرصے سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ بھی دست یاب ہے۔ اس کے بعض مباحث اس کتاب میں شامل کر لیے گئے ہیں۔ خیال ہے کہ اب یہ کتاب پہلے کے مقابلے میں نسبتاً بہتر شکل میں پیش ہو رہی ہے۔ اس کی ضخامت بھی تقریباً دوچند ہوگئی ہے۔ انسان کا کوئی کام نقائص سے پاک نہیں ہوتا، اس لیے ہزار کوشش کے باوجود کتاب میں غلطیوں اور خامیوں کا پایا جانا یقینی ہے۔ اصحابِ علم سے گزارش ہے کہ وہ اس کی کمیوں سے آگاہ فرمائیں، آئندہ اس کی اصلاح کردی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے گا اور یہ عاجز تہ دل سے شکر گزار ہوگا۔

دعوت کے موضوع پر ایک اور ضخیم کتاب زیرِ ترتیب ہے، اس میں دعوت کے بعض اہم علمی اور فکری پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اندازِ تحریر بھی دعوتی اور تاثراتی کی جگہ علمی اور تجزیاتی ہوگا۔ اس کا بڑا حصہ مکمل ہو چکا ہے۔ دعا ہے اور آپ سے بھی دعا کی درخواست ہے کہ جو حصہ رہ گیا ہے اللہ تعالیٰ جلد اس کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ انه علی كلّ شیء قدیر و بالاجابة جدیر۔

اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے اس کتاب کو اپنے فضلِ خاص سے مقبولیت عطا کی۔ اس وقت اس کا گیارہواں ایڈیشن طباعت کے لیے تیار ہے۔ پاکستان سے بھی اس کی اشاعت عمل میں آئی ہے۔ بعض حلقوں کے نصاب میں یہ شامل ہے۔ اب کی بار اس کو مزید بہتر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ کتاب کے ترجمہ کی طرف احباب کی توجہ ہے۔ ہندی، تلگو اور کنڑ زبان میں اس کا ترجمہ شائع ہوچکا ہے۔ انگریزی کے معروف ادیب اور مصنف کی بعض دیگر کتابوں کے مترجم پروفیسر عثمان محمد اقبال کے قلم سے اس کا انگریزی ترجمہ Inviting to Islam کے عنوان سے مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ بعض دوسری زبانوں میں بھی اس کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کوششوں کو قبول فرمائے، ان کی افادیت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو اور اس عاجز کے لیے آخرت میں نجات کا ذریعہ ثابت ہو۔

جلال الدین

۱۰ر جنوری ۲۰۱۲ء

طبع چہار دہم

اس وقت اس کتاب کا چودہواں ایڈیشن پریس میں جا رہا ہے۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ اس نے ایک بے علم کی تحریر کو مقبولیت عطا کی۔ میں نے اس بار بھی کتاب پر ایک نظر ڈالی ہے۔ کمپوزنگ کی غلطیاں درست کی ہیں، کہیں کہیں لفظی ترمیم کی ہے، جہاں ضرورت محسوس ہوئی اپنا مدعا زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے مزید مقبولیت سے نوازے۔ اس کا نفع عام ہو اور اس خطاکار کے لیے آخرت میں مغفرت اور اجر و ثواب کا ذریعہ بن جائے۔

جلال الدین

۵/مارچ ۲۰۱۶ء

مقدمہ

اسلام اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ دین ہے۔ آج کا انسان اللہ تعالیٰ سے اور اس کے اس دین سے غافل ہے۔ لیکن یہ تاریخ کا کوئی نیا واقعہ نہیں، بلکہ اس کا بہت پرانا مرض ہے۔ اس نے بارہا اللہ تعالیٰ سے منہ موڑا اور اس کے دین سے غفلت برتی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب کبھی وہ غفلت میں پایا گیا اللہ کے نیک بندوں نے اسے جگانے کی کوشش کی اور اسے اس کے دین کی طرف متوجہ کیا۔ لیکن موجودہ دور کا سب سے بڑا سانحہ یہ ہے کہ جس امت کو اسے بیدار کرنے اور اللہ کا دین اس تک پہنچانے کا حکم دیا گیا تھا وہ اپنا فرض نہیں پہچان رہی ہے، بلکہ صحیح معنی میں اس کو اس بات کا احساس تک نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بھولی ہوئی اس دنیا میں اسے کتنا بڑا کام انجام دینا ہے۔ وہ موت کی نیند سو رہی ہے اور اس کے ساتھ ساری نوعِ انسانی پر موت کا عالم طاری ہے۔

اس امت کا ایک ماضی بھی ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ نے آخری مرتبہ اپنا دین نازل کیا اور اسے حکم دیا کہ وہ اس دین کو اس کے بندوں کے درمیان پھیلائے اور اسے غالب و سربلند کرنے کی جدوجہد کرے، لوگوں کو معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے، خیر کی راہ دکھائے اور شر سے باز رکھے، دنیا سے جور و ظلم کو مٹائے اور عدل و انصاف کو قائم کرے۔ اس امت نے اللہ کے اس حکم کو دل سے سنا اور اسے پورا کرنے کے لیے تیار ہوگئی۔ مخالف قوتوں نے ہر طرح اسے دبانے کی کوشش کی اور ہر پہلو سے اس کا

مقابلہ کیا، لیکن وہ اس عزم و ارادہ کے ساتھ میدان میں جمی رہی کہ یا تو اللہ کی مرضی پوری ہوگی یا وہ اس راہ میں اپنا سب کچھ لٹادے گی اور جان دے دے گی۔ وہ اپنے اس عزم میں سچی تھی اس لیے مخالف قوتوں کو بالآخر شکست ماننی پڑی۔ کفر و باطل کا پرچم سرنگوں ہوگیا اور اللہ تعالیٰ کا دین فتح یاب ہوا، بدی کی ظلمت چھٹ گئی اور نیکی کی سحر طلوع ہوئی۔ یہ اس امت کی صحیح ترین حالت تھی۔

ایک مدت تک امت اپنی اس حالت پر قائم رہی۔ پھر اس پر زوال آنا شروع ہوگیا۔ اس کی وہ بے تابی کم ہوگئی، جس نے باطل کے خلاف اس کو صف آرا کیا تھا، اس کا وہ عزم و حوصلہ مضمحل ہوگیا، جس کی بدولت اللہ کے دین کو سربلندی ملی تھی، اس کا وہ جوش و جذبہ سرد پڑنے لگا، جس نے پوری دنیا میں ہلچل پیدا کردی تھی اور غلط افکار و خیالات، بگڑی ہوئی تہذیب و معاشرت اور فاسد اخلاق اور گندی سیاست کے مراکز کو ہلاکر رکھ دیا تھا۔ اس کیفیت کے کم ہونے کے بعد اسلام دوسرے حلقوں میں کیا پھیلتا خود اس امت کے اندر اس کے اثرات دھندلے پڑنے لگے۔ لیکن اس کے باوجود ابھی تک بحیثیت مجموعی پوری امت کو اسلام کے اصول وکلیات پر ایمان تھا، اس کے قانون کی برتری کو وہ مانتی تھی اور اس کو اس بات سے قطعاً انکار نہیں تھا کہ اسلام ہی کو انسان کی پوری زندگی اور اس کے تمام معاملات پر فرماں روائی کا حق حاصل ہے اور یہاں اسی کی حکومت ہونی چاہیے۔ اس کے اندر اس قسم کی بحثیں نہیں ہوتی تھیں کہ اللہ کا یہ دین غالب ہونے کے لیے آیا ہے یا وہ مغلوب بھی رہ سکتا ہے، اس کا سربلند ہونا ضروری ہے یا اس کو دوسروں کی محکومیت قبول کرلینی چاہیے، باطل سے برسرِ پیکار ہونا اس کے لیے صحیح ہے یا اس کے ساتھ مصالحت کی روش بھی وہ اختیار کرسکتا ہے؟

جس دور سے ہم گزر رہے ہیں یہ غالباً اس امت کے بدترین زوال کا دور ہے۔ اس میں امت عملی ہی نہیں نظریاتی زوال سے بھی دوچار ہے۔ اس کے اندر ایسے افراد پائے جاتے ہیں، بلکہ تیزی سے ابھر رہے ہیں جن کو ان اصول وکلیات ہی کے

بارے میں شکوک وشبہات ہیں، جن پر اسلام کی بنیاد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو جس کارِعظیم پر مامور کیا تھا وہ اس کی عظمت و بلندی کو سمجھنے سے بھی قاصر ہیں۔ دینِ اسلام کی طرف دعوت دینا اور اسے قائم و غالب کرنے کے لیے تگ و دو کرنا ان کے نزدیک ایک مجنونانہ عمل ہے۔ان کے پروگرام میں دنیا کی ہر چیز شامل ہوسکتی ہے اور وہ اس پر عمل بھی کرسکتے ہیں، لیکن دین کی دعوت اور اس کی سربلندی کی جدوجہد کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ باطل کو چھیڑنا اور اس کے خلاف صف آرا ہونا ان کے اصول کے خلاف ہے۔ وہ ان مسائل پر تنقید کرنا نہیں چاہتے جو کفر کو محبوب ہیں۔ وہ ہر اس اقدام سے باز رہنے ہی میں عافیت سمجھتے ہیں، جس سے اقتدارِ وقت کے ماتھے پر شکن پڑے۔ ان کے ذہن خیر کے اس تصور ہی سے خالی ہیں، جسے اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں پھیلانے اور عام کرنے کا حکم دیا ہے۔

یہی نہیں اس وقت امت میں ایسے اشخاص بھی پائے جاتے ہیں جو اسلام کے نام پر اس کو بری طرح مسخ کر رہے ہیں۔ اگر آپ اس کو اس کے مقصدِ حیات کی طرف بازگشت کی دعوت دیں تو اس میں اللہ کے ایسے 'نیک بندے' موجود ہیں جو آپ کو حقیقتِ دین سے جاہل اور ناواقف ہونے کا طعنہ دیں گے، اگر آپ کہیں کہ اللہ کے دین کو ہر طرف پھیلانے اور اسے غالب کرنے کے لیے امت کو اپنی ساری توانائی صرف کردینی چاہیے تو اس میں ایسے اربابِ فکر پرورش پا رہے ہیں جو آپ کو دین کی منشا سے بے خبر کہیں گے، اللہ کا دین زبردست انقلاب چاہتا ہے لیکن اس میں ایسے 'محققین' کی کمی نہیں ہے جن کے نزدیک قرآن کی ہر اس آیت کی تاویل موجود ہے جو اس انقلاب کو بیان کرتی ہے۔ امت کے نصب العین کی ہر وہ تشریح ان کے نزدیک دین میں تحریف ہے جو اس کے اندر دین کو زندہ کرنے کا جذبہ بیدار کرے اور ضلالت و جہالت سے برسرِ پیکار کردے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت اللہ کا دین جتنا مظلوم ہے شاید ہی کوئی نظریۂ حیات اتنا مظلوم ہو۔ اس پر ظلم کرنے والے صرف وہی لوگ نہیں ہیں

جو اس کے منکر ہیں بلکہ اس کے ماننے والے بھی اس پر ظلم کر رہے ہیں۔ وہ غیروں کی زیادتی بھی برداشت کر رہا ہے اور اپنوں کی زیادتی بھی۔

یہاں یہ تاریخی سوال زیر بحث نہیں ہے کہ امت کا مثالی دور کب تک رہا اور اس کا زوال اور انحطاط کب اور کیسے شروع ہوا؟ اس کا پہلا مرحلہ کتنی مدت پر پھیلا ہوا ہے اور دوسرے کا تعلق تاریخ کے کس دور سے ہے؟ موجودہ فکری و عملی زوال کا رشتہ ماضی سے بھی ہے یا نہیں؟ کیا اس کے آثار بہت پہلے شروع ہو چکے تھے یا یہ دورِ حاضر کے غلط افکار و نظریات اور سیاسی اور تہذیبی مغلوبیت کا نتیجہ ہے؟ ان سوالات کی تحقیق ضرور ہونی چاہیے۔ یہ مفید ہوگی، لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ یہ امت عروج کے بعد اچانک زوال آشنا نہیں ہوئی، بلکہ اس میں ایک تدریج رہی ہے۔ اسی کو یہاں مرحلوں میں بیان کیا گیا ہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلامی تاریخ کے ہر دور میں ایسے افراد اور بعض اوقات ایسی جماعتیں تک موجود رہی ہیں، جنھوں نے امت کے اندر اٹھنے والے فتنوں کا مقابلہ کیا، جن غلط افکار اور فلسفوں نے سر اٹھایا ان کے جواب میں عقلی اور نقلی دلائل سے اسلام کی حقانیت ثابت کی، معاشرہ کی اصلاح کی کوشش جاری رکھی، دین کی اشاعت کا فرض انجام دیا اور اس کی سربلندی اور فرماں روائی کے تصور کو زندہ رکھا۔ آج بھی امت کا دامن اس طرح کی شخصیتوں اور جماعتوں سے خالی نہیں ہے۔ دعوتِ دین کا عمل جاری ہے۔ اور اسلام کی سربلندی کا جذبہ سینوں میں موج زن ہے۔ اس مقصد کے تحت لکھنے والوں نے بہت کچھ لکھا ہے اور بڑی معیاری اور قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ پیشِ نظر تحریر کا موضوع بھی یہی ہے۔ یہ اس سلسلہ کی گو بہت حقیر سی کوشش ہے لیکن ان اوراق کے بارے میں شاید اتنی بات غلط نہ ہوگی کہ ان میں اس موضوع کے ہر پہلو پر ایک نئے رخ سے بحث کی گئی ہے اور اس کے متعلق پیدا ہونے والے قریب قریب سب ہی سوالات کا جواب دیا گیا ہے۔ اس لیے توقع ہے کہ بہت سا کار آمد مواد جو اس سے متعلق ضخیم علمی کتابوں میں منتشر ہے، یہی نہیں کہ ان میں یکجا ملے گا، بلکہ اس کے بعض

نئے گوشے بھی سامنے آئیں گے اور وہ ایک جامع تحریر کا کام دیں گے۔ اس میں چار مباحث شامل ہیں۔ پہلی بحث میں کارِ رسالت کی تشریح کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول کس لیے دنیا میں آتے ہیں اور کس طرح اپنا زبردست انقلابی کام انجام دیتے ہیں۔ یہ جاننا اس لیے ضروری ہے کہ اس امت کا نصب العین وہی ہے جو اللہ کے رسولوں کا نصب العین رہا ہے۔ اسے ان ہی کے اسوہ کی روشنی میں اس نصب العین کی طرف پیش رفت کرنی ہے۔ اسی ذیل میں آخری رسول حضرت محمد ﷺ کے ذریعہ جو عظیم کارنامہ انجام پایا اس کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ دوسری بحث براہِ راست اسلام کی دعوت سے متعلق ہے۔ اس میں پہلے اس کام کی صحیح حیثیت واضح کی گئی ہے، اس کے بعد اسلام کی اتباع پر زور دیا گیا ہے، کیوں کہ اس کے بغیر دعوت کا کام بے نتیجہ ہوکر رہ جائے گا۔ پھر دعوت کی ترتیب، اس کے اصول و آداب اور اس کے بارے میں کامیابی و ناکامی کے تصور پر گفتگو کی گئی ہے۔ آخر میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کا انکار کیوں کیا جاتا ہے اور کن لوگوں کو خدا کا دین ملتا ہے؟ تیسری بحث میں وہ خاص اوصاف بتائے گئے ہیں جو انسان کو اس دعوت کے قابل بناتے ہیں اور جن کا پایا جانا اس کام کے لیے لازمی ہے۔ چوتھی اور آخری بحث دعوت اور تنظیم کے تعلق کو ظاہر کرتی ہے اور ساتھ ہی یہ بتاتی ہے کہ کسی اسلامی تنظیم کو مضبوط کرنے والی خوبیاں کیا ہیں اور وہ کس طرح مستحکم ہوتی ہیں؟

میں نے اس کتاب میں کسی مسئلہ پر خالص علمی اور تحقیقی انداز میں گفتگو نہیں کی ہے بلکہ اپنی بات بہت ہی سادہ اور آسان زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس کو قبول فرمائے اور اس سے اس کے بندوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے۔

جلال الدین

۹ر نومبر ۱۹۶۸ء

کارِ رسالت کی تشریح

☜ رسولوں کا کام اور اس کی نوعیت

☜ محمد ﷺ کا عظیم کارنامۂ دعوت

رسولوں کا کام اور اس کی نوعیت

رسول کس لیے آتے ہیں؟

یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے اور انسان حالتِ امتحان میں ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ شب و روز اسے آزما رہا ہے تاکہ دیکھے کہ کون اس کا فرماں بردار ہے اور کون اس کا نافرمان؟ دوسرے الفاظ میں اسی بات کو یوں کہا جاسکتا ہے کہ انسان کفر اور اسلام کے درمیان کھڑا ہے۔ اسلام خدا پرستی کی دعوت دیتا ہے اور کفر خدا سے بغاوت کا دوسرا نام ہے۔ انسان کو ان ہی دو راہوں میں سے ایک راہ اختیار کرنی ہے، تیسری کوئی راہ اس کے لیے نہیں ہے ــــ انسان کو اتنے بڑے امتحان میں ڈالنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کے ذریعہ اسے بتا دیا کہ اس کے لیے صحیح طریقہ کیا ہے اور غلط طریقہ کیا؟ وہ کامیاب کیسے ہوسکتا ہے اور اس کی ناکامی کس چیز میں ہے؟ تاکہ جو شخص خدا کو خوش کرنا چاہے خوش کرسکے اور جو تباہ ہونا چاہے خود ہی تباہ ہوجائے۔

اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ۝ وَ اِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى ۝ (الّیل: ۱۲، ۱۳)
یقیناً راہ دکھانا ہمارے ہی ذمہ ہے اور ہمارے ہی ہاتھ میں ہے دنیا اور آخرت۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بے شمار نعمتیں دی ہیں۔ لیکن اس کی سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ اس نے اپنا دین اسے عطا کیا۔ اسے وہ راہ دکھائی جو اس کو دنیا اور آخرت میں کامیاب و کامراں بناتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ نعمت اس کے رسولوں نے انسان تک

پہنچائی ہے۔ اللہ کے رسول نہ آتے تو انسان کو اس کا دین نہ ملتا اور وہ ہدایت سے محروم ہوتا۔ وہ اللہ تعالیٰ سے شکایت کرتا کہ اے اللہ! تو نے مجھے پیدا کیا اور اس حال میں چھوڑ دیا کہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تیری رضا کیسے حاصل کروں اور تیرے غضب سے کیوں کر بچوں؟ میں نہیں جانتا تھا کہ تو کن کاموں سے خوش ہوتا ہے اور کن کاموں سے ناخوش؟ ایسی حالت میں تیری رضا کیسے چاہتا اور تجھے کیسے خوش کرتا؟ میں جب کامیابی کی راہ سے واقف ہی نہ تھا تو ناکامی سے کیوں کر بچتا؟ لیکن اب یہ عذر اللہ کے ہاں نہیں سنا جائے گا، کیوں کہ اللہ کے رسول ہر دور میں آتے رہے اور انسان کو راہِ حق دکھاتے رہے۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ

(النساء:۱۶۵)

اللہ نے انسانوں کی طرف اپنے رسول بھیجے جو ان کو جنت کی خوش خبری دیتے اور دوزخ سے ڈراتے تھے۔ تاکہ رسولوں کے آنے کے بعد اللہ (جو فیصلہ کرے اس) کے مقابلہ میں انسانوں کے پاس حجت نہ رہے۔

رسول کب آتے ہیں؟

اللہ تعالیٰ نے اس زمین پر جس پہلے انسان کو پیدا کیا وہ اس کا رسول بھی تھا۔ اس نے براہِ راست اس پر ہدایت و ضلالت واضح کردی تھی۔ اس پہلے انسان نے اپنی زندگی ٹھیک اس طرح گزاری جس طرح زندگی گزارنے کا اسے حکم ملا تھا۔ لیکن اس نیک انسان سے جو نسل پھیلی اس نے ہمیشہ وہ راہ نہیں اختیار کی جو اسے اللہ تعالیٰ کے انعام کا حق دار بناتی، بلکہ اس نے بارہا اس کی نافرمانی کی اور اس کے غضب کو دعوت دی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جب انسان کی غفلت حد سے بڑھ جاتی ہے اور وہ کھلّم کھلاّ خدا سے بغاوت کرنے لگتا ہے تو وہ اس زمین پر ایک بوجھ بن جاتا ہے اور اس قابل ہوتا ہے کہ اسے مٹا دیا جائے، لیکن اللہ کی رحمت اس کے غضب پر حاوی ہے، وہ اپنے بندوں کو آخر وقت تک عذاب سے بچانا چاہتا ہے۔ چناں چہ جب کبھی انسان نے اللہ سے بغاوت کی اور اس کی مرضی کو پامال کیا تو اس نے اپنے رسول بھیجے تاکہ اس کا عذاب آنے سے

پہلے انسان آگاہ ہوجائے، اسے معلوم ہوجائے کہ اسے کدھر جانا چاہیے تھا اور وہ کدھر جارہا ہے؟ اس کی غلط کاریوں پر گرفت اس وقت ہو جب کہ اسے ان کے نتائج کا اچھی طرح علم ہوچکا ہو۔ اللہ کے یہ رسول ہر دور اور ہر قوم میں آئے اور بگڑے ہوئے انسان کو اس کے انجام سے باخبر کرتے رہے۔ انھوں نے اس کی باغیانہ روش پر تنبیہ کی اور اس کی غلط روی پر درد بھری تنقید کی اور اسے بتایا کہ سرکشی اسے زیب نہیں دیتی کیوں کہ اس کے خدا نے اسے اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔ اگر وہ اپنی اس روش سے باز نہ آیا تو خدا کا عذاب اس پر اس طرح آئے گا کہ کہیں اسے پناہ نہ ملے گی۔ جب تک یہ بات واضح نہیں ہوتی کسی قوم پر خدا کا عذاب نہیں آتا۔ یہی حقیقت قرآن کے ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔

وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾ (بنی اسرائیل:۱۵)

ہم کسی قوم کو اس وقت تک عذاب نہیں دیتے جب تک کہ اس کے پاس رسول نہ بھیج دیں۔

رسولوں کا احسان

اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی مثال اس دنیا میں بہتے ہوئے چشمے کی ہے، جس سے ہزاروں اور لاکھوں انسان سیراب ہوتے ہیں۔ انسانیت کی کھیتی جب بھی سرسبز و شاداب ہوئی ہے، ان ہی سے ہوئی ہے۔ وہ نہ پیدا ہوتے تو انسانیت جل کر راکھ ہوجاتی۔ دنیا ان کو کچھ دیتی نہیں بلکہ ان سے پاتی ہے۔ آپ مادی لحاظ سے دیکھیں تو ان کا وجود اپنی ذات سے زیادہ دوسروں کے لیے ہوتا ہے۔ وہ کسی سے کچھ وصول کرنے نہیں آتے بلکہ سب کو 'مالا مال' کرنے آتے ہیں۔ اور کمال یہ ہے کہ اس جدوجہد میں وہ اپنا سب کچھ لٹا کر قلبی راحت اور سکون محسوس کرتے ہیں۔ ان کو اطمینان ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جو توانائی اور جو قوت و صلاحیت دی تھی وہ رائیگاں نہیں گئی بلکہ صحیح جگہ میں صرف ہوئی ہے۔ اپنی سعی و جہد کے بارے میں یہ اطمینان اللہ کے رسولوں اور ان کی اتباع کرنے

والوں کے سوا اس دنیا میں کسی بھی شخص کو نصیب نہیں ہوتا۔ یہ وہ حقیقی انعام ہے جو انھیں اپنی خدمات کے صلے میں یہاں ملتا ہے۔

عام طور پر جو لوگ انسانیت کے خیر خواہ سمجھے جاتے ہیں اور جن کے پیچھے چلنے میں دنیا فخر محسوس کرتی ہے، وہ کسی نہ کسی عنوان سے انسان کی صرف دنیاوی کامیابی چاہتے ہیں۔ ان میں سے کسی کے سامنے معاشی اسکیم ہوتی ہے، کوئی تعلیمی منصوبہ رکھتا ہے، کوئی آزادی کی تحریک کا حامل ہوتا ہے، کسی کو سائنس کی ترقی کی فکر ہوتی ہے اور کوئی تمدن و معاشرت میں اصلاح اور درستگی چاہتا ہے۔ لیکن اللہ کے رسول اس نوع کی کوئی تحریک اور منصوبہ لے کر نہیں اٹھتے، بلکہ وہ صرف اس لیے آتے ہیں کہ انسانوں کو ان کے رب کا پیغام پہنچائیں، اور انھیں اس حقیقت سے آگاہ کریں کہ وہ سب کے سب اللہ کے بندے اور اس کے غلام ہیں اور انھیں اپنے تمام معاملات میں اس کی بندگی کرنی چاہیے۔ اس پیغام کو جو شخص قبول کرتا ہے وہ اللہ کی نعمتوں کا مستحق ہوتا ہے اور جو اسے رد کر دیتا ہے وہ اس کی رحمتوں سے دور ہو جاتا ہے۔ اللہ کے رسولوں کا یہ اتنا بڑا احسان ہے کہ اس کے صحیح اعتراف سے بھی ہم اور آپ عاجز ہیں۔

رسول انسان کا اصل مسئلہ حل کرتے ہیں

انسان کا اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ یہاں معاشی توازن قائم ہو جائے، یا تعلیم اس قدر عام ہو جائے کہ ہر شخص پڑھ لکھ سکے، یا صنعت و حرفت اتنی ترقی کر جائے کہ ضرورت کی تمام چیزیں بہ آسانی دست یاب ہونے لگیں، یا غربت و افلاس ختم ہو اور کوئی شخص کسی کا محتاج اور دست نگر نہ رہے۔ بہ ظاہر یہ بات بڑی حیرت انگیز معلوم ہوگی اور کچھ بعید نہیں کہ اسے سادہ لوحی اور ناواقفیت کا نتیجہ قرار دیا جائے، کیوں کہ دنیا ہمیشہ ان ہی مسائل کو انسان کے بنیادی مسائل سمجھتی رہی ہے اور آج بھی ان ہی کو سب سے زیادہ اہمیت دے رہی ہے ـــــ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان مسائل کی اپنی جگہ کتنی ہی

اہمیت کیوں نہ ہو، یہ سب چھوٹے چھوٹے مسائل ہیں اور ایک بنیادی مسئلہ کی شاخیں ہیں۔ جو لوگ ان شاخوں کی خراش تراش اور ان کے بنانے اور سنوارنے میں مصروف ہیں وہ بہت ہی سطحی اور معمولی کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کی نظر اس اصل پر نہیں ہے جہاں سے یہ شاخیں پھوٹتی اور پوری زندگی پر چھا جاتی ہیں۔ اس اصل پر صرف ان افراد کی نظر جاتی اور جا کر زندگی کے آخری لمحہ تک جمی رہتی ہے، جن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص بصیرت حاصل ہوتی ہے اور جو صحیح معنی میں دنیا کے قائد اور امام بنا کر بھیجے جاتے ہیں۔ ان ہی کو ہم اپنی زبان میں اللہ کے رسول اور اس کے پیغمبر کہتے ہیں۔

انسان کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنے آغاز اور انجام سے باخبر رہے اور اپنے اس خدا کو نہ بھولے، جس نے اسے پیدا کیا اور جس کی طرف اسے پلٹ کر جانا ہے۔ لیکن اس کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہر بندش سے آزاد سمجھتا ہے۔ وہ اس طرح اپنی دنیا میں مصروف ہے جیسے آخرت نہیں آئے گی اور حساب کتاب نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اس کے لیے ایک عذاب ہے لیکن وہ اپنے آپ کو اس عذاب سے قریب کرتا جا رہا ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ کے غضب سے بچنا چاہیے، لیکن وہ اپنی بدعملیوں سے اس کے غضب کو مسلسل دعوت دے رہا ہے۔ غرض یہ کہ اس نے اپنے مالک و مولیٰ کے بارے میں انتہائی غلط رویہ اختیار کر رکھا ہے جو اسے کسی بھی حال میں اختیار نہیں کرنا چاہیے۔

دنیا اور آخرت ہر جگہ انسان کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا بندہ بن جائے اور اس کی غلامی قبول کرلے۔ اسی سے اس کی اخروی زندگی بھی سنورے گی اور اسی سے اس کی دنیوی زندگی کے تمام الجھے ہوئے مسائل بھی حل ہوں گے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کو ماننا ہی انسانی زندگی کی صحیح ترین اساس ہے اور اس کے نہ ماننے ہی سے تمام خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس شخص کی قسمت میں نامرادی لکھ دی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے انحراف کرے اور اس کی پکڑ سے غافل ہو جائے۔ یہاں ظلم کا وجود اس لیے ہے کہ خدا اور آخرت پر انسان کو یقین نہیں ہے، یہاں سیاست اور معیشت میں بگاڑ اس لیے

ہے کہ وہ خدا کے قانون سے آزاد ہے، یہاں بداخلاقی اور بے حیائی اس لیے ہے کہ لوگوں کے اندر خدا کی دی ہوئی ہدایتوں کا احترام نہیں ہے، یہاں تعلیم کے باوجود جہالت اس لیے عام ہے کہ انسان خدا کی دی ہوئی روشنی سے محروم ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کے پیغمبر پوری قوت کے ساتھ ایک ہی بنیادی مسئلہ کو چھیڑتے ہیں۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کو مانو اور اس کی بندگی کرو۔ ان کی دعوت اس کے سوا کچھ نہیں ہوتی کہ

يَآأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿٢١﴾ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۖ وَّأَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۖ فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ أَنْدَادًا وَّأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٢﴾

(البقرۃ:۲۱،۲۲)

اے لوگو! اپنے رب کی بندگی کرو جس نے تم کو بھی اور تم سے پہلے کے لوگوں کو بھی پیدا کیا۔ امید ہے تم اس کی پکڑ سے بچوگے، تمھارا وہ رب جس نے زمین کو تمھارے لیے فرش اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی اتارا، اس کے ذریعے تمھارے کھانے کے لیے پھل پیدا کیے۔ لہٰذا تم اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک نہ کرو جب کہ تم جانتے ہو (کہ اس کے سوا کوئی ان چیزوں کا خالق نہیں ہے)۔

اللہ تعالیٰ کے رسولوں پر جو وحی نازل ہوتی ہے اور جس تعلیم کو لے کر وہ انسانوں کے سامنے آتے ہیں، اسے قرآن مجید نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

وَمَآ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِيٓ إِلَيْهِ أَنَّهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنَا فَاعْبُدُونِ ﴿٢٥﴾ (الانبیاء:۲۵)

ہم نے تم سے پہلے جس رسول کو بھی بھیجا اس کی طرف یہی وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ پس تم میری عبادت کرو۔

اللہ تعالیٰ کے رسول انسانوں سے کہتے ہیں کہ تم اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اس کا تقویٰ اختیار کرلو، اس سے تمھاری زندگی کا فساد دور ہوگا۔ اس کے باغیوں اور سرکشوں کے پیچھے چلنے کی جگہ ہماری اتباع کرو۔ ہم تمھیں کامیابی کی منزل سے ہم کنار کریں گے۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۵۰﴾ وَ لَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۱۵۱﴾ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَ لَا يُصْلِحُوْنَ ﴿۱۵۲﴾

(الشعراء:۱۵۰-۱۵۲)

پس اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو، اور ان مسرفین کے حکم کے پیچھے نہ چلو جو زمین میں فساد مچاتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔

یہ ہے اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی وہ دعوت جسے وہ دنیا کے سامنے مسلسل پیش کرتے ہیں، جس کی فکر میں ان کے شب و روز گزرتے ہیں اور جس کے لیے ان کی حیاتِ بابرکت وقف ہوتی ہے۔

رسول غالب ہوتے ہیں

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے رسولوں کے سلسلہ میں اس کا یہ قانون بیان ہوا ہے:

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِيْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۲۱﴾

(المجادلة:۲۱)

اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول ضرور کامیاب ہوں گے۔ بے شک اللہ قوت اور غلبہ والا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو ان کے مخالفین پر ضرور غلبہ عطا کرتا ہے۔ یہ اس کا فیصلہ ہے۔ اس کے فیصلہ کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ یہاں رسولوں کے جس غلبہ کا ذکر ہے اس کی دو شکلیں ہیں۔ ایک عقلی اور استدلالی غلبہ اور دوسرا مادی اور سیاسی غلبہ۔ یہاں ان دونوں کی تھوڑی سی وضاحت کی جا رہی ہے۔

دلائل کا غلبہ

اللہ کے رسول جن قوموں میں آتے ہیں وہ انھیں دلائل کے ساتھ یہ حقیقت سمجھاتے ہیں اور اس میں کامیاب رہتے ہیں کہ اللہ ہے اور وہ ایک ہے۔ اسے مانیں اور اس کا انکار نہ کریں، اللہ تعالیٰ کو ماننا دنیا اور آخرت میں ان کو کامیاب بنائے گا اور اس کا انکار

ان کے لیے سخت تباہ کن ہوگا۔ وہ ان کی ان تمام نمایاں فکری و عملی خامیوں پر تنقید کرتے ہیں جن کی وجہ سے وہ اللہ کے عذاب کی زد میں ہوتے ہیں اور ان کے سامنے وہ اصولِ حیات پیش کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں اور جن کو اختیار کر کے ان کی زندگی سنور سکتی ہے۔ اس کے حق میں وہ اتنے قوی دلائل فراہم کردیتے ہیں کہ مخالفین بے بس ہوجاتے ہیں اور ان پر ان کی فکری برتری قائم ہوجاتی ہے۔

رسول حجت تمام کرتے ہیں

اس کام کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو بعض ایسی خصوصیات عطا کرتا ہے جو ان کے سوا کسی دوسرے انسان کو حاصل نہیں ہوتیں۔ یہ خصوصیات ان کو اس قابل بناتی ہیں کہ وہ اس کارِ عظیم کو اس طرح انجام دیں کہ کسی پہلو سے اس میں کوئی نقص نہ رہ جائے۔ ان میں سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اللہ کے رسول ذہن و فکر اور اخلاق و کردار کے لحاظ سے اتنے اعلیٰ مقام پر فائز ہوتے ہیں کہ پوری نوع انسانی میں کوئی بھی فرد ان کا ہم پایہ نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے کسی ایسے شخص کے لیے جو ان سے واقف ہو، اُن کو جھوٹا یا ان کی دعوت کو مکر و فریب کہنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ کوئی اس کی ہمت کرے تو خود اس کا دل اندر سے اسے ملامت کرنے لگتا ہے۔ دوسری یہ کہ اُن کا مقام سماجی اور معاشرتی حیثیت سے بھی اتنا اونچا ہوتا ہے کہ وہ بلند ترین سطح کے انسانوں سے اور ان لوگوں سے جن کے ہاتھوں میں وقت کی قیادت ہوتی ہے براہِ راست خطاب کرسکتے ہیں اور ان تک اللہ کا دین پہنچانے میں اس طرح کی کوئی جھجک یا گھبراہٹ ان کو لاحق نہیں ہوتی۔ جو کسی بڑے سے بڑے آدمی کو ہوسکتی ہے۔ تیسری یہ کہ اس کام میں انھیں براہِ راست اللہ تعالیٰ کی راہ نمائی اور ہدایت حاصل ہوتی ہے۔ ہر نازک موقع پر ان کو اللہ کی طرف سے بتایا جاتا ہے کہ وہ کیا اقدام کریں اور کس طرح اس کام کی تکمیل کریں۔ اس ہدایت و راہ نمائی کی وجہ سے ان کا پورا کام انسانی خامیوں سے بالکل پاک ہوتا ہے۔ چوتھی یہ کہ ان کو ایسے معجزات عطا کیے جاتے ہیں کہ جن کو دیکھ کر آسانی سے یہ یقین کیا جاسکتا ہے کہ وہ

فی الواقع اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور اسی کے حکم سے لوگوں کو ان کے انجام سے باخبر کر رہے ہیں۔ پانچویں یہ کہ اللہ تعالیٰ ان پر اپنا کلام ایسی زبان میں نازل کرتا ہے کہ وہ نہ تو فلسفیوں کی زبان کی طرح مغلق اور پیچیدہ ہوتی ہے کہ اس کا سمجھنا دشوار ہو اور نہ بالکل عامیانہ زبان ہوتی ہے کہ جس کا سننا اور پڑھنا بھی کسی سنجیدہ اور مہذب انسان کے لیے ناگوار گزرے، بلکہ وہ اتنی صاف ستھری، اتنی پرکشش اور اتنی بلیغ زبان ہوتی ہے کہ دل و دماغ آپ سے آپ اس کی طرف کھنچنے لگتے ہیں۔ چھٹی یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کو زبردست قوتِ تعبیر عطا کرتا ہے تاکہ وہ اس کلام کے مضمرات اور اس کی حکمتوں اور خوبیوں کو پوری طرح کھول سکیں۔ یہاں تک کہ اس کا کوئی گوشہ بھی نگاہوں سے اوجھل نہ رہ جائے۔ ان خصوصیات کے ساتھ اللہ کے رسول بہترین ترغیب اور انتہائی ترہیب کے ذریعے اللہ سے منحرف انسانوں کو اس کی طرف بلاتے ہیں اور آخری حد تک کوشش کرتے ہیں کہ وہ اپنے انجام سے واقف ہوجائیں اور آخرت کے عذاب سے بچنے کا سامان کرلیں۔ وہ ان کی نجات کے لیے اپنی زبردست قوتیں اور غیر معمولی صلاحیتیں صرف کردیتے ہیں اور انھیں اللہ سے جوڑنے کی جو ممکن تدبیریں ہوسکتی ہیں ان سب کو کام میں لاتے ہیں، وہ ان کے سامنے مضبوط دلائل پیش کرتے ہیں تاکہ اللہ کا دین ان کے دل میں اتر جائے، وہ ان کے ضمیر کو جھنجھوڑتے ہیں تاکہ وہ ماضی سے سبق حاصل کریں اور ان غلطیوں سے بچیں جو اس سے پہلے قوموں اور گروہوں کو ہلاک کرچکی ہیں۔ یہ ایک صبر آزما کام ہے، جسے اللہ کے رسول ایک لمبی مدت تک انجام دیتے رہتے ہیں، حتیٰ کہ یہ حقیقت پوری طرح کھول دیتے ہیں کہ نجات کی راہ صرف اللہ کی عبادت اور اطاعت میں ہے۔ اس کے بعد ان کے پیغام کے ساتھ مخالفت کی روش تو اختیار کی جاسکتی ہے، لیکن کوئی بھی شخص دلیل کے میدان میں انھیں شکست نہیں دے سکتا۔ وہ اس حد تک اپنی بات کو ثابت کردیتے ہیں کہ ان کے مخالفین کے دل بھی اس کے حق ہونے کی گواہی دینے لگتے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کے متعلق قرآن نے کہا:

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا (النمل: ۱۴)

انھوں نے محض ظلم اور سرکشی کی بنیاد پر اللہ کی آیتوں (معجزات) کا انکار کیا، حالاں کہ اندر سے ان کے دل یقین کے ساتھ کہہ رہے تھے کہ وہ حق ہیں۔

رسول اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں

اللہ کا رسول جب اس طرح انسانوں پر اتمام حجت کر دیتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ اپنے ادائے فرض میں کامیاب ہوگیا، خواہ اس زمین پر وہ یکّا وتنہا تگ و دو کرتے ہوئے اس کے حضور پہنچ جائے اور کوئی ایک متنفس بھی اس کا ساتھ نہ دے۔ اس نے اگر دلیل اور حکمت کے ساتھ اللہ کا دین انسانوں تک پہنچا دیا ہے تو اس نے تبلیغ کی وہ ذمے داری پوری کردی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر عائد ہوئی تھی۔ اب اس کی کامیابی کے لیے مزید کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ کے رسول کی تبلیغ کے بعد بھی اگر اس کی طرف کوئی شخص نہ پلٹے تو یہ اس کی اپنی بدبختی ہے کہ جگائے جانے کے باوجود غفلت میں پڑا سوتا رہا۔ کامیابی و ناکامی کی راہ اس پر کھل چکی تھی، لیکن اس نے ناکامی کو پسند کیا۔ لوگ اگر جانتے بوجھتے حق بات کو نہ مانیں تو یہ اس کے پیش کرنے والے کی کوتاہی نہیں ہے، بلکہ نہ ماننے والوں کی ضد اور ہٹ دھرمی ہے، جس کے لیے وہ خود جواب دہ ہوں گے۔ اللہ کے پیغمبروں سے اس کے متعلق ہرگز کوئی باز پرس نہ ہوگی۔ محمد ﷺ فرماتے ہیں کہ "پیغمبروں کی تاریخ میں ایک پیغمبر ایسے بھی گزرے ہیں، جن کی قوم کے صرف ایک فرد نے ان کی تصدیق کی تھی۔"[1] کون کہہ سکتا ہے کہ وہ اس دنیا سے ناکام گئے۔ انھوں نے اللہ کی راہ میں اپنی تمام قوتیں صرف کردیں اور جدوجہد کا حق ادا کر دیا، اس لیے ہمارا ایمان ہے کہ وہ پوری کامیابی کے مستحق تھے اور پوری طرح کامیاب رہے۔

اللہ کے رسول اس کی راہ میں مارے بھی گئے

دنیا میں ایسی قومیں بھی گزری ہیں، جنھوں نے اللہ کے رسولوں کی بے لوث اور

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب فی قول النبیؐ انا اول الناس یشفع فی الجنة ...الخ

مخلصانہ جدوجہد کے باوجود ان کی دعوت کو رد کر دیا اور ان کے درپئے آزار ہوگئیں۔ بعض بدبخت قوموں نے انھیں تہہِ تیغ تک کر ڈالا۔ یہود کے سیاہ نامۂ اعمال میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔

اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۡ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾ (البقرۃ:۸۷)

(کیا ایسا نہیں ہے کہ) جب تمھارے پاس کوئی رسول ایسی ہدایات لے کر آیا جو تمھارے نفوس کو پسند نہیں تھیں تو تم نے تکبر کا مظاہرہ کیا پھر ایک فریق کی تکذیب کی اور ایک فریق کو قتل کیا۔

قرآن مجید نے صرف اسی ایک جگہ نہیں، دوسرے مقامات پر بھی کہا ہے کہ یہود کے ہاتھ اللہ کے رسولوں کے خون سے رنگین رہے ہیں۔ (آل عمران:۱۸۱، النساء ۱۵۵)

مادّی غلبہ بھی حاصل ہوتا ہے

اس طرح کے واقعات اللہ کے رسولوں کے ساتھ گو پیش آئے ہیں، لیکن عام طور پر انھیں اللہ کی خاص نصرت و حمایت حاصل ہوتی ہے اور وہ اس کی حفاظت اور پناہ میں رہتے ہیں تاکہ حق تبلیغ پوری طرح ادا کرسکیں۔ چناں چہ مخالفین ان کی راہ روکتے ہیں، انھیں سخت ایذائیں پہنچاتے ہیں، ان کے خلاف سازشیں کرتے ہیں، لیکن ان کے خلاف کوئی انتہائی قدم اٹھانے اور انھیں ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرماتا ہے اور مخالفین سے انھیں نجات دلاتا ہے۔

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴿۵۱﴾ (المؤمن:۵۱)

ہم یقیناً مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی اور ان لوگوں کی جو ایمان لائے۔ دنیا کی زندگی میں اور اس روز (بھی کریں گے) جب کہ شہادت دینے والے کھڑے ہوں گے۔

اللہ کے رسولوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ اگر کوئی قوم اللہ کے رسول کی سخت جدوجہد اور مسلسل محنت کے باوجود حق کی طرف نہ پلٹے اور اس کی آواز کو دبانے اور اسے ختم کرنے کی تدبیریں کرنے لگے تو وہ دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ! میں نے ان کو تیری

طرف بلانے میں اپنی ساری کوششیں صرف کردیں، لیکن ان کے دلوں کے دروازے نہیں کھلے۔ وہ تیری زمین پر بوجھ بن چکے ہیں اور اس قابل ہیں کہ مٹا دیے جائیں۔ جب اللہ کا رسول اس حد تک اپنی قوم کی اصلاح سے مایوس ہو جاتا ہے تو اس قوم کی تباہی کا وقت آ جاتا ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ اس کو مزید مہلت نہیں دیتا کہ وہ اس کے رسول کے خلاف اپنی سوچی سمجھی کسی انتہائی سازش پر عمل کرسکیں۔ وہ رسول کو حکم دیتا ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس قوم کے درمیان سے نکل جائے اور کسی دوسری جگہ ہجرت کرجائے۔ چناں چہ رسول اور اس کے ساتھی ہجرت کر جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ براہِ راست کوئی عذاب بھیج کر اس قوم کو ختم کردیتا ہے۔ اللہ کا رسول اور اس کے ساتھی عذاب سے محفوظ رہتے ہیں۔

ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ (یونس: ۱۰۳)

پھر ہم بچا لیتے ہیں اپنے رسولوں کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے۔ اس طرح ہمارے ذمے ہے کہ ایمان والوں کو بچالیں۔

کسی قوم کے اس طرح تباہ ہونے کے بعد اللہ کے رسول اور اس کے ساتھی زمین کے وارث ہوجاتے ہیں، یا ان کو کوئی دوسری زمین ملتی ہے کہ وہ آزادی اور اطمینان کے ساتھ اس کے دین پر عمل کرسکیں۔ یہی بات سورۂ ابراہیم کی ان آیات میں بیان ہوئی ہے۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَ لَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَ خَافَ وَعِيْدِ ﴿۱۴﴾ (ابراہیم: ۱۳، ۱۴)

جن لوگوں نے (دعوتِ حق کا) انکار کیا انھوں نے اپنے رسولوں سے کہا کہ ہم تم کو یقیناً اپنی زمین سے نکال دیں گے، یا پھر یہ کہ تم ہمارے دین میں لوٹ آؤ، تو ان کے رب نے ان پر وحی بھیجی کہ یقیناً ہم ظالموں کو ہلاک کردیں گے اور تم کو ان کے بعد زمین میں آباد کریں گے۔ یہ وعدہ اس شخص کے لیے ہے جو میرے سامنے جواب دہی سے ڈرے اور میری وعید سے خوف کھائے۔

یہ صورتِ حال اس وقت رونما ہوتی ہے جب کہ پوری قوم، یا اس کی بہت بڑی اکثریت اللہ کے رسول کی دعوت کو رد کردے اور اس پر ایمان لانے والے گنتی کے چند افراد سے زیادہ نہ ہوں۔ لیکن اگر صورتِ حال یہ نہ ہو، بلکہ ایک معقول تعداد اس دعوت پر ایمان لاچکی ہو تو منکرین کی تباہی کے لیے کوئی غیبی عذاب نازل نہیں ہوتا، بلکہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے رسول اور اس کے ساتھیوں کے ذریعے ایک لمبی مدت میں ختم کرتا ہے۔ اس مدت میں رسول کے ماننے والوں اور اس کا انکار کرنے والوں میں شدید کشمکش جاری رہتی ہے اور اسی کشمکش کے دوران وہ سب لوگ جن میں رسول کے پیغام کو قبول کرنے کی ذرا بھی صلاحیت ہوتی ہے، آہستہ آہستہ اس پر ایمان لاتے رہتے ہیں۔ جب ان کی تعداد اتنی ہو جاتی ہے کہ خود ان ہی کے ذریعے منکرین کا زور توڑا جاسکے، تو اللہ تعالیٰ ان کو حکم دیتا ہے کہ وہ ان کے خلاف اقدام کریں اور پھر دوچار مقابلوں کے بعد کسی فیصلہ کن معرکہ میں وہ منکرین کو بالکل مغلوب کردیتا ہے اور زمین کا اقتدار اہلِ ایمان کے حوالہ کردیتا ہے۔ اس کے بعد اللہ کے رسول اس کی زمین کو کفر وشرک سے پاک کرکے اس کے دین کو پوری طرح نافذ کردیتے ہیں اور ہر طرف اللہ کی مرضی چلنے لگتی ہے۔[1]

رسولوں کے کام کی نوعیت

اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے یہاں ایک بہت ہی اہم حقیقت پر روشنی ڈالنا ضروری ہے، ورنہ اللہ کے رسولوں کے کام کی صحیح نوعیت واضح نہیں ہوسکے گی۔ وہ یہ کہ کوئی قوم اللہ تعالیٰ کے رسول کی مخالفت کرے یا اس پر ایمان لائے اور اس کے بتائے ہوئے نظامِ اطاعت کو قبول کرلے، دونوں صورتوں میں وہ اس کے درمیان دعوت ہی کا کام انجام دیتا ہے۔ وہ اپنی دعوت سے ہٹ کر کوئی قدم نہیں اٹھاتا، اس کا ہر کام اس کی داعیانہ حیثیت کا تقاضا اور اس کی دعوت کا جزو ہوتا ہے، جو قوم اس کی دعوت کو آخر وقت

---

[1] اس کی مثال محمد ﷺ اور آپ کے اصحاب ہیں۔ ان کے ذریعہ مخالف طاقتیں آہستہ آہستہ ختم کردی گئیں اور حق غالب ہوگیا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اگلی بحث محمد ﷺ کا عظیم کارنامہ، دعوت۔

تک نہ ماننے اور اپنے انکار پر جمی رہے، وہ اس پر دلائل کے ذریعے، اپنی سیرت کے ذریعے، اپنے اخلاص اور محبت کے ذریعے اتمامِ حجت کر دیتا ہے کہ وہ غلط راہ پر چل رہی ہے اور اس کا انجام سخت تباہ کن ہوگا۔ لیکن جس قوم میں اللہ کے رسول کے ماننے والے پیدا ہوں اس کے درمیان اس کا کام بہت وسیع ہوتا ہے، لیکن اس وسعت کی وجہ سے اس کی اصل حیثیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ وہ شروع میں بھی دعوت ہی کا کام کرتا ہے اور آخر میں بھی کارِ دعوت ہی انجام دیتا ہے۔

جب کوئی نظریہ، بالخصوص کوئی جامع نظریہ، فکر و فلسفہ کی حدود سے نکل کر عمل کے میدان میں داخل ہوتا ہے تو بہت سے ایسے سوالات پیدا ہوتے ہیں جو پہلے نہیں پیدا ہوئے تھے، یا اگر پیدا ہوئے تھے تو ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ یہ سوالات نظری بھی ہوتے ہیں اور عملی بھی۔ قدرتی طور پر اس کے ماننے والوں کا مطالبہ ہوتا ہے کہ ان کا واضح جواب دیا جائے اور جن لوگوں نے ابھی اسے قبول نہیں کیا ہے وہ اسے فکر کے میدان ہی میں نہیں تجربات کی روشنی میں بھی سمجھنا چاہتے ہیں۔اس لیے اگر آپ اس نظریہ کے داعی ہیں تو آپ کے لیے ضروری ہوگا کہ اس سے متعلق فکری و عملی دونوں طرح کے سوالات کا جواب دیں۔ اس وقت آپ اس نظریہ کے شارح بن کر لوگوں کی فکری الجھنیں بھی دور کریں گے، سیاست داں بن کر ان کے معاملات کو حل بھی کریں گے اور معمارِ تہذیب بن کر ایک نئی تہذیب کی تعمیر میں مصروف بھی ہوں گے۔آپ کا یہ پورا کام اپنے اس نظریہ کے عَلَم بردار ہی کی حیثیت سے ہوگا اور دعوت ہی کا کام ہوگا کوئی دوسرا کام نہ ہوگا۔ ان مختلف اور متنوع امور کے انجام دینے سے آپ کے داعی ہونے کی حیثیت ختم نہیں ہوجائے گی، بلکہ اور زیادہ مستحکم ہوگی۔

ٹھیک اسی طرح اللہ کے رسول کی دعوت جب وسعت اختیار کرتی ہے تو بہت سے نئے مسائل ابھرتے ہیں اور نئے حالات سامنے آتے ہیں۔ مثلاً یہ سوال اٹھتا ہے کہ اس کے ماننے والوں کی اب تک کی تہذیب و معاشرت اور اخلاق و عادات میں سے کون سی

چیز اس دعوت سے مطابقت رکھتی ہے اور کون سی چیز اس سے ٹکرا رہی ہے، ان کے لیے زندگی کا کون سا نقشہ صحیح اور کون سا نقشہ غلط ہے؟ جو لوگ اس دعوت کو مان رہے ہیں ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے اور جو اس کے مخالف ہیں وہ کس برتاؤ کے مستحق ہیں؟ صلح کے کیا اصول ہوں اور جنگ کن بنیادوں پر ہو؟ اللہ کا رسول ان سوالات سے صرفِ نظر نہیں کرتا بلکہ ان میں سے ہر ایک کا اطمینان بخش جواب دیتا ہے۔ اس وقت اس کی دعوت میں اخلاق و معاشرت سے متعلق ہدایات بھی آجاتی ہیں، لین دین کے اصول کا بھی بیان ہوتا ہے، حکومت و سیاست سے متعلق احکام بھی شامل ہوجاتے ہیں، حدود و تعزیرات کی تعلیم بھی داخل ہوجاتی ہے اور صلح و جنگ کے قواعد بھی جگہ پا جاتے ہیں۔ غرض یہ کہ اس مرحلہ میں اللہ کا رسول اللہ کی طرف سے تہذیب و تمدن اور معاملاتِ زندگی کا پورا نقشہ پیش کرتا ہے اور اسی لحاظ سے اس کے کام میں تنوّع بھی پیدا ہوجاتا ہے۔ اب آپ دیکھیں گے کہ وہ بیک وقت انذار و تبشیر بھی کر رہا ہے، اپنے افراد کو منظّم بھی کر رہا ہے، ان کے ذریعے اپنا پیغام دوسروں تک پہنچانے کا کام بھی لے رہا ہے، ان کے درمیان عدالت بھی قائم کیے ہوئے ہے اور اللہ کے دشمنوں سے صلح اور جنگ بھی کر رہا ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ پہلے کچھ تھا اور اب کچھ اور ہوگیا ہے۔ نہیں، یہ سب کام وہ اپنے داعی ہونے کی حیثیت ہی میں انجام دیتا ہے، کبھی اس کی کوئی دوسری حیثیت نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کا رسول چاہے مبلغ ہو، چاہے قاضی اور حاکم ہو، چاہے معلمِ اخلاق اور معمارِ تہذیب ہو، چاہے سپہ سالار اور قائد ہو، ہر حال میں داعی الی اللہ ہوتا ہے۔ اس کی دعوت ہزار قالب اختیار کرلے، ہر قالب کی روح دعوتی ہوتی ہے۔ اگر اس کی پکار کا ایک انسان بھی جواب نہ دے اور وہ قتل کر دیا جائے تو بھی وہ دعوت ہی کا کام کرتے ہوئے دنیا سے جاتا ہے اور اس وقت بھی وہ دعوت ہی کا کام انجام دیتا ہے جب کہ وہ قاضی بن کر انسانوں کے درمیان اللہ کی مرضی کے مطابق فیصلے کرتا ہے۔ کوئی بھی دعوت اگر کسی مرحلہ میں دعوت نہ رہے تو سمجھئے کہ اس نے اپنی اصل حیثیت کھودی۔ اب اس کے

سامنے وہ مقصد نہیں رہا جس کے لیے وہ وجود میں آئی تھی۔ بہت سے لوگ اللہ کے رسول کو محض مبلغ اور اس کی دعوت کو محض وعظ ونصیحت کے ہم معنی خیال کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی انھوں نے دعوت کا صحیح مفہوم نہیں سمجھا ہے اور اس کے وسیع تقاضے ان کے سامنے نہیں ہیں۔ ان کو سنجیدگی سے دعوت کے صحیح مفہوم اور اس کے وسیع تقاضوں پر غور کرنا چاہیے۔

محمد ﷺ کا عظیم کارنامۂ دعوت

اعلانِ رسالت

ماضی کی طرف پلٹ کر اس دور کا تصور کیجیے جب کہ حضرت مسیحؑ کو دنیا سے رخصت ہوئے پانچ سو سال سے زیادہ گزر چکے تھے، انبیاء کی تعلیمات مسخ ہوچکی تھیں، دنیا سے خدا پرستی ختم ہوگئی تھی اور انسان خدا کو بھولا ہوا تھا۔ اسے حکم صرف ایک خدا کی بندگی کا ملا تھا لیکن وہ بے شمار خداؤں کا بندہ بنا ہوا تھا۔ خدا نے اسے اپنی غلامی کے سوا ہر غلامی سے آزاد پیدا کیا تھا، لیکن اس کے پاؤں میں بادشاہوں، پروہتوں اور سرمایہ داروں کی محکومیت کی زنجیریں پڑی ہوئی تھیں، خدا نے اسے سب سے اونچا مقام عطا کیا تھا، لیکن وہ پستی کی آخری حد کو پہنچ چکا تھا اور اسے اپنے مرتبہ و مقام کا کچھ احساس نہ تھا۔ زمین، آسمان، چاند، سورج، درخت، پہاڑ، آگ، پانی، ہوا، ہر چیز اس کی مسجود تھی اور وہ ہر ایک کے سامنے سر جھکانے کے لیے تیار تھا۔ ان حالات میں محمد ﷺ نے اپنی رسالت کا اعلان کیا اور دنیا کے دیکھتے دیکھتے وہ زبردست کارنامہ انجام دیا کہ تاریخ میں نہ تو اس سے پہلے اس کی کوئی مثال تھی اور نہ اس کے بعد کوئی مثال مل سکی۔ اگر آپ اسے دنیا کا سب سے بڑا انقلابی کارنامہ کہیں تو غلط نہ ہوگا۔

بندگیِ رب کی دعوت

محمد ﷺ کی دعوت بندگیِ رب کی دعوت تھی۔ یہ انسان کی رفعت و عظمت کی

دعوت تھی۔ یہ اسے پستی سے بلندی کی طرف لے جانے والی دعوت تھی۔ انسان اپنے مرتبہ و مقام سے غافل تھا، آپؐ نے اسے بتایا کہ اس کا صحیح مقام کیا ہے؟ وہ مدتوں سے سویا ہوا تھا، آپؐ نے اسے جگایا، وہ اپنی حیثیت سے بے خبر تھا، آپؐ نے اسے اس کی صحیح حیثیت سے آگاہ کیا، اس کے چاروں طرف جھوٹے خداؤں کا ہجوم تھا، آپؐ نے اسے بتایاکہ اس کا خدا صرف ایک ہے اور اسے صرف اسی ایک خدا کی بندگی کرنی چاہیے۔ خدا کی مخلوق میں کچھ تو خدائی کے دعوے دار تھے اور کچھ کو انسانوں نے خدا بنا رکھا تھا۔ آپؐ نے ان دونوں طرح کے خداؤں کو چیلنج کیا اور کہا کہ ان میں سے خدائی کا ہر دعوے دار جھوٹا ہے، خدائی کا مقام یہاں سوائے ایک خالقِ ارض وسماء کے کسی کو حاصل نہیں ہے۔ انسان نے جس چیز کو بھی خدا بنا رکھا ہے، اسے ناجائز مقام دے رکھا ہے، جب تک وہ ان جھوٹے خداؤں سے بغاوت نہ کردے نجات نہیں پاسکتا۔ آپؐ نے باخبر کیا کہ جب انسان اس خدائے حقیقی کی بندگی چھوڑ دیتا ہے، جس نے یہ عظیم کائنات پیدا کی ہے اور ایسے خداؤں کی غلامی کرنے لگتا ہے جو کسی بھی حیثیت سے خدائی کے حق دار نہیں ہیں تو وہ زندگی کے میدان میں ایک غلط مقام پر کھڑا ہوجاتا ہے اور اس کا ہر قدم غلط سمت میں اٹھنے لگتا ہے، جو شخص زندگی بھر غلط راہ پر دوڑتا رہے اس کے بارے میں یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اچھے انجام سے دوچار ہوگا۔ انسان کے لیے صحیح روش یہ ہے کہ وہ اس کائنات پر سوائے خدا کے کسی کے اقتدار کو نہ مانے، کسی کو خالق اور مالک سمجھے اور نہ کسی کو حاکم و معبود خیال کرے، کسی کو رازق باور کرے اور نہ کسی کو نفع اور نقصان پہنچانے والا تصور کرے اور ہر غلامی کو ٹھکرا کر صرف خدائے واحد کی غلامی اختیار کرلے۔ کائنات کی ہر چیز خدا کی مخلوق ہے۔ اسے خدائی کا مقام دینا ایک جرم عظیم ہے، جو کبھی معاف نہیں ہوسکتا۔

محمد ﷺ کی یہ دعوت وقت کی روش کے خلاف اعلانِ جنگ تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جو خدا بنے بیٹھے ہیں وہ خدائی کا مقام چھوڑیں اور جو لوگ خودساختہ خداؤں کی

پرستش میں لگے ہوئے ہیں وہ ان کی پرستش سے توبہ کریں۔ تمام خداؤں کی خدائی ختم کرکے صرف ایک خدا کی حکومت قائم ہوجائے۔ اسی کی بندگی ہو، اسی کی پرستش کی جائے، اسی کا قانون چلے، اسی سے خوف کھایا جائے، اسی سے امید لگائی جائے، اسی کا حکم مانا جائے، اسی کی اطاعت کی جائے۔ اسی کو خوش کیا جائے اور اسی کی ناخوشی سے بچا جائے۔ اس دعوت کو سنتے ہی بے شمار خداؤں کے سامنے جھکنے والی دنیا چیخ اٹھی: اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ۝ [صٓ:۵] ”کیا اس نے بہت سے خداؤں کو ایک خدا بنا دیا؟ یقیناً یہ بڑی ہی عجیب بات ہے۔“

ردِّعمل ہوا

رسول اللہ ﷺ کی یہ دعوت بجلی بن کر اپنے ماحول پر گری اور اس کی کڑک سے افکار و خیالات کی وہ عمارت ہلنے لگی، جس کے اندر تمام جھوٹے خداوند اور ان کے پرستار پناہ لیے ہوئے تھے۔ اس دعوت کو جس نے بھی سنا اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس کے زور اور قوت کو وہ لوگ بالکل نظر انداز نہ کرسکے، جن سے وہ خطاب کر رہی تھی۔ انھوں نے محسوس کیا کہ یہ ایک زبردست پیغام ہے، جس کے اثرات بہت دور رَس اور بہت گہرے ہوں گے۔ یہ اُن کے دین و مذہب پر حملہ ہے، ان کے عقائد و افکار کے لیے پیامِ موت ہے اور ان کی تہذیب و معاشرت پر یلغار ہے۔ اس دعوت کے آگے بڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کی مقدس دنیا کو آگ لگادی جائے اور ایک ’نئی دنیا‘ تعمیر کی جائے۔ اس ’خطرہ‘ کو محسوس کرتے ہی انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے خلاف صف آرائی شروع کردی اور اس دعوت کے مقابلے کے لیے وہ میدان میں آگئے، جسے آپؐ پیش فرما رہے تھے۔ ہر جھوٹا خدا اپنی خدائی کی حفاظت کے لیے کھڑا ہوگیا اور ہر بت کے پجاری نے اپنے بت کی حمایت میں کمر کس لی اور ہر طرف سے آواز آنے لگی:

اَنِ امْشُوْا وَ اصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ ۖۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ ۝ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۖۚ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۝

(صٓ:٦،٧)

کہ چلو اور اپنے معبودوں (کی حمایت) پر جم جاؤ یقیناً (یہ دعوت بے وجہ نہیں ہے بلکہ) اس میں کوئی نہ کوئی غرض (پوشیدہ) ہے ایسی بات تو ہم نے پچھلے دین میں بھی نہیں سنی تھی۔ یقیناً یہ گھڑی ہوئی بات ہے۔

اب اس ماحول میں جس میں محمد ﷺ کی دعوت اٹھی تھی، زبردست کشمکش شروع ہوگئی اور آپؐ کو اور آپؐ کے ساتھیوں کو اتنی سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑا کہ خدا پرستوں کے سوا کوئی ان کی تاب نہیں لاسکتا تھا، یہ افراد کے درمیان مال و دولت کا جھگڑا نہیں تھا، یہ کسی جائداد کا قضیہ نہیں تھا۔ یہ قبیلوں کی باہمی چپقلش اور نزاع نہیں تھی، یہاں کسی گروہ کے اقتدار پانے اور کسی گروہ کے اقتدار سے محروم ہونے کی بحث نہیں تھی، بلکہ یہ کشمکش اس دعوت کی وجہ سے تھی کہ انسان اللہِ واحد کی عبادت قبول کرلے اور دل و جان سے اس کے سامنے جھک جائے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کا بندہ ہے اور اسے اللہ تعالیٰ ہی کی بندگی کرنی چاہیے۔ محمد ﷺ اور آپ کے ساتھی اس حقیقت کا اعتراف کر رہے تھے اور آپؐ کے مخالفین اس حقیقت کو جھٹلا رہے تھے۔ یہ سچائی اور جھوٹ کی کشمکش تھی اور ایک ثابت شدہ دعویٰ اور بے اصل بات کا مقابلہ تھا۔ آپؐ کی دعوت انسان کی فطرت کے عین مطابق تھی، اس لیے دلوں کو اپیل کر رہی تھی اور سخت مخالفت کے باوجود پھیلتی جارہی تھی۔ لوگ ہر طرف سے کھنچ کر اس کی طرف آرہے تھے۔ حتّٰی کہ بدترین دشمنوں کے گھروں سے اس کے حامی پیدا ہونے لگے۔ اور اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے اسے خود باطل کی اگلی صفوں سے سپاہی فراہم ہونے شروع ہوگئے۔

اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند کرنے والے

محمد ﷺ کے ماننے والوں کے سامنے ایک عظیم مقصد تھا۔ وہ بہت بڑا کام کرنے اٹھے تھے۔ ان پر یہ ذمے داری ڈالی گئی تھی کہ وہ اس دین کی گواہی دیں جس کو

انھوں نے دینِ حق سمجھ کر قبول کیا ہے، اور اس دعوت کو عام کریں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انھیں ملی ہے۔ ان سے کہا گیا کہ دنیا اللہ کو بھولی ہوئی ہے، جاؤ اسے اللہ کے ذکر سے بھردو، لوگ اپنے انجام سے بے خبر ہیں، اٹھو انھیں اپنے انجام سے آگاہ کرو، انسان ہلاکت کی طرف بڑھ رہا ہے، لپکو اسے ہلاکت سے بچاؤ، دنیا سے عدل و انصاف مٹ رہا ہے، دوڑو اسے زندہ کرو، معروف ختم ہو رہا ہے اور منکر پھیل رہا ہے، تمھارا فرض ہے کہ معروف کو قائم کرو اور منکر کو بدل دو۔

اس طرح محمد ﷺ کی زیرِ قیادت ایک ایسی امت تیار ہوئی جو دنیا کی تمام امتوں اور جماعتوں سے بالکل مختلف تھی۔ دنیا کا ہر گروہ اپنے ذاتی اغراض کے گرد گردش رہا تھا، لیکن یہ لوگ اللہ کے دین کی خاطر اپنے مفادات کو قربان کر رہے تھے۔ یہ تاجروں کا گروہ نہیں تھا جو اپنی تجارت کو فروغ دینے کی کوشش کرتا، یہ سرمایہ داروں کا طبقہ نہیں تھا کہ اسے اپنا سرمایہ بڑھانے کی فکر ہوتی، یہ اپنے کچھ حقوق نہیں چاہ رہا تھا کہ وقت کے اقتدار سے ان حقوق کو پاکر خوش ہوجاتا، یہ اپنے 'مفادات' کے تحفظ میں نہیں لگا ہوا تھا کہ ان کی حفاظت کے بعد مطمئن ہوکر بیٹھ جاتا۔ یہ اللہ کے دشمنوں سے کسی مصالحت کا خواہش مند نہیں تھا کہ اس مصالحت کے ساتھ اس کا کام ختم ہوجاتا اور اس کو 'سکون' کی نیند آجاتی، بلکہ یہ اللہ کے وفاداروں کا گروہ تھا، مومن و مسلم انسانوں کا گروہ تھا۔ یہ آخرت پسندوں اور اللہ کے چاہنے والوں کا گروہ تھا جو دنیا کو اس کی عبادت و اطاعت کی دعوت دینے اُٹھا تھا، اس کے سامنے سوائے اس کے اور کوئی مسئلہ نہیں تھا کہ اللہ کے بندوں تک اللہ کا دین پہنچ جائے۔ وہ اپنی جدوجہد میں اس سے کم کسی چیز پر تیار نہ تھا کہ انسان غیر اللہ کی بندگی کو چھوڑ کر اللہ کے دین کی بندگی قبول کرلے۔ اس گروہ کا ہر فرد اس کا سپاہی تھا جو اللہ کے دین کو غالب و سربلند کرنے کے جذبے سے سرشار تھا۔ وہ اسی مقصد کے لیے جی رہا تھا اور اسی مقصد پر جان دے رہا تھا۔

آزمائشیں شروع ہوگئیں

اس صورتِ حال نے ماحول میں زبردست تلاطم پیدا کر دیا۔ جو لوگ اس دعوت کا ساتھ دے رہے تھے ان پر ہر طرف سے مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، دوست دشمن بن گئے، محبت نفرت میں بدل گئی، جن لبوں پر مسکراہٹ تھی ان پر خشونت کے آثار ظاہر ہونے لگے، اور کفر کی طاقتیں مجنونانہ جوش کے ساتھ پل پڑیں۔ بھائی کے ہاتھ سے بہن چوٹ کھا رہی تھی، ماں باپ اولاد کے درپئے آزار تھے، بیوی شوہر کے ظلم کا نشانہ بنی ہوئی تھی۔ ایک عزیز دوسرے عزیز کے لیے عذابِ جان بنا ہوا تھا، لیکن قرآن کی دعوت جن کے دلوں میں اتر چکی تھی وہ زخم پر زخم کھا رہے تھے اور مسکرا رہے تھے، دشمن تیر آزما رہا تھا اور وہ اپنا سینہ آزما رہے تھے، تپتی ہوئی ریت پر انھیں گھسیٹا جاتا، جلتے ہوئے کوئلوں پر انھیں لٹایا جاتا، لیکن اُن کے پائے ثبات میں لغزش نہ آتی۔ پرندے ٹھنڈے سایہ میں پناہ لے سکتے تھے، لیکن ان کے لیے کوئی سایہ نہیں تھا، جنگل کے جانور آزادی سے گھومتے تھے، لیکن ان کے پاؤں میں 'بیڑیاں' تھیں۔ یہ حق پرست تھے اور دنیا انھیں جرمِ حق پرستی کی سزا دے رہی تھی۔ انھوں نے یہ سمجھ کر رسولِ عربی، فداہ ابی و امی کی دعوت قبول کی تھی کہ کوئی چیز اب ان کی اپنی نہیں رہی بلکہ اللہ تعالیٰ کی ہوگئی اور جہاں اس کا حکم ہوگا وہاں وہ اسے بے دریغ صرف کردیں گے۔ اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے لیے انھوں نے اپنے آپ کو بیچ دیا تھا، وہ اپنی جان کی قیمت وصول کر چکے تھے، اس لیے انھیں اس کی کوئی پروا نہیں تھی کہ موت کس وقت آتی ہے اور کس حالت میں آتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ آج بھی رسولِ کریم ﷺ کی دعوت کا ساتھ وہی شخص دے سکتا ہے جسے زندگی سے زیادہ راہ حق میں موت پیاری ہو، جسے بیوی بچوں سے زیادہ اللہ سے اور اس کے دین سے محبت ہو، جو حق کی خاطر رشتوں پر چھری چلا سکتا ہو اور اپنے چلتے ہوئے کاروبار کو نقصان پہنچا سکتا ہو، اور جو اپنے چین اور سکون کو قربان کرنے کے لیے تیار ہو۔ ورنہ جس شخص کو جان اور اولاد عزیز ہو، جو دنیاوی تعلقات میں

گرفتار ہو، جو سلامتی کا طالب اور سکون کا جویا ہو اور جسے اپنے کاروبار اور مال و دولت سے محبت ہو، وہ کبھی اُس دعوت کے تقاضے پورے کر ہی نہیں سکتا، جو محمد ﷺ کی دعوت تھی اور جس کے لیے آپؐ نے اپنی پوری زندگی اور اپنا پورا اثاثہ لٹا دیا تھا۔ قرآن حکیم کا واضح اعلان ہے کہ:

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ ٟ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (التوبۃ: ۲۴)

(اے محمدؐ) لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تمھارے باپ اور تمھارے لڑکے اور تمھارے بھائی اور تمھاری بیویاں اور تمھارے خاندان اور قبیلہ کے لوگ اور وہ مال و دولت جسے تم نے حاصل کیا ہے اور وہ تجارت جس کے ماند پڑ جانے کا تمھیں خوف رہا کرتا ہے اور وہ مکانات جن کو تم پسند کرتے ہو، اگر اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ تمھیں محبوب ہیں تو اس بات کا انتظار کرو کہ اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ نافذ کردے اور یہ واقعہ ہے کہ اللہ فاسق انسانوں کو سیدھی راہ نہیں دکھاتا۔

محمد ﷺ نے اپنے ماننے والوں کو پہلے ہی قدم پر بتا دیا تھا کہ یہ نہ سمجھو کہ تمھاری راہ آسان ہے۔ تم نے جو راہ اختیار کی ہے اس پر وہی شخص چل سکتا ہے جو اس کی مشکلات کو راحتِ جان سمجھے اور بڑے سے بڑے صدمہ کو بھول کر اس طرح آگے بڑھے جیسے وہ اس کے لیے صدمہ تھا ہی نہیں۔ یہ راہِ حق ہے اور حق کی راہ کوئی نئی راہ نہیں ہے۔ اس راہ پر تمھیں پیغمبروں اور ان کے جانشینوں کے نقوشِ قدم ملیں گے، یہی نقوش تمھارے لیے اسوہ ہیں۔ انھوں نے اپنا سب کچھ لٹا دیا، لیکن راہِ حق سے پیچھے نہ ہٹے۔ جب اسی راہ پر تمھیں چلنا ہے اور اس کے سوا کوئی دوسری راہ تمھارے لیے نہیں ہے تو پھر راہ کی مسافت کے بارے میں کیوں پوچھتے ہو؟ جب یہ راہ ہی سنگلاخ ہے تو آبلہ پائی کی شکایت کیوں کرتے ہو؟ جب تم نے خاردار وادی میں قدم رکھا ہے تو کس

لیے کانٹوں کا شمار کرتے ہو؟ یاد رکھو! جب تم نے ایمان کا دعویٰ کیا ہے تو تمھیں زبان پر حرفِ شکایت لانے کی اجازت نہیں ہے۔ اس راہ میں منزل تک پہنچنے کے لیے بے پایاں عزم و ہمت اور انتہائی ایثار و قربانی کی ضرورت ہے۔ جس شخص کو دنیا کی ہر دل کشی اور نفس کی ہر تمنا اپنی طرف کھینچ لے وہ روحِ ایمان سے خالی ہے۔ وہ منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ حق تم سے جاں نثاری کا مطالبہ کرتا ہے اور تم ٹھوکروں سے گھبراتے ہو؟ مومن کی راہ میں نہ تو اس کے نفس کی خواہشات رکاوٹ بن سکتی ہیں، نہ بیوی بچے، نہ مال و دولت اور نہ جاہ و اقتدار۔ کیوں کہ یہ ایمان کے منافی اور رہروانِ حق کے طریقے کے خلاف ہے۔ موت کا ایک وقت معین ہے اور اس وقتِ معین پر موت آ کر رہے گی، تو پھر کیوں نہ انسان اللہ تعالیٰ کی راہ میں مرے۔ زندگی ایک سرمایہ ہے۔ اس سے انسان 'ثوابِ دنیا' بھی خرید سکتا ہے اور 'ثوابِ آخرت' بھی۔ زہے نصیب اس شخص کے جو آخرت کی طلب میں اپنی دنیا کو نثار کردے کہ کل اسی کے حصے میں اللہ کی ابدی نعمتیں آنے والی ہیں۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَ سَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ وَ كَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَاۤ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ مَا ضَعُفُوْا وَ مَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾

(آل عمران: ۱۴۵، ۱۴۶)

کوئی شخص اللہ کے حکم کے بغیر مر نہیں سکتا۔ موت کا وقتِ مقرر لکھا ہوا ہے۔ جو کوئی ثوابِ دنیا کا خواہش مند ہوگا اسے ہم اسی میں سے دیں گے اور جو شخص ثوابِ آخرت چاہے گا اسے آخرت کا ثواب دیں گے اور شکر کرنے والوں کو ہم یقیناً ان کے شکر کا بدلہ عطا کریں گے۔ کتنے ہی ایسے نبی گزرے ہیں کہ بہت سے اللہ والوں نے ان کے ساتھ ہو کر دشمنوں سے جنگ کی اور اللہ کی راہ میں انھیں جو کچھ تکلیف پہنچی اس سے وہ نہ کم ہمت ہوئے اور نہ ضعف و ناتوانی کا مظاہرہ کیا اور نہ انھوں نے دشمن کے مقابلہ میں عاجزی اختیار کی اور اللہ صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

جن لوگوں نے محمد ﷺ کی دعوت قبول کی تھی انھوں نے اس یقین کے ساتھ

اسے قبول کیا تھا کہ دنیا و آخرت کی کامیابی اسی سے وابستہ ہے۔ حق وہ ہے جسے آپ کی زبان حق کہے اور جسے آپ باطل کہہ دیں وہ باطل ہے۔ نجات اس راہ میں ہے جسے آپ پیش فرما رہے ہیں، اس کے خلاف جتنی راہیں ہیں سب منزل سے بھٹکانے والی ہیں۔ یہی یقین ان کا اصل سرمایہ تھا، اسی یقین کے ذریعے وہ باطل کا مقابلہ کرتے رہے۔ آزمائشیں اپنی حد کو پہنچ گئیں، لیکن ان کے یقین کو بدل نہ سکیں، باطل نے اپنی پوری قوت صرف کردی، لیکن انھیں وہ سرنگوں نہ کرسکا۔ ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کے مقرّب بندوں کے پرعزم حالات تھے، ان کی سرفروشی و جاں نثاری کے کارنامے تھے، اور ان کی وفاداری اور عزیمت کی تاریخ تھی، چناں چہ وہ اپنا سب کچھ اس دعوت کے لیے لٹا رہے تھے لیکن اس کے باوجود انھیں یہی احساس ستایا کرتا تھا کہ ابھی وفاداری کا حق ادا نہیں ہوا ہے۔

ہجرت ہوئی

محمد ﷺ کی اس دعوت کو شروع ہوئے تیرہ سال کی مدت گزر چکی تھی، اللہ تعالیٰ کا نام لینے والے چوٹ کھائے ہوئے جسموں اور زخمی دلوں کے ساتھ حق کی گواہی دے رہے تھے۔ وہ سراپا مظلوم تھے، انھوں نے کسی پر ظلم نہیں کیا تھا، کسی کا مال نہیں چھینا تھا، کسی کے ساتھ بدسلوکی نہیں کی تھی، کسی کی عزت و آبرو پر حملہ نہیں کیا تھا، اُن سے کسی کو اذیت نہیں پہنچی تھی، وہ اللہ تعالیٰ کے بندے تھے اور ان کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ اپنے بندے ہونے کا اعلان کر رہے تھے اور دوسروں کو بندگی کی دعوت دے رہے تھے۔ جب حالات ناقابل برداشت ہوگئے تو انھیں حکم دیا گیا کہ اب وہ ظالموں کی بستی چھوڑ دیں، چناں چہ انھوں نے اپنی وہ بستی چھوڑ دی، جس کے در و دیوار سے انھیں محبت تھی، جس کے پہاڑوں اور چشموں سے انھیں الفت تھی، جس کے گلی کوچوں سے انھیں انس و تعلق تھا، جس کی خاک کے ذروں اور ہوا کے جھونکوں سے انھیں پیار تھا۔ انھوں نے ایک نئی بستی کو اپنا وطن بنایا۔ وہ بے سروسامانی کے عالم میں مکہ کی مقدس سرزمین سے نکل کر مدینہ منورہ کی طرف کوچ کر گئے۔ یہ ترکِ وطن نہ تھا، یہ اللہ کی راہ میں ہجرت تھی، اور صحیح

معنی میں ہجرت تھی۔ اس نئی بستی نے والہانہ جوش و خروش کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا اور اللہ کا دین ان کے درمیان پھیلنے لگا۔ مخالفین اس کی تاب نہ لا سکے اور تڑپ اٹھے، ہر طرف سے اس بستی پر تیر برسنے لگے۔ لیکن مخالفت کے اسی طوفان میں وہ افراد بھی تیار ہوتے رہے جن کی اللہ تعالیٰ کے دین کو سربلند کرنے کے لیے ضرورت تھی۔ وہ آزمائش کی بھٹی سے گزار کر کندن بنائے جا رہے تھے۔ ان کے سینے اللہ کی یاد سے معمور تھے اور ان کے چہروں پر آثارِ عبودیت نمایاں تھے۔ وہ اپنے خیالات میں مخالفین کے خیالات سے، اپنے اخلاق میں ان کے اخلاق سے، اپنی سیرت میں ان کی سیرت سے اور اپنے اعمال میں ان کے اعمال سے بالکل مختلف تھے۔

جہاد کیا گیا

جب ان برگزیدہ نفوس کی ایک جماعت تیار ہوگئی تو قرآن نے ان سے کہا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ زمانہ کی رفتار بدل دی جائے، ظالم کے ہاتھ سے تلوار چھین لی جائے اور عدل و انصاف کی حکومت قائم کی جائے۔ اب اللہ تعالیٰ کا نام لینا جرم نہ ہوگا۔ اب اس کے غلام ستائے نہ جائیں گے، اب وہ اپنے گھر سے بے گھر نہ ہوں گے۔ اب ان پر خوف و ہراس کا عالم نہ رہے گا۔ اب حق کی مظلومیت باقی نہ رہے گی اور اب دینِ حق کی فتح و نصرت کا کارنامہ انجام پائے گا۔ اٹھو اپنے ہاتھوں سے یہ کارنامہ انجام دو۔ دنیا تمھاری منتظر ہے اور خداوندِ عالم تمھاری مدد کے لیے تیار ہے۔

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۟ۙ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ

(الحج: ۳۹، ۴۰)

وہ اہل حق جن سے ان کے دشمن لڑ رہے ہیں انھیں اجازت دے دی گئی کہ وہ بھی ان سے جنگ کریں، کیوں کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے اور یقیناً اللہ ان کی مدد کی قدرت رکھتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے۔ ان کا جرم بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے۔

تلوار اٹھانے کی یہ اجازت ان لوگوں کو دی گئی تھی جو رات کے 'راہب' اور دن کے 'شہ سوار' تھے، جو اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے میدان میں آئے تھے اور جو اس کے دین کی حمایت کے لیے اٹھے تھے۔ یہ اجازت ان کو اس لیے دی گئی تھی تاکہ کم زوروں پر ستم کے پہاڑ اور نہ ٹوٹیں، دنیا سے جورِ ناروا ختم ہو، انسان کو یہ حق ہو کہ وہ آزادی کے ساتھ اللہ کی بندگی کرے اور اللہ کے بندے اس وجہ سے نہ ستائے جائیں کہ وہ اس کی عبادت کر رہے ہیں اور اس کا دین پھیلانا چاہتے ہیں۔

وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾

(النساء:۷۵)

تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اور اُن بے بس اور کم زور مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے نہیں لڑتے ہو جو دعائیں مانگ رہے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں اس بستی سے نکال لے جس کے باشندے ہم پر ظلم کر رہے ہیں اور اپنی طرف سے ہمیں کوئی سرپرست عطا فرما اور اپنی (ہی) طرف سے ہمارا کوئی مددگار پیدا کر دے۔

اس طرح عرب کی سرزمین پر وہ جنگ لڑی گئی جو دنیا کے سب سے بڑے انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور جس نے تاریخ کا رخ بالکل موڑ کر رکھ دیا۔ اس جنگ کو اگر آپ دنیا کی دوسری جنگوں پر قیاس کریں گے تو بہت بڑی غلطی کریں گے، کیوں کہ اس کے پیچھے وہ ذلیل محرکات نہیں تھے، جن کی وجہ سے عام طور پر جنگیں ہوتی ہیں۔ یہ جنگ صحیح معنی میں ایک مقدس جنگ تھی اور اتنے اعلیٰ و ارفع نصب العین کے لیے لڑی جا رہی تھی جس سے اعلیٰ نصب العین کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا تو صرف یہی جانتی تھی کہ لڑائی مال و دولت کے لیے ہوتی ہے، جھگڑے حقوق منوانے کے لیے ہوتے ہیں، خوں ریزیاں عداوت اور دشمنی کی وجہ سے ہوتی ہیں، جنگ ملکوں کے فتح کرنے کے لیے کی جاتی ہے۔ وہ خدا پرستی کی خاطر جنگ سے ناآشنا تھی۔ وہ نہیں جانتی

تھی کہ اللہ تعالیٰ کا دین قائم کرنے کے لیے بھی جنگ کی جاتی ہے۔ کفر و شرک کو مٹانے اور فتنہ و فساد کو ختم کرنے کے لیے بھی جان و مال کی قربانی دی جاتی ہے۔ اب یہی جنگ لڑی جا رہی تھی۔ یہ پاک مقصد کے لیے پاک انسانوں کی جنگ تھی، یہ اللہ کا نام لینے والوں اور اس کے حریفوں کے درمیان جنگ تھی۔ اس جنگ میں ایک طرف اللہ کے دوست تھے اور دوسری طرف اس کے دشمن، ایک طرف حق کی سربلندی چاہنے والے تھے اور دوسری جانب باطل کے غلبہ کے آرزومند۔ ایک جانب اخلاق کے علم بردار تھے اور دوسری طرف بداخلاقی پھیلانے والے۔ ایک سمت میں آخرت کے طالب تھے اور دوسری سمت میں دنیا کے پرستار۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ تھا کہ اس جنگ میں اس کے دوست کامیاب ہوں گے اور اس کے دشمن ناکام۔ چناں چہ اس کا وعدہ پورا ہوا اور دنیا کی کوئی طاقت اس کی راہ میں مزاحم نہ ہو سکی۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ۚ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ ۚ اِنَّ کَیْدَ الشَّیْطٰنِ کَانَ ضَعِیْفًا ﴿۷۶﴾ (النساء:۷۶)	جو لوگ ایمان رکھتے ہیں وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور اللہ کا انکار کرنے والوں کی لڑائی طاغوت کی راہ میں ہوتی ہے تو اے ایمان والو تم شیطان کے ساتھیوں سے جنگ کرو (یقیناً تم کامیاب رہو گے) کیوں کہ شیطان کی تدبیر بہت کم زور ہوتی ہے۔

حق غالب ہوا

اس وقت کے آنے پر دعوتِ حق کا کم زور پودا پوری تیزی کے ساتھ ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر گیا، جس کے سائے میں بے شمار انسانوں کو 'پاکیزہ زندگی' ملی، سکون اور چین ملا اور حق پرستی و تقویٰ کی دولت ملی۔ مکہ کی پہاڑیوں سے حق کی جو آواز بلند ہوئی تھی وہ اب آہستہ آہستہ پورے جزیرہ نمائے عرب میں گونجنے لگی، مظلومانہ آزمائش کا دور ختم ہوا اور حکومت و اقتدار کا دور آ گیا، خوف کی حالت جاتی رہی اور امن کی زندگی نصیب ہوئی۔ باطل کا زور ٹوٹ گیا اور اللہ تعالیٰ کے دین پر عمل کرنا آسان

ہوگیا۔ دعوتِ حق کا یہ کام تیئس (۲۳) برس کی مدت میں اللہ کے رسول ﷺ اور آپؐ کے اصحابِ کرامؓ کے ہاتھوں انجام پایا اور جب بھی یہ کام انجام پاسکتا ہے تو ایسے ہی اللہ کے فرماں برداروں اور صالح انسانوں کے ذریعے انجام پاسکتا ہے۔ جب یہ کام ختم ہوچکا تو اللہ کی طرف سے تکمیلِ دین اور اتمامِ نعمت کا اعلان ہوگیا اور کفر پر دینِ حق کے بارے میں آخری طور سے مایوسی چھا گئی۔

اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ؕ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ (المائدۃ:۳)

آج کافر تمھارے دین سے مایوس ہوچکے ہیں تو تم ان سے نہ ڈرو۔ بلکہ مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمھارے لیے تمھارے دین کو مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر پوری کردی ہے اور تمھارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کیا ہے۔

حضرت محمد ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹنے کی جو دعوت دی، کیا انسان کی فوز و فلاح کی اس سے بہتر کوئی دعوت ہوسکتی ہے؟ اس دعوت کے ذریعے جو صالح اور عظیم انقلاب برپا ہوا، کیا تاریخ نے اس طرح کا پاکیزہ اور اتنا بڑا کوئی دوسرا انقلاب دیکھا ہے؟ یہ ایک منارۂ نور ہے۔ جب تک سورج اور چاند گردش میں ہیں اور اس کرۂ ارض پر انسان موجود ہے، اللہ کے دین کی دعوت دینے والے اور انسان کی بھلائی چاہنے والے اس سے جذبہ، حوصلہ اور راہ نمائی حاصل کرتے رہیں گے اور کامیابی کی طرف ان کی پیش قدمی جاری رہے گی۔

مباحثِ دعوت

☜ اسلام کی دعوت

☜ دعوت اور اتباع

☜ دعوت و اصلاح کی ترتیب

☜ دعوت کے اُصول و آداب

☜ داعی کامیاب ہے

☜ انکار دین کے اسباب

☜ وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ کا دین ملتا ہے

اسلام کی دعوت

دین حق کی شہادت

قرآن مجید میں یہ بات وضاحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول دنیا میں 'شہادت علی الناس' کا فرض انجام دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس قوم میں رسول کی بعثت ہوتی ہے وہ اس کے درمیان اللہ کے دین کا حق ہونا دلائل سے اس طرح ثابت کردیتے ہیں کہ اس کے انکار کی کوئی معقول بنیاد باقی نہیں رہتی اور حجت تمام ہو جاتی ہے۔ اسی معنیٰ میں اللہ کے رسول کو شاہد یا شہید قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

وَ نَزَعْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا فَقُلْنَا هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوْٓا اَنَّ الْحَقَّ لِلّٰهِ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (القصص:۷۵)

اور ہم ہر امت میں سے ایک شہید نکالیں گے پھر (منکرین سے) کہیں گے کہ اپنی دلیل پیش کرو تب وہ جان جائیں گے کہ حق بات اللہ کی ہے اور جو کچھ وہ افترا بازی کررہے تھے وہ سب غائب ہوجائے گی۔

اس شہادت پر قوموں کا فیصلہ ہو جاتا ہے

جب کسی قوم میں 'شہادت علی الناس' کا فرض پوری طرح انجام پا جاتا ہے اور اتمامِ حجت ہو جاتی ہے تو اس کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اللہ کے رسولوں کا ساتھ دینے والے اس کے انعام و اکرام کے مستحق قرار پاتے ہیں اور ان کے مخالفین پر اس کا عذاب ٹوٹ پڑتا ہے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا ؕ وَ كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾

(الروم:۴۷)

ہم نے تم سے پہلے بھی رسول ان کی قوموں کی طرف بھیجے وہ ان کے پاس واضح دلائل لے کر آئے (اس کے بعد) ہم نے ان لوگوں سے انتقام لیا جنھوں نے جرم کیا (اور ایمان والوں کی مدد کی) ایمان والوں کی مدد کرنا ہمارے لیے ضروری تھا۔

قیامت کے روز بھی قوموں کا فیصلہ اسی شہادت کی بنیاد پر ہوگا۔ سورہ نساء میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾ يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ عَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ﴿۴۲﴾

(النساء:۴۱، ۴۲)

اس وقت کیا حال ہوگا جب کہ ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور آپ کو (اے محمدؐ) ان لوگوں پر گواہ بنا کر کھڑا کریں گے۔ اس دن جن لوگوں نے کفر کیا اور رسول کی نافرمانی کی، آرزو کریں گے کہ کاش زمین پھٹ جائے اور اس میں سما جائیں اور اللہ سے کوئی بات وہ چھپا نہ سکیں گے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ منبر پر تشریف فرما تھے اور مجھ سے قرآن سنانے کی فرمائش کی۔ میں نے عرض کیا، کیا میں قرآن سناؤں جب کہ وہ آپؐ پر نازل ہوا ہے (آپؐ سے بہتر کون اس کی تلاوت کرسکتا ہے؟) آپؐ نے فرمایا: میں چاہتا ہوں کہ دوسرے سے (بھی) سنوں۔ چناں چہ میں نے سورہ نساء کی تلاوت شروع کی جب مذکورہ بالا آیات پر پہنچا تو آپؐ نے فرمایا: اب بس کرو۔ میں آپ کی طرف متوجہ ہوا، تو دیکھا کہ آپ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں[1]

یہ آنسو ایک طرف تو اس احساس کی وجہ سے تھے کہ آپؐ پر ایک بھاری

---

[1] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۂ نساء، وکتاب فضائل القرآن، باب البکاء عند قرأۃ القرآن۔ صحیح مسلم، کتاب صلوٰۃ المسافرین، باب فضل استماع القرآن ... الخ

ذمے داری ڈالی گئی ہے۔ دوسری طرف اس تصور سے بھی آپؐ کا دل کانپ رہا تھا کہ آپ کی قوم اس دین کو رد کردے تو کل اس کا کیا حشر ہوگا؟[۱]

رسول اللہ ﷺ نے تبلیغِ دین کا حق ادا کر دیا

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ پر تبلیغِ دین کی ذمے داری ڈالی، آپؐ نے دنیا پر یہ حقیقت پوری طرح کھول دی کہ انسان اللہ کا بندہ اور غلام ہے اور بندگی ہی میں اس کی نجات ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کا مطیع و فرماں بردار ہوگا وہ کام یاب ہوگا اور جو اس سے بغاوت کرے گا وہ ناکام ہوگا۔ آپ کو حکم ہوا۔

يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۷﴾ (المائدۃ: ۶۷)

اے رسول جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے اسے دوسروں تک پہنچا دیجیے۔ اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو اپنا فرضِ رسالت ادا نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ لوگوں سے آپ کی حفاظت کرے گا۔ بے شک اللہ کافر قوم کو راہ نہیں دکھاتا۔

یہ آیت مدینہ میں جس وقت نازل ہوئی اللہ کے رسول حضرت محمد ﷺ کی شدید مخالفت جاری تھی۔ ایک طرف اللہ تعالیٰ کا دین تکمیل کے مرحلے سے گزر رہا تھا، دوسری طرف مشرکین، یہود اور منافقین پوری کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح یہ دین غالب اور سربلند نہ ہونے پائے۔ اس کے لیے ہر طرح کی تدبیریں کی جا رہی تھیں۔ اللہ کے رسول کی ذاتِ گرامی عداوت کا خاص ہدف بنی ہوئی تھی، اور آپؐ کے قتل تک کی سازشیں ہو رہی تھیں۔ ان نازک حالات میں ہدایت کی گئی کہ آپؐ اللہ کے دین کو بے کم و کاست جوں کا توں پیش کریں، اس کا کوئی ایک حکم یا ایک ہدایت بھی اللہ کے بندوں تک نہ پہنچے تو پیغامِ رسالت ناقص اور نامکمل رہ جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کا

---

(۱) راقم کی کتاب 'تجلیات قرآن' میں 'شہادت علی الناس' پر ایک مستقل مضمون موجود ہے۔ تفصیل اس میں دیکھی جا سکتی ہے۔

پورا دین بندوں تک نہیں پہنچا ہے، اس لیے آپؐ ہر خوف و خطر سے بے پروا ہوکر تبلیغِ دین کا کام جاری رکھیں، چاہے اس کی زد لوگوں کے عقائد، رسوم و رواج، قوانینِ حیات اور ان کی سیرت و کردار کسی بھی چیز پر کیوں نہ پڑ رہی ہو اور وہ آپ کے خلاف کتنے ہی منصوبے کیوں نہ بنا رہے ہوں؟ اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت فرمائے گا، دشمن آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔

روایات میں آتا ہے کہ حالات اس قدر نازک ہوگئے تھے کہ صحابہ کرام رات میں آپ کی حفاظت اور نگرانی فرمایا کرتے تھے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپؐ نے اپنے خیمے سے باہر نکل کر فرمایا کہ اب آپ لوگ لوٹ جائیں، اللہ نے میری حفاظت کی ذمے داری لے لی ہے۔[1]

امتِ مسلمہ کی دعوتی ذمے داری

رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے دین کو بغیر کسی کمی بیشی کے انسانوں تک پہنچا دیا۔ اس کے بعد آپ اس دنیا سے تشریف لے گئے، لیکن جو دین آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملا تھا وہ آج بھی اپنی صحیح شکل میں موجود ہے اور قیامت تک موجود رہے گا۔ اب یہ اس دین کے ماننے والوں کی ذمے داری ہے کہ اسے دنیا کے سامنے پیش کریں۔ اگر وہ اس فرض کو ادا کریں گے تو اللہ تعالیٰ کے محبوب ٹھہریں گے اور اگر اسے انھوں نے بھلا دیا تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی سخت باز پرس ہوگی اور اس کی گرفت سے کوئی چیز انھیں بچا نہیں سکے گی۔ قرآن مجید نے صراحت کی ہے کہ 'شہادت علی الناس' کی ذمے داری محمد ﷺ کے بعد آپ کی امت پر عائد ہوتی ہے اور اسے وہ کام انجام دینا ہوگا جو محمد ﷺ نے انجام دیا ہے۔ آپ نے جس طرح امت کے سامنے اللہ کے دین کی شہادت دی اسی طرح اس امت کو دوسروں کے سامنے اس کی گواہی دینی ہوگی۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر: ۸۹/۲

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ (البقرۃ:۱۴۳)

اور اس طرح ہم نے تم کو 'امت وسط' بنایا ہے تا کہ تم لوگوں پر (حق کے) شاہد بنو اور رسول تم پر شاہد بنے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ قوموں کی قسمت اس امت سے وابستہ ہے۔ وہ دین کی شہادت کا فرض انجام دے کر ان کی ہدایت کا سامان فراہم کرسکتی ہے۔ اسی سے وہ اپنی ذمے داری سے سبک دوش ہوگی اور اللہ تعالیٰ کے یہاں بے پایاں اجر وثواب کی مستحق قرار پائے گی۔ لیکن اگر اس سے غفلت برتے تو دنیا کی گم راہی کے لیے اس سے باز پرس ہوگی اور ڈر ہے کہ بڑی سخت باز پرس ہوگی۔ لیکن افسوس امت اپنی اس عظیم ذمے داری کو فراموش کر چکی ہے۔ شاید اس کو اس کا احساس تک نہیں ہے۔

ایک موقعے پر رسول اللہ ﷺ نے اس امت کے بارے میں ارشاد فرمایا:

اَنْتُمْ شُهَدَاءُ اللّٰهِ فِي الْاَرْضِ[1] تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو۔

یہ اس بات کا اعلان ہے کہ یہ امت اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق کی شاہد ہے، دنیا میں یہ تنہا اسی کی ذمے داری بھی ہے اور تنہا اسی کی یہ پوزیشن بھی ہے کہ لوگوں کو یہ بتا سکے کہ کون سی راہ اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والی ہے اور کون سی راہ اس سے دور کرنے والی ہے، حق کیا ہے اور باطل کیا؟ کون صراطِ مستقیم پر گام زن ہے اور کس نے ضلالت کی راہ اختیار کر رکھی ہے؟ یہ امت اللہ تعالیٰ کے دین کی امین ہے، اس لیے کہ اللہ کے آخری رسولؐ نے اس کے دین کو اسی امت کے حوالے کیا ہے۔ آج سوائے اس کے کسی بھی گروہ کے پاس اللہ کا دین نہیں ہے۔ اس لیے یہ اسی کی ذمے داری ہے کہ اس دین کو دوسروں تک پہنچائے۔ اگر اس نے یہ کام نہ کیا تو پھر دنیا میں یہ کسی طرح انجام نہ پاسکے گا۔ یہی بات ہے، جسے محمد ﷺ نے اس وقت فرمایا تھا جب مشرکینِ مکہ اِس امت کو

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب ثناء الناس علی المیت۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب فی من یثنی علیه خیرا او شرا من الموتی.

ختم کرنے کے ارادے سے میدانِ بدر میں جمع ہوئے تھے۔

اَللّٰھُمَّ اِنْ تَھْلِکْ ھٰذِہِ الْعِصَابَۃُ مِنْ اَھْلِ الْاِسْلَامِ لَا تُعْبَدُ فِی الْاَرْضِ [1]	اے اللہ اگر اہلِ اسلام کا یہ گروہ ختم ہوجائے گا تو پھر زمین میں تیری پرستش نہ ہوگی۔

حجۃ الوداع کے موقع پر تکمیل دین کا اعلان ہوچکا تھا اور محمد ﷺ اپنی امت سے ان الفاظ میں خطاب فرما رہے تھے۔

لَعَلِّیْ لَا اَلْقَاکُمْ بَعْدَ عَامِیْ ھٰذَا	شاید اس سال کے بعد تم سے میری ملاقات نہ ہوسکے۔

یہ فرماتے ہوئے آپؐ نے اپنے اصحاب سے سوال کیا:

الاَ ھل بلَّغتُ	کیا میں نے تم تک اللہ کا دین پہنچا دیا؟

لوگوں نے بیک آواز جواب دیا کہ ہاں! آپ نے دین ہم تک پہنچا دیا۔ اس پر آپؐ نے پھر فرمایا:

اَنْتُمْ تُسْئَلُوْنَ عَنِّیْ فَمَا اَنْتُمْ قَائِلُوْنَ	کل قیامت کے روز تم سے میرے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اس وقت تم کیا جواب دوگے؟

لوگوں نے کہا:

نَشْھَدُ اَنَّکَ قَدْ بَلَّغْتَ فَاَدَّیْتَ وَ نَصَحْتَ (بخاری و مسلم)	ہم شہادت دیں گے کہ آپ نے حق تبلیغ ادا کر دیا تھا، دین پوری طرح پہنچا دیا تھا اور ہمارے ساتھ انتہائی خیر خواہی کی تھی۔

مجمع کی اس شہادت کے بعد آپؐ نے اپنی انگشتِ مبارک آسمان کی طرف اٹھائی اور تین مرتبہ فرمایا:

اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ	اے اللہ تو گواہ رہ۔

مطلب یہ کہ خدایا تیرے یہ بندے اقرار کر رہے ہیں کہ جو دین تو نے مجھے دیا تھا میں نے اس کی تبلیغ میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور بے کم و کاست اسے ان تک پہنچا دیا

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسير، باب الامداد بالملائكة فی غزوة بدر.

ہے۔ اس کے بعد آپؐ نے مجمع سے کہا:

اَلَا فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ — جو یہاں موجود ہے وہ اسے پہنچا دے جو موجود نہیں ہے۔

اس فقرے کے بارے میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں:

فَوَ الَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ اِنَّهَا لَوَصِیَّتُهٗ اِلٰی اُمَّتِهٖ[1] — قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ یہ آپؐ کی اپنی امت کے لیے وصیت تھی۔

ربیع بن انس (تابعی) فرماتے ہیں:

حَقٌّ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنْ یَّدْعُوَ کَالَّذِیْ دَعَا وَ اَنْ یُّنْذِرَ بِالَّذِیْ اَنْذَرَ[2] — جو شخص رسول اللہؐ کا اتباع کرے اس پر یہ حق عائد ہوتا ہے کہ جس طرح رسول اللہؐ نے دین کی دعوت دی اسی طرح وہ بھی دعوت دے اور جس کتاب کے ذریعے آپ نے لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرایا تھا اس کتاب کے ذریعہ وہ بھی اللہ کے عذاب سے ڈرائے۔

یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ محمد ﷺ کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا جو دین آپ کو ملا ہے اسے دوسروں تک پہنچانا آپ کا فرض ہے۔ آپ اپنی ذمے داری سے صرف اسی وقت سبک دوش قرار پائیں گے جب کہ آپ دنیا سے اس حال میں جائیں کہ اللہ کے بندوں تک اس کا پیغام پہنچا چکے ہوں۔ اگر آپ نے اس کے حق ہونے کی شہادت نہ دی تو دنیا ہمیشہ کے لیے اس سے محروم ہوجائے گی اور اس محرومی کا وبال آپ کو بھی اٹھانا پڑے گا۔ ایسی شکل میں قیامت کے روز اللہ تعالیٰ آپ کے بارے میں دنیا والوں سے پوچھے گا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے پاس میرا نازل کردہ دین تھا اور جو میری ہدایت کے حامل تھے۔ انھوں نے اس سے تمھیں آگاہ کیا تھا یا نہیں؟ آپ کی غفلت کی وجہ

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الحج، باب الخطبة ایام منی

[2] تفسیر ابن کثیر، ۲/۲۲۶

سے دنیا والے یہی جواب دیں گے کہ خدایا تیرے دین کے حامل سوئے ہوئے تھے اور ہمیں گم راہی میں چھوڑ رکھا تھا۔ انھوں نے ہمارے ساتھ خیر خواہی نہیں کی اور تیرا دین ہم تک نہیں پہنچایا۔ آپ کے بارے میں ان کا یہ جواب بالکل صحیح جواب ہوگا اور آپ پر انسانیت کو تباہ کرنے کا الزام ثابت ہوجائے گا۔ پھر بتایئے وہ کون سی چیز ہے جو آپ کو اس وقت اللہ کی گرفت سے محفوظ رکھے گی۔ آج آپ کو اپنے اس جرم کی سنگینی کا احساس نہیں ہے، ورنہ آپ کی راتوں کی نیند اڑ جاتی اور آپ کا سکون ختم ہوجاتا۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر اس شخص سے جو اس کی وفاداری کا دعویٰ کرے یہ کام لینا چاہتا ہے کہ وہ گم راہ انسانوں کو اس کی راہ دکھائے۔ اس لیے اسلام کو اللہ کے دین کی حیثیت سے قبول کرنے کے بعد یہ ہماری اور آپ کی مستقل ذمے داری ہے کہ اسے دوسروں تک پہنچائیں۔ اس احساس سے ہمیں شب و روز بے چین رہنا چاہیے کہ انسان جسے اللہ کی ہدایت اور اس کے دین کا تابع ہونا چاہیے اس سے بے نیاز پھر رہا ہے۔ یہ کام ٹھیک اسی ڈھنگ سے انجام پاسکتا ہے، جس ڈھنگ سے اللہ کے پیغمبروں نے اسے انجام دیا ہے۔ اس کے لیے وہی خلوص، وہی محبت اور وہی دردمندی چاہیے جو اس کے پیغمبروں میں ہوتی تھی۔ اسے ہماری زندگی کا بہترین مصرف اور ہماری جدوجہد کا حقیقی مقصد بن جانا چاہیے۔ اس وقت دنیا اپنے تاریک ترین دور سے گزر رہی ہے۔ آیئے کہ اسے اللہ کے نور سے بھردیں۔ لیکن یہ کام صرف فرصت کے اوقات میں کرنے کا نہیں ہے بلکہ یہ ہمارا پورا وقت اور ہماری پوری توجہ چاہتا ہے۔ اس کے لیے ہم اپنے دوسرے کاموں کو ترک کردیں لیکن دوسرے کسی بھی کام کے لیے اسے نہ چھوڑیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جس کام کو ہم جو اہمیت دیتے ہیں، زندگی میں اسے مقام بھی اسی کی مناسبت سے دیتے ہیں۔ اگر دعوت کا یہ کام ہماری تمام مصروفیات میں مقدم ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس کی اہمیت سے غافل نہیں ہیں۔ لیکن اگر دوسری مصروفیات نے ہمارے اوقات کو اس طرح گھیر رکھا ہے کہ ہم اس کام کے لیے کوئی وقت ہی نہیں نکال

پائے تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہمارے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ خواہ ہم اپنی زبان سے اس کی اہمیت کا دس ہزار بار اقرار کیوں نہ کریں۔ یہ کام اسی وقت انجام پاسکتا ہے جب کہ ہمیں اس سے محبت اور دلی لگاؤ ہو۔ اس میں جو وقت صرف ہوا اسے ضائع نہ سمجھیں بلکہ اپنی زندگی کا حاصل تصور کریں۔ اس کے بارے میں ہمارا یہ خیال نہ ہو کہ یہ کوئی غیر ضروری بوجھ ہے جو ہمارے اوپر لاد دیا گیا ہے، بلکہ اسے انجام دے کر سکون اور راحت محسوس کریں۔

آپ جانتے ہیں کہ آپ کے پیش نظر وہ کام ہے، جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں ان نیک اور برگزیدہ انسانوں کا انتخاب فرمایا، جنھیں ہم رسول اور پیغمبر کہتے ہیں۔ اللہ کے ان نیک بندوں نے، جن کا اس سے خاص تعلق تھا اور جو اس کے پیارے تھے، جس سے وہ محبت کرتے تھے اور جن سے وہ محبت کرتا تھا، دعوت کے اس کام میں اپنی جانیں کھپا دیں، طعنے سہے، گالیاں سنیں، آسائش و راحت چھوڑی، سخت سے سخت مشکلات برداشت کیں، گھر سے بے گھر ہوئے اور کبھی دار و رسن سے بھی گزر گئے، لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعے اس کام کو جاری رکھا۔ دنیا میں کون اپنے محبوب کی تکلیف کو گوارا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا تو اپنے ان محبوب بندوں کو دعوت ہی سے روک دیتا یا ان کو اس راہ کی تمام صعوبتوں اور تکلیفوں سے محفوظ رکھتا۔ لیکن اس نے یہی چاہا کہ اس کے یہ نیک اور مخلص بندے زندگی بھر دعوت کا کام جاری رکھیں اور ہر طرح کی تکلیفوں اور آزمائشوں سے گزرتے ہوئے اسے جاری رکھیں۔ اللہ کے رسولوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ ان کے مخلص ساتھیوں اور جانشینوں نے بھی دعوت کی یہی پر خطر راہ اختیار کی اور بے مثال قربانیاں دیتے ہوئے اس پر چلتے رہے۔ جب تک ان کے جسم و جان کا رشتہ باقی رہا نہ تو ان کا یہ سفر ختم ہوا اور نہ کبھی وہ اس سے منحرف ہوئے۔

اللہ تعالیٰ کا اپنے رسولوں اور ان کے جانشینوں کے بارے میں یہ فیصلہ بتاتا ہے کہ دعوت کے اس کام کے لیے نوعِ انسانی کے بہت ہی چیدہ اور برگزیدہ افراد بھی

تکلیفیں اٹھا سکتے ہیں، دنیا کی قیمتی سے قیمتی جانیں اس پر نثار ہوسکتی ہیں، لیکن اسے کبھی ترک نہیں کیا جاسکتا۔ سوچیے وہ کتنا اعلیٰ و ارفع مقصد تھا جس کے لیے یہ مقدس اور پاکیزہ زندگیاں اس طرح وقف ہوگئیں جیسے ان کے لیے اس کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔

یہ ہے اس کام کی عظمت۔ اسی کارِ عظیم کو آج آپ انجام دینا چاہتے ہیں۔ اس میں آپ کا وہ سب کچھ لٹ جائے جو آپ کے پاس ہے تو لٹ جانے دیجیے، آپ کی متاعِ حیات اسی میں لگ جائے تو لگ جانے دیجیے۔ یہ خسارے کا سودا نہیں ہے۔ یہ وہ تجارت ہے، جس پر کل آپ فخر کریں گے اور آپ کی سرخ روئی اور کامیابی پر بہت سے وہ لوگ بھی رشک کریں گے جو آج آپ کو نادان سمجھتے ہیں اور جن کے نزدیک موجودہ حالات میں دعوتِ دین کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں ہے۔

دعوت کا میدان وسیع ہے

دعوت کے اس کام کو کوئی محدود کام نہ سمجھئے بلکہ یہ بہت وسیع کام ہے۔ اتنا وسیع کہ جب تک آپ میں قوتِ کار موجود ہے اور آپ کی مہلتِ حیات باقی ہے، آپ کام کے نہ ہونے کی شکایت نہیں کرسکتے۔ دنیا کا ہر نظریہ اپنے ماننے والوں کے لیے عمل کے بہت محدود حلقے فراہم کرتا ہے۔ وہ ان کو اس قسم کی ہدایتیں دیتا ہے کہ انھیں مزدوروں میں نفوذ کرنا چاہیے یا سرمایہ داروں میں، عوام کو اپنا مخاطب بنانا چاہیے یا خواص کو، پست اقوام سے اپیل کرنی چاہیے یا اونچی ذات والوں سے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان نظریات کی زندگی بس ان چھوٹے چھوٹے حلقوں سے وابستہ ہے، جن میں وہ اپنی توانائی صرف کرنا چاہتے ہیں۔ اگر یہ حلقے موجود نہ ہوں تو ان کے وجود کے لیے بھی کوئی وجہِ جواز نہ رہ جائے گی۔ چناں چہ آپ دیکھیں گے کہ یہ نظریات جن خاص دائروں میں رہ کر تگ و دو کرتے ہیں اگر وہ دائرے ٹوٹ جائیں تو ان کے ماننے والوں پر اس طرح جمود طاری ہو جاتا ہے جیسے نہ ان میں کوئی جان رہ گئی ہے نہ اتنی بڑی دنیا میں ان کے

لیے کوئی میدانِ کار رہ گیا ہے۔ لیکن اسلام کے ایک ایک داعی کو وہ کام انجام دینا ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔ اس کا کام وقتی اور ہنگامی نہیں ہے، جو ایک وقتِ خاص میں پورا ہوجائے اور وہ اپنے آپ کو اس سے فارغ سمجھ لے۔ بلکہ اس کو جو کچھ کرنا ہے اس کے لیے وہ تمام اوقات بھی ناکافی ہیں جو اس کے اختیار میں ہیں اور جن کو وہ استعمال کرسکتا ہے۔ وہ اسلام کا داعی اور مبلغ ہے۔ اسے ان سب لوگوں تک یہ دعوت پہنچانی ہے جن تک ابھی یہ نہیں پہنچ سکی ہے۔ یہ کام کبھی اس کو چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ اگر ایک گروہ اس کی دعوت کو قبول کرتا ہے تو فوراً ہی دوسرا گروہ اس کے لیے میدانِ کار فراہم کر دیتا ہے۔ جس مبارک عمل کا اس نے آغاز کیا ہے وہ اس کو زندگی بھر کے لیے مصروف رکھنے والا ہے۔ جو شخص اسے سنجیدگی سے انجام دینا چاہے اس کے لیے ہر طرف کام ہے، ہر طبقے میں کام ہے اور ہر وقت کام ہے۔ اتنے بڑے کام کی موجودگی میں وہ کبھی اس بے معنی سوال سے دوچار نہیں ہوسکتا کہ اسے کیا کرنا ہے اور کس میدان میں اپنی قوت صرف کرنی ہے؟

موجودہ دور میں اسلام کے خادموں کو دعوت کا جو وسیع اور ہمہ جہت عمل انجام دینا ہے اسے تین بڑے عنوانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ دعوت و تبلیغ، اصلاح و تربیت اور اسلام کا غلبہ و نفاذ۔ یہاں ہم ان تینوں عنوانوں پر الگ الگ گفتگو کریں گے۔

(۱) دعوت و تبلیغ

اسلام کے ماننے والوں کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ غیر مسلم دنیا کے سامنے اس کو اس طرح پیش کریں کہ وہ اس کی صحیح ترین تصویر دیکھ لیں اور ہر پہلو سے اسے اتنا واضح کردیں کہ وہ وقت کی ایک جانی پہچانی حقیقت بن جائے، تاکہ کوئی شخص محض اس وجہ سے اسلام سے دور نہ رہنے پائے کہ وہ اس سے بے خبر ہے۔ یہ ایک طویل عمل ہے۔ اس کے لیے وہ سب انسان میدانِ کار فراہم کرتے ہیں جو اسلام کو نہیں جانتے۔ ایسے

انسانوں کی تلاش کسی کم یاب شے کی تلاش نہیں ہے۔ وہ آپ کی نگاہوں کے سامنے ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں، جس وقت آپ اسلام کی دعوت لے کر اپنے گھر سے نکلیں گے، آپ محسوس کریں گے کہ مشرق و مغرب، شمال و جنوب ہر طرف آپ کا انتظار ہو رہا ہے اور ایسے انسان قطار در قطار آپ کے روبرو آرہے ہیں جن تک آپ اسلام پہنچانا چاہتے ہیں۔ سوچیئے! اتنا بڑا کام کسی اور نظریے کے علم بردار کے پاس بھی ہے؟

دعوت کے اس کام میں آپ کو وقت کے جدید ترین نظریات کا بھی مقابلہ کرنا ہوگا اور قدیم خیالات کا بھی، رسم و رواج کے پرستاروں سے بھی لڑنا ہوگا اور باغیانہ رجحان رکھنے والوں سے بھی، تقلیدِ جامد کا بھی سامنا کرنا ہوگا اور آزاد خیالی اور بے راہ روی کا بھی۔ اس دنیا میں ہر شخص کسی نہ کسی نظریے اور عقیدے کے سہارے جی رہا ہے۔ آپ کو یہ ثابت کرنا ہوگا کہ یہ تمام سہارے کم زور ہیں اور فلاح و نجات صرف اللہ تعالیٰ کے دین میں ہے۔ اس کام کے لیے آپ کو اسلام کے ساتھ اس کے مخالف افکار کو بھی اچھی طرح سمجھنا ہوگا اور پھر وہ تعبیر ڈھونڈنی ہوگی، جس کے ذریعے آپ اسلام کی برتری ثابت کرسکیں۔ یہ اتنا بڑا کام ہے کہ الفاظ میں اس کی عظمت شاید نہ بیان ہوسکے۔ دنیا کے ہر کام کے بارے میں انسان سوچ سکتا ہے کہ وہ اس سے جلد فارغ ہوجائے گا، لیکن اس میدان میں بڑی سے بڑی کام یابی کے بعد بھی انسان کو یہی نظر آتا ہے کہ اس نے جو کچھ پایا ہے وہ اس کے مقابلے میں بہت کم ہے جو ابھی اسے حاصل نہیں ہوسکا ہے۔ اگر کسی باصلاحیت انسان کو طویل ترین زندگی ملے اور وہ اپنی آخری سانس تک اسے انجام دیتا رہے تب بھی حقیقت یہ ہے کہ وہ اسے ختم نہیں کرسکتا۔

جب آپ دعوت و تبلیغ کی یہ خدمت انجام دیں گے تو آپ کے سامنے ایک اور میدان آئے گا، یہ میدان وہ خوش قسمت انسان فراہم کریں گے جو آپ کی دعوت سے متاثر ہوں گے اور پھر اسلام کو حق سمجھ کر قبول کریں گے۔ جس ماحول پر باطل چھایا ہوا ہو اس میں حق کو قبول کرنا بازیچۂ اطفال نہیں ہے۔ یہ اپنے آپ کو آزمائش کے لیے

پیش کرنا ہے۔ اس لیے جو لوگ اس دشوار راہ میں قدم اٹھائیں، اسلام کے داعیوں کو چاہیے کہ وہ ان کی مشکلات کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ جب اللہ کے بندے اس کے دین کی خاطر اپنے محبوب نظریات کو ترک کردیں، اپنی اس تہذیب اور معاشرت سے دست بردار ہوجائیں جس کی گود میں ان کی پرورش ہوئی تھی، اپنے ماضی کے اس ورثے کو ٹھکرا دیں جس پر وہ فخر کرتے تھے، اپنے ان دوستوں اور عزیزوں سے کٹ جائیں، جن کے بغیر زندگی کا تصور انھیں دشوار تھا اور اپنے اس ماحول کو چھوڑ دیں، جس کے ذرّے ذرّے سے انھیں محبت تھی تو یہ اسلام کے خادموں کے لیے بھی امتحان کا وقت ہوگا۔ اللہ تعالیٰ یہ دیکھے گا کہ وہ کون لوگ ہیں جو اس کے ان مخلص بندوں کو اپنے سینوں سے لگاتے ہیں اور وہ کون ہیں جو اسلام سے محبت کے دعوے کے باوجود ان سے کنارہ کش رہ جاتے ہیں۔ انسان جس معاشرے میں نشو ونما پاتا ہے اس میں اس کے بہت سے مسائل خود بہ خود حل ہوتے رہتے ہیں اور بہت سے مسائل تھوڑی سی توجہ سے حل ہوجاتے ہیں، لیکن جوں ہی وہ اس معاشرے کو چھوڑتا ہے یہ دیکھ کر سہم جاتا ہے کہ اب اس کے لیے اپنے مسائل کا حل کرنا آسان نہیں رہا۔ اسلام کا قبول کرنا جس شخص کو ان نازک حالات میں ڈال دے وہ آپ کے بہترین تعاون کا حق دار ہے۔ اللہ تعالیٰ کے دین سے آپ کے تعلق اور محبت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اسے بے یار و مددگار نہ چھوڑیں اور اس میں اجنبیت کا احساس نہ پیدا ہونے دیں۔ اللہ کے دین کے لیے اگر اس نے اپنا سب کچھ لٹا دیا ہے تو آپ اپنا سب کچھ نہ سہی ایک حصہ تو بہ خوشی اس کو پیش کردیں۔ وہ اگر اپنے مسائل سے گھبرا رہا ہے تو اس سے اس کے مسائل لے لیں اور اپنے مسائل کی فہرست میں انھیں شامل کرلیں۔ جو شخص اپنی سوسائٹی سے نکل چکا ہے اس کو کسی دوسری سوسائٹی میں فٹ کرنا بڑا طویل اور محنت طلب عمل ہے۔ اتنے بڑے کام کے ہوتے ہوئے اسلام کا داعی یہ کیسے سوچ سکتا ہے کہ اس کا کام محدود یا آسان ہے؟

(۲) اصلاح و تربیت

دین کے خادموں کی دوسری اہم ذمہ داری یہ ہے کہ جس اُمت سے ان کا دینی تعلق اور رشتہ ہے اور جس کے وہ خود بھی افراد ہیں، اس کی اصلاح و تربیت کا فرض انجام دیں۔ اس کی فکری، عملی، دینی، اخلاقی، معاشرتی اور تہذیبی خامیوں کو دور کریں۔ اس کام کے مختلف پہلو ہیں۔ ان میں ایک اہم پہلو یہ ہے کہ اس امت پر دعوتِ دین کی جو ذمے داری عائد ہوتی ہے اس کا شعور اس کے اندر پیدا کیا جائے۔ اور یہ ذمے داری جن اوصاف کا تقاضا کرتی ہے اس کے اندر وہ اوصاف پیدا کرنے کی کوشش کی جائے اور عملاً اس ذمہ داری کے ادا کرنے لیے اسے تیار کیا جائے۔

یہاں ہمارے سامنے اس کا صرف ایک خاص پہلو ہے۔ وہ یہ کہ غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ اپنی کامیابی کے لیے پہلے مسلمانوں کی اصلاح چاہتی ہے۔ کیوں کہ اسلام کو اس کے ماننے والوں سے الگ کرکے دکھانا آسان نہیں ہے۔ مسلمانوں کی زندگی میں اگر اسلام کا عکس نظر آنے لگے تو دعوت و تبلیغ کی بہت سی وہ راہیں کھل سکتی ہیں جن کو آج آپ بالکل بند پا رہے ہیں اور جو لوگ اللہ کے دین کی خوبیوں سے بے خبر ہیں وہ اپنی آنکھوں سے ان خوبیوں کو دیکھ کر اس کے گرویدہ ہوسکتے ہیں۔ آج اگر وہ اس سے منحرف ہیں تو کل اس کے وفادار اور سچے خادم بن کر ابھر سکتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام اللہ تعالیٰ کے دین کی حیثیت سے نازل ہوا ہے اور اسی حیثیت سے وہ قیامت تک باقی رہے گا۔ انسانوں کا کوئی گروہ اسے اختیار کرے یا رد کردے، اس پر عمل کرے یا اسے چھوڑ دے، اس کی یہ حیثیت کبھی بدل نہیں سکتی۔ اس لیے جو شخص اسلام کو سمجھنا چاہے اس کو اسی حیثیت سے اس پر غور کرنا چاہیے۔ لیکن بالعموم لوگ اسلام کو اللہ کے دین کی حیثیت سے نہیں دیکھتے بلکہ اس حیثیت سے دیکھتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کا مذہب ہے۔ مسلمان چوں کہ اسلام کے برحق ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اس لیے وہ ان کی

زندگی سے اس کی تصدیق چاہتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو اسلام کا نمائندہ سمجھتے ہیں اور ان کے ایک ایک عمل کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں کہ وہ اس کے احکام کی پیروی کرنے والوں کا عمل ہے۔ ان کے نزدیک اسلام کی مستند تعبیر وہ نہیں ہے جو قرآن و حدیث میں موجود ہے بلکہ وہ تعبیر مستند ہے جسے اسلام کے ماننے والے اپنے عمل سے پیش کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ اندازِ فکر غلط ہے، لیکن آپ اس پر ان کو بہت زیادہ ملامت نہیں کرسکتے۔ کیوں کہ کسی نظریہ کے حسن و قبح پر خالص عقلی انداز میں سوچنے والے کم ہوتے ہیں، زیادہ تر لوگ ان افراد کو دیکھتے ہیں جن کی طرف وہ نظریہ منسوب ہوتا ہے خواہ ان کے اعمال اس نظریے سے ہم آہنگ ہوں یا اس سے متصادم ہوں۔ کسی بھی نظریہ کے ماننے والوں سے بعض اوقات ایسی حرکات سرزد ہوسکتی ہیں، جن کا اس نظریہ سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس کے بہت سے عوامل ہوسکتے ہیں۔ لیکن آپ کو ماننا پڑے گا کہ یہ دنیا سطحی انسانوں سے بھری ہوئی ہے۔ وہ ان عوامل کو نہیں تلاش کرتی جو ان کے اعمال کے پیچھے کارفرما ہوتے ہیں بلکہ ان کی خوبیوں اور خامیوں کا اس طرح چرچا کرتی ہے جیسے وہ اسی نظریہ سے وجود میں آئے ہوں، جس پر وہ ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں۔

ایک طرف یہ واقعہ ہے کہ مسلمان جو بھی رویہ اختیار کرتے ہیں وہ دنیا والوں کے نزدیک اسلام کا رویہ بن جاتا ہے اور دوسری طرف مسلمانوں کی اکثریت کا یہ حال ہے کہ وہ اسلام سے بہت دور ہوچکی ہے۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اس کو صحیح معنی میں اسلام سے واقفیت بھی نہیں ہے۔ وہ یہ نہیں جانتی کہ اللہ تعالیٰ کو ماننے کا کیا مطلب ہے اور اس کے کیا تقاضے ہیں؟ شرک کسے کہتے ہیں اور توحید کیا ہے؟ کفر کس چیز کا نام ہے اور ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ اللہ کی اطاعت کے حدود کیا ہیں اور اس کی بغاوت کہاں سے شروع ہوتی ہے؟ رسول کی اطاعت کیوں واجب ہے اور اس کی نافرمانی سے بچنا کیوں ضروری ہے؟ ان کو اللہ واحد کی عبادت کرنی تھی لیکن انھوں نے فریضۂ عبادت کو بوجھ سمجھ کر اتار پھینکا ہے، ان کو ہر جہالت سے پاک رہنے کی تلقین کی گئی تھی لیکن وہ

بے شمار غلط رسوم اور مہمل روایات کے خود سے پابند ہوگئے ہیں، ان کو حق کے اتباع کی تعلیم دی گئی تھی لیکن وہ باطل کے پیچھے چل رہے ہیں، ان کو ہر معاملے میں محمد ﷺ کی اطاعت کرنی تھی لیکن انھوں نے نہ صرف یہ کہ دوسروں کی اطاعت شروع کردی ہے بلکہ اس اطاعت پر فخر کرنے لگے ہیں۔ ان کے معاملات میں حلال وحرام کی تمیز اٹھ گئی ہے، ان کی معاشرت میں بگاڑ آ گیا ہے، ان کی تہذیب میں غیر اسلامی عناصر داخل ہوگئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ آج مسلمانوں میں ایسے افراد بھی کم نہیں ہیں جو صریح اعمالِ شرک میں مبتلا ہیں اور ان کو توحید کے خلاف بالکل نہیں سمجھتے۔ قدم قدم پر ان کی زندگی میں اللہ سے بغاوت موجود ہے اور ان کو اس کا احساس تک نہیں ہے کہ یہ ان کے دین و ایمان کے منافی ہے۔ ان کو جو محبت اللہ اور اس کے رسولؐ سے ہونی چاہیے تھی وہ ان کے دشمنوں سے ہے اور ان کی جو قوتیں دین کی راہ میں صرف ہونی تھیں وہ کفر کے فروغ میں صرف ہو رہی ہیں۔ مسلمانوں کو اس حالت میں چھوڑ کر غیر مسلموں میں اسلام کی دعوت سے کسی کامیاب نتیجے کی توقع صحیح نہ ہوگی۔ غیر مسلموں میں اسی وقت اسلام کا صحیح تعارف ہوگا اور اس کی دعوت برگ و بار لائے گی، جب کہ مسلمانوں کے اندر کم از کم ایک ایسا ممتاز گروہ وجود میں آجائے جو اپنے قول وعمل سے اسلام کا ترجمان ہوجائے۔ جو ہر معاملے میں اللہ کا فرماں بردار اور اِطاعت گزار ہو، جس کا اخلاق اسلامی اخلاق ہو، جس کے معاملات اللہ کے احکام کے تابع ہوں، جس کی معاشرت پر اسلام کی حکومت ہو اور جو اپنے ہر عمل سے یہ ثابت کر رہا ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی خوشی کا طالب ہے اور سوائے اس کے کسی اور کو خوش کرنا نہیں چاہتا۔

جب اس طرح کا کوئی گروہ موجود ہوگا تو دنیا دیکھ سکے گی کہ اسلام کس قسم کے انسان تیار کرتا ہے اور ان کو کیسی سیرت اور کیسا کردار عطا کرتا ہے، جب تک اس قسم کا کوئی گروہ نہیں پایا جائے گا، دنیا عام مسلمانوں ہی کو دیکھے گی اور عام مسلمانوں کی موجودہ روش، یقین مانیے اسلام کے فروغ کی راہ میں ایک رکاوٹ بنی رہے گی۔ آپ پوچھیں

گے کہ مسلمانوں کے اندر سے ایسے کسی گروہ کا نکل آنا کیا اس کو اتنا اونچا مقام عطا کردے گا کہ دنیا اس کو اسلام کا ترجمان سمجھنے لگے؟ کیا اس گروہ میں اتنی طاقت ہوگی کہ دنیا اسلام کو سمجھنے کے لیے صرف اس کی روش کو دیکھے اور مسلمانوں کی اکثریت سے اس لیے صرفِ نظر کرلے کہ اس کا طرزِ عمل اسلام سے ہٹا ہوا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک ایسا ہی ہوگا اور اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔ جب کوئی گروہ اسلام کی تعلیمات کے مطابق عمل کرنے والا دنیا کے سامنے موجود ہوگا تو اس کے لیے یہ فیصلہ کرنا آسان ہوگا کہ کون اسلام کا نمائندہ ہے اور کون اس سے منحرف ہو چکا ہے۔ اس سے آگے یہ بات بھی تعجب خیز نہ ہوگی کہ جو گروہ اسلام کی تعلیمات کے مطابق عمل بھی کرے اور اس کی طرف دعوت بھی دے، دنیا اسلام کے معاملے میں اس کے سوا کسی دوسرے گروہ کو اسلام کا ترجمان اور اس کا نمونہ ماننے سے انکار کردے۔ کیوں کہ کسی نظریہ کا داعی اپنے آپ کو اس کا نمائندہ بنا کر پیش کرتا ہے۔ اس کو چھوڑ کر وہ ایسے اشخاص اور جماعتوں کو اس نظریہ کا شارح نہیں مان سکتی جو خود اس کی قدر و قیمت نہ جانتے ہوں۔ اگر اسلام کے سچے خادم وجود میں آجائیں تو دنیا ان تمام افراد اور جماعتوں کو خود بہ خود اسلام کی ترجمانی کے حق سے محروم کردے گی، جن کے پاس صرف اسلام کا نام ہوگا اور جو اسلام کی اتباع سے دامن کش ہوں گے۔

مسلمانوں کے کسی گروہ کو اسلام کی نمائندگی کے لیے تیار کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عام مسلمانوں کی اصلاح آپ کے دائرۂ کار سے خارج ہے، بلکہ یہ وہ قریب ترین ہدف ہے جو آپ فی الحال حاصل کرسکتے ہیں اور جس کے بغیر اسلام کا پھیلنا دشوار ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ آپ کو تمام ہی مسلمانوں کی اصلاح کرنی ہے۔ ان کو ایک ایسی امت کی حیثیت سے ابھارنا ہے جو اسلام کی زندہ تفسیر بن جائے اور جو دنیا کے سامنے اللہ کے دین کے حق ہونے کی شہادت دے سکے۔ اسلام کی دعوت اس امت کے کسی ایک گروہ کا کام نہیں ہے، بلکہ یہ پوری امت کی ذمے داری ہے اور جب تک

پوری امت اپنی اس ذمے داری کو محسوس نہ کرے اس کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔

اگر یہ امت اس فیصلہ کے ساتھ اٹھ کھڑی ہو کہ اسلام کو اللہ کے بندوں تک پہنچانا ہے تو کیا عجب کہ اللہ کے بندے بھی اس کے استقبال کے لیے ٹوٹ پڑیں۔ اسلام پھیلنے کے لیے آیا ہے۔ یہ انسان کی فطرت سے اس قدر مطابقت رکھتا ہے کہ اس کی مخالفت کے لیے انسان کو اپنی فطرت سے شدید جنگ کرنی پڑتی ہے۔ اسلام سے زیادہ فطرت سے ہم آہنگ دنیا کا کوئی نظریہ نہیں ہے۔ اس لیے ہر نظریہ کے مقابلے میں اسلام کے پھیلنے کے امکانات زیادہ ہیں۔ چناں چہ جب اسے پھیلایا گیا تو وہ سیلاب کی طرح پھیلا اور پورے پورے ملک اور بڑی بڑی آبادیاں اس کے سائے میں آگئیں لیکن یہ اس وقت ہوا جب اس کے خادموں نے اس کی اشاعت کو اپنی ہر مصروفیت پر مقدم رکھا اور اس کے لیے اس طرح کام کیا جیسے وہ اسی کے لیے پیدا ہوئے ہیں اور انھیں کسی اور کام سے کوئی غرض نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ یہاں کوئی بھی نظریہ معجزاتی طور پر نہیں پھیلتا بلکہ اس کے لیے اس کے کارکنوں کو سخت محنت کرنی پڑتی ہے۔ اگر یہ محنت انسانوں کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچانے اور اس کے دین کا تابع بنانے کے لیے کی جائے تو یہ دل کش منظر بھی ہماری نگاہیں دیکھ سکتی ہیں کہ ایک طرف لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچانے کے لیے امت بے چین ہے اور دوسری طرف اس عذاب سے بچنے کے لیے اس کے مخاطبین بے قرار ہیں۔

(۳) اسلام کا غلبہ و نفاذ

اسلام کی دعوت کا تیسرا رُخ یہ ہے کہ اسلام کو غالب کرنے کی سعی و جہد کی جائے۔ جب تک اسلام غالب نہ ہو آپ اس پر پوری طرح عمل ہی نہیں کرسکتے۔ اسلام کوئی خیالی فلسفہ نہیں ہے، جس کا ہماری ذات اور ہمارے مسائل سے کوئی تعلق نہ ہو بلکہ وہ ایک خاص انداز سے ہماری شخصیت کی تعمیر کرتا ہے۔ وہ کچھ بے جان عقائد نہیں فراہم

کرتا بلکہ ایسا فکر دیتا ہے جس سے مخصوص طرزِ عمل وجود میں آتا ہے۔ اسلام کو ماننے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کا دین ماننے کے بعد انسان اپنی تمام زندگی میں اس سے بے نیاز ہوجائے اور اپنے لیے جو رویہ چاہے پسند کرے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر صرف اللہ واحد کی غلامی کے جذبات ہوں، وہ اسی کو اپنا معبود سمجھے اور اپنے احساساتِ عبودیت کو اسی کے لیے مخصوص کردے، اسی کو اپنا حاکم برحق مانے اور زندگی کے ہر معاملے میں اس کے حکم کے سامنے اس طرح جھک جائے کہ اس کے اخلاق و عادات ہی نہیں بلکہ اس کا علم وفن اس کی تہذیب و معاشرت اور اس کی حکومت و سیاست غرض اس کی ہر چیز اللہ کی مرضی کی پابند ہوجائے۔ اس کے لیے اگر کوئی مختصر تعبیر تلاش کی جائے تو شاید وہ تعبیر یہ ہوگی کہ انسان اپنے آپ کو پوری طرح اللہ کے حوالے کردے اور اس کی مرضی کے مقابلے میں اپنے اختیار سے بالکلیہ دست بردار ہوجائے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کی ہمہ جہت اطاعت کے لیے ضروری ہے کہ ہر طرف اس کا دین غالب رہے اور ہر شعبۂ حیات میں اسی کی حکومت اور فرماں روائی ہو۔ اسلام اگر غالب نہیں ہے تو یقینی بات ہے کہ فکر وعمل کے میدان پر غیر اسلامی قوتیں حکومت کریں گی۔ ایسی حالت میں آپ اللہ سے اپنا قلبی تعلق ضرور رکھ سکتے ہیں لیکن اس کے بتائے ہوئے دین پر ٹھیک ٹھیک عمل ہرگز نہیں کرسکتے۔ اللہ کا دین اگر مغلوب اور اس کی مخالف قوتیں غالب ہوں تو بے شک آپ اس کا ذکر کرسکیں گے، اس سے لو لگا سکیں گے، اس کی تسبیح وتہلیل کرسکیں گے، لیکن خارج کی زندگی میں اس کے دین پر عمل کرنا اسی حد تک آپ کے لیے ممکن ہوگا، جس حد تک یہ مخالف قوتیں عمل کی آپ کو اجازت دیں گی۔ اس اجازت پر خوش ہونے یا اسے حاصل کرنے سے پہلے اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ یہ اجازت ہمیشہ بہت محدود ہوتی ہے اور اسی حد تک ہوتی ہے، جس حد تک ان قوتوں کو اپنی سیادت برقرار رکھنے میں کوئی زحمت نہ ہو۔ جہاں وہ اپنی راہ میں رکاوٹ محسوس کریں گی، یہ محدود آزادی بھی آپ سے چھین لیں گی۔ یہ مختصر سی آزادی وہ اس لیے نہیں عطا

کرتیں کہ انھیں آپ سے یا آپ کے دین سے ہم دردی ہے، بلکہ اس لیے دیتی ہیں کہ زندگی کے مختلف محاذوں پر اسلام کو پابہ زنجیر کرنے کے بعد ایک محدود گوشے میں اس کی آزادی کو وہ اپنے لیے ضرر رساں نہیں سمجھتیں۔ اس گوشے سے باہر وہ اپنی تہذیب، اپنا اخلاق، اپنے اصولِ سیاست، اپنا طریقۂ تجارت، اپنا ضابطۂ صنعت اور اپنے بین الاقوامی قوانین آپ پر مسلط کریں گی اور بعض اوقات آپ کو یہ کہنے کا بھی حق نہ ہوگا کہ ان کا فلاں اقدام اسلام کے صریح خلاف ہے۔ یہ ایسا اصول ہے جس پر ہر بااقتدار قوت عمل کرتی ہے اور اسی کے بل پر اس کو زندگی نصیب ہوتی ہے۔ لیکن اس اصول کو کوئی ایسا شخص گوارا نہیں کرسکتا جسے اللہ کے دین سے محبت ہو۔ اگر اسلام کو قید کر دیا گیا ہے تو وہ اس گرفتاری پر مطمئن نہیں ہوگا، بلکہ ہر قیمت پر آزاد کرانے کی اور ضرورت پڑنے پر اپنا سر دے کر آزاد کرانے کی کوشش کرے گا۔ اسلام پر عمل کے اسے مواقع حاصل نہیں ہیں تو ان مواقع کو پانے کے لیے اس کے اندر ویسی ہی بے چینی پائی جائے گی جیسی بے چینی مچھلی خشکی پر محسوس کرتی ہے۔ یہ بے چینی بالکل فطری ہے۔ اس بے چینی کا نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام نے ابھی دل میں جگہ نہیں پائی ہے۔

اسلام آپ کی پوری زندگی کو اپنی گرفت میں لینا چاہتا ہے اور غیر اسلامی طاقتیں صرف چند معاملات میں آپ کو اس کی اتباع کی اجازت دیتی ہیں۔ اگر اس اجازت کو آپ کافی سمجھتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ اپنے اوپر اسلام کی کامل فرماں روائی نہیں چاہتے۔ حالاں کہ جس شخص میں اسلام کی اتباع کا جذبہ ہو وہ اس صورتِ حال پر تڑپ اٹھے گا۔ اگر انسان میں یہ تڑپ نہ پائی جائے تو وہ ایک ایسی بے حسی میں گرفتار ہے، جس سے اس کی دینی موت واقع ہوسکتی ہے۔ اسلام کے کسی چاہنے والے کی بہترین تمنا اور سب سے بڑی کوشش یہ ہوگی کہ اس پر اسلام کا قانون چلے، اس کی تہذیب اسلامی تہذیب ہو، اس کی معاشرت سے غیر اسلامی عناصر نکل جائیں، اس کا لین دین اسلام کے تحت ہو، اس کی حکومت و سیاست پر اسلام کی فرماں

روائی ہو۔ اس تمنا کے پورے ہونے اور اس سعی و جہد کے نتیجہ خیز ہونے کی صورت صرف یہ ہے کہ اسلام کی دعوت دی جائے اور پوری یک سوئی کے ساتھ اس کے لیے جدوجہد کی جائے۔ اس کے بغیر اسلام کو سربلندی حاصل نہیں ہوسکتی۔ اسلام کو فرماں روائی کا مقام صرف اسی وقت حاصل ہوگا جب کہ دنیا اس کی طرف متوجہ ہو اور اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جائے۔ اگر دنیا نے ابھی اس کی طرف توجہ ہی نہیں کی ہے تو اس کی فرماں روائی اور اس کی حکومت کے قیام کا بھی کوئی سوال نہیں۔

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی صاحبِ ایمان جو اللہ کی اس زمین پر اس کی فرماں روائی کا آرزو مند ہو، اقتدار پالے تو اس کے حدودِ اقتدار میں اسلام غالب ہوجائے گا۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے، کیوں کہ اسلام کے غالب ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی مسلمان تختِ حکومت پر پہنچ جائے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شعبۂ حیات میں اسلام کا قانون نافذ ہو اور اس کو ملک کے اندر بالاتر حیثیت حاصل ہو جائے اور اس کے فیصلے کے بعد ہر فیصلہ کالعدم قرار پائے۔ اسلام کو یہ حیثیت محض کسی مسلمان کے اقتدار پانے یا کسی شہنشاہِ وقت کے اسلام قبول کرنے سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ یہ اسی وقت حاصل ہوگی جب کہ کوئی معاشرہ پوری طرح اسلام کو یہ حیثیت دینے کے لیے تیار ہوجائے یا کم از کم معاشرہ میں ایک ایسا طاقت ور گروہ پایا جائے جس میں اسلام کو نافذ کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ یہ ایسا کام نہیں ہے کہ کوئی فردِ واحد، خواہ وہ دنیا کا کتنا ہی بڑا انسان کیوں نہ ہو، خود سے کرگزرے۔ اس کے لیے تو دعوت کی اور عام حالات میں مسلسل دعوت کی شدید ضرورت ہے۔ دعوت ہی سے اسلام کو غالب کرنے کا عزم ابھرے گا اور وہ ذہن پیدا ہوگا جو سوائے اسلام کے ہر دستورِ حیات اور ہر نظامِ قانون کو رد کر دیتا ہے۔

یہ بات تسلیم کی جاسکتی ہے اور کی جانی چاہیے کہ کسی بڑی شخصیت کا اسلام قبول کرنا یا اس کا اسلام کا علم بردار بن کر کھڑا ہونا اسلام کی دعوت پھیلنے میں معاون اور

مددگار ہوتا ہے اور بعض اوقات اس کی وجہ سے دین کا غلبہ آسان ہوجاتا ہے۔ لیکن فی نفسہٖ کسی کا اسلام قبول کرنا یا اس کی حمایت میں کھڑا ہوجانا اسلام کے غالب ہونے کے لیے کافی نہیں ہے۔ اس کے لیے تو اس کو اور اس کے ہم خیال لوگوں کو دعوتی جدوجہد لازماً کرنی پڑے گی تا آں کہ ایک ایسا گروہ تیار ہوجائے جو اسلام کے نفاذ کی راہ میں اس کا دست و بازو بن جائے اور جس کے ذریعے انسانوں کے درمیان اللہ کے دین کو جاری کیا جاسکے۔

دعوت کے غلبہ کے سلسلے میں موافق اور مخالف حالات کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ یہاں دو باتیں پیشِ نظر رہنی چاہئیں۔ ایک یہ کہ دعوتِ حق کے لیے ناموافق حالات خود بخود موافق حالات میں تبدیل نہیں ہوجائیں گے، بلکہ اس کے لیے لگاتار جدوجہد کرنی پڑے گی۔ دوسرے یہ کہ حالات کا سازگار ہونا از خود کسی نظریہ کو غلبہ عطا نہیں کرتا بلکہ وہ غالب اس وقت ہوتا ہے جب کہ ان حالات سے فائدہ اٹھایا جائے اور اسے غالب کرنے کی کوشش کی جائے۔ اسلام کے لیے بھی اس طرح کے حالات کا میسر آنا ناممکن نہیں ہے، لیکن ان حالات کی وجہ سے وہ خود بخود تختِ سلطنت پر نہیں پہنچ جائے گا، بلکہ اس کے لیے ان افراد کی ضرورت ہے جو ان حالات کو نظر میں رکھیں اور ان کو اسلام کے غلبے کی طرف موڑیں۔ یہ افراد دعوت سے پیدا ہوتے ہیں۔ دعوت کے بغیر ان افراد کے پیدا ہونے کی کوئی سبیل آج تک دریافت نہیں ہوسکی ہے۔

اسلام کو غالب کرنے کی جدوجہد کے لیے آپ کو خاص سیاسی میدان میں بھی کام کرنا ہوگا۔ دنیا میں بہت سے سیاسی نظریات کام کررہے ہیں۔ ان میں سے ہر سیاسی نظریہ انسان کی کامیابی کا خاص تصور دیتا ہے اور اس کے اجتماعی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی مسائل کا ایک متعین حل پیش کرتا ہے۔ یہ تمام نظریات بے جان ہیں، ان کی کوئی مضبوط اساس نہیں ہے، وہ محض چند مفروضات اور سطحی نعروں کے سہارے جی رہے ہیں، ان کے مقابلے میں اسلام کامیابی کا بہت ہی ارفع تصور پیش کرتا ہے۔ ضروری اور

بے حد ضروری ہوگا کہ ایک طرف آپ ان تمام نظریات پر بھرپور تنقید کریں، یہاں تک کہ ان کی خامیوں کو بالکل عریاں کرکے رکھ دیں۔ دوسری طرف اسلام نے فلاح اور کامیابی کا جو تصور عطا کیا ہے اسے اس طرح پیش کریں کہ ہر معقول انسان اس کی برتری اور عظمت کا معترف ہوجائے۔ یہ اس میدان میں آپ کا نظری کام ہوگا۔ عملی کام یہ ہے کہ جو لوگ آپ کی دعوت اور فکر سے ہم آہنگ ہوتے جائیں ان کو منظّم کریں اور ان کی اس طرح تربیت کریں کہ ان کے اندر وقت کے ان تمام سیاسی نظریات سے شدید نفرت اور اسلام سے شدید محبت پیدا ہوجائے اور وہ اسلام کو غالب کرنے کے لیے اپنا سب کچھ لٹانے سے دریغ نہ کریں۔ اس کے بعد اس گروہ کی مدد سے آپ کو عملاً وہ تمام تدابیر اختیار کرنی ہوں گی جو اسلام کے غلبہ کے لیے ضروری ہیں اور جن کو اختیار کرنے کی اسلام اجازت دیتا ہے۔

جب آپ اس طرح کی کوشش کریں گے تو اسی وقت آپ کو وہ چیز حاصل ہوسکتی ہے، جس کی آپ تمنا کرتے ہیں۔ یعنی یہ کہ باطل مٹ جائے اور اسلام غالب ہو۔ انسان پر سے غیر اللہ کی حکومت ختم ہو اور ہر طرف اللہ کا قانونِ عدل نافذ ہوجائے۔ اس دنیا میں ہمیشہ ہی ایسا نہیں ہوا ہے کہ لوگوں نے اللہ کے دین کو رد کر دیا ہو، بلکہ بارہا قوموں اور ملکوں نے اسے سینے سے لگایا بھی ہے اور ان پر اس کی حکومت بھی رہی ہے، اس کی نمایاں مثال وہ عظیم انقلاب ہے جو محمد ﷺ کی دعوت کے نتیجے میں رونما ہوا۔ جس خدائے برتر نے محمد ﷺ اور آپؐ کے ساتھیوں کی مدد کی وہ آج بھی زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اٹھیے اور اپنا فرض انجام دیجیے کہ اللہ آپ کے ساتھ ہے۔ وہ چاہے تو آسمان و زمین کی ساری قوتیں آپ کی مدد کے لیے کھڑی ہوجائیں اور آپ جس چیز کو بہت دور سمجھتے ہیں وہ اتنی جلد آپ کی نگاہوں کے سامنے آجائے کہ آج آپ شاید اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔

دعوت اور اتباع

دعوت اور اتباع کا تعلق

اسلام کی اتباع اور اس کی دعوت بہ ظاہر دو مختلف کام ہیں۔ ایک کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے ہے اور دوسرے کا اپنی ذات سے باہر خارج کی دنیا سے، لیکن اس کے باوجود ان میں بہت گہرا ربط ہے۔ اس ربط کی وجہ سے ہم ان دونوں کو ایک دوسرے سے بالکل الگ نہیں کر سکتے۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ اسلام کی اتباع پر غور و فکر کرتے وقت اس کی دعوت کو نظر انداز کر دیا جائے، یا اس کی دعوت زیرِ بحث آئے تو اس کے اتباع کو فراموش کر دیا جائے۔ کیوں کہ جس طرح یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام پر آدمی کا عمل اسی وقت مکمل ہوتا ہے جب کہ وہ دنیا کو اس کی دعوت دے، ٹھیک اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب تک اسلام پر اس کا عمل نہ ہو وہ صحیح معنی میں اس کا داعی نہیں بن سکتا۔ جو شخص انسانوں تک اللہ کا دین پہنچانا چاہے ضروری ہے کہ پہلے یہ دین اس کے دل و دماغ میں اتر جائے اور اس کی پوری زندگی پر چھا جائے۔ دین کی حقیقت سے اگر وہ خود بے خبر ہے اور اس کے عمل سے اس کا اظہار نہیں ہو رہا ہے تو دوسروں کو دین سے باخبر کرنا اس کے بس کا کام نہیں ہے۔ جس دین کی وہ دنیا کو دعوت دے رہا ہے اس کا سب سے پہلا مخاطب وہ خود ہے۔ اس لیے جو کام وہ دوسروں کے درمیان کرنا چاہتا ہے، اس کا آغاز اس کو اپنی ذات سے کرنا ہوگا اور دوسروں کو خدا پرست بنانے سے پہلے

اپنے آپ کو خدا پرست بنانا ہوگا۔ اسلام کی دعوت اس کی اتباع کے بغیر ایک مذاق ہے اور جب کوئی دعوت مذاق بن جائے تو اس کی کشش ختم ہوجاتی ہے۔ وہ لوگوں کو اپنی طرف جذب نہیں کرسکتی۔ وہی دعوت دنیا کو اپنا گرویدہ بناتی ہے جس کے علم بردار اپنی شخصیت کو اس میں گم کردیں اور اس کی زندہ تصویر بن جائیں۔

دعوت کی کامیابی کے لیے اتباع ضروری ہے

اسلام کی دعوت کا مطلب محض یہ نہیں ہے کہ انسانوں کے درمیان اس کے حق وصداقت کا اعلان کر دیا جائے، بلکہ یہ اپنے مزاج کے لحاظ سے ایک زبردست انقلابی کوشش ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ وہ انسانوں کے تمام خود ساختہ دینوں پر غالب آجائے اور سب اس کے تابع اور محکوم بن کر رہیں۔ جو شخص خارج کی دنیا میں اسلام کا یہ مطلوب انقلاب برپا کرنا چاہے، پہلے اس کو اپنے اندر کی دنیا میں اسی نوعیت کا انقلاب برپا کرنا ہوگا، ورنہ باہر کی دنیا میں اس کی کوشش کامیاب نہ ہوگی۔ دوسروں پر اللہ تعالیٰ کی حکومت قائم کرنے کے لیے انسان کو اپنی ذات پر اللہ کی حکومت قائم کرنی ہوتی ہے۔ اس کے بغیر وہ قیامت تک دوسروں پر اس کی حکومت قائم نہیں کرسکتا۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑی بات جو ہمیشہ ایک داعی کے پیشِ نظر رہنی چاہیے، یہ ہے کہ وہ اس دعوت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کو خوش کرنا چاہتا ہے اور اللہ کے نزدیک یہ بات سخت ناپسندیدہ ہے کہ آدمی دوسروں کے درمیان تو اس کے دین کی تبلیغ کرے اور خود اس کی زندگی دین کے اثرات سے خالی ہو۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ۝٢ كَبُرَ مَقْتًا عِندَ ٱللَّهِ أَن تَقُولُوا۟ مَا لَا تَفْعَلُونَ ۝٣ (الصف: ۲، ۳)	اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، تم وہ باتیں کیوں کہتے ہو جن پر (خود) عمل نہیں کرتے۔ اللہ کے نزدیک (یہ چیز) سخت ناپسندیدہ ہے کہ تم ایسی باتیں کرو جن پر خود عمل نہیں کرتے ہو۔

قرآن مجید نے اہل کتاب کے خطیبوں اور واعظوں سے کہا:

اَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (البقرۃ: ۴۴)	کیا تم لوگوں کو 'بِرّ' (نیکی) کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو جب کہ تم اللہ کی کتاب پڑھ رہے ہو۔ تو کیا تم سوچتے نہیں ہو؟

ان واعظوں کے وعظ و نصیحت کے لیے قرآن مجید نے 'اَلْبِرُّ' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس میں بڑی وسعت ہے۔ یہ خدا اور بندوں کے ہر طرح کے حقوق کا احاطہ کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ تم اللہ کی عبادت کا، عزیزوں اور قرابت داروں کے حقوق کی ادائی کا، دنیا کے ساتھ حسن سلوک اور اخلاق کا، معاملات میں راست بازی اور دیانت وامانت کا، تعلقات میں نصح و خیر خواہی اور ہم دردی وغم گساری کا سبق دیتے پھرتے ہو لیکن خود تمھارا دامنِ عمل ان خوبیوں سے خالی ہے۔ دین اور اس کے فضائل و مناقب تمھارے وردِ زبان رہتے ہیں، لیکن تمھاری زندگی میں اس کے اثرات دکھائی نہیں دیتے۔ تم اللہ کی کتاب پڑھتے پڑھاتے ہو اور اسی سے تمھارے وعظ و خطاب کی رونق ہے، حالاں کہ اللہ کی کتاب دوسروں کو سنانے ہی کے لیے نہیں اپنی زندگی میں اتارنے کے لیے بھی ہے۔

اس میں نصیحت ہے کہ اہل ایمان کو یہ طریقہ نہیں اختیار کرنا چاہیے کہ وہ دین کے داعی بن کر دنیا کے سامنے آئیں اور خود ان کی زندگی اس سے خالی ہو۔ یہ بات خدا پرستی اور دین داری کے سراسر منافی ہے کہ آدمی دوسروں کے لیے شمعِ ہدایت روشن کرکے خود ظلمتوں میں ڈوب جائے۔

داعی کو سب سے زیادہ متبع دعوت ہونا چاہیے

یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا و آخرت میں انجامِ خیر صرف اس شخص کے لیے ہے جو اسلام کو قبول کرے اور اللہ کے سامنے سر جھکادے۔ جو شخص اسلام کو رد کردے اور اللہ

کی نافرمانی اختیار کرے اسے انجامِ بد سے کوئی چیز بچا نہیں سکتی۔ اسلام کا داعی اِسی حقیقت سے دنیا کو باخبر کرنا چاہتا ہے۔ اگر اس حقیقت پر اس کا ایمان ہے اور اس کا دل اس کے حق ہونے کی گواہی دے رہا ہے تو اسے سب سے زیادہ اسلام کا متبع ہونا چاہیے۔ جب اس کی زبان علی الاعلان اس کا اظہار کرتی ہے کہ زندگی کا بہترین قانون وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے ذریعے نازل کیا ہے اور پھر وہ اپنے عمل سے اس قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے تو خدا اور اس کی مخلوق کے سامنے اپنے یقین کو رسوا کرتا ہے۔

داعی سے اتباع کا سوال ہوگا

اس میں شک نہیں کہ اسلام کی دعوت نیکی کا اتنا بڑا عمل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کے اجر و ثواب کا آسانی سے تصور نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس کے باوجود کوئی بھی شخص محض اس لیے اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے محفوظ نہیں رہے گا کہ وہ دنیا میں دعوت کا کارِ عظیم انجام دے رہا تھا۔ اللہ کے ہاں لازماً اس سے یہ سوال ہوگا کہ جس دین کی تم دنیا کو دعوت دے رہے تھے اس کا کتنا حصہ تمھاری زندگی میں موجود تھا اور کتنا حصہ غائب تھا۔ اگر آج اس کی زندگی اللہ کے دین سے خالی ہو تو کل اللہ کے فرشتے اس کے خلاف فردِ جرم عائد کریں گے کہ یہ ہے تیرے دین کا مبلغ جو اس کے فضائل و مناقب تو خوب بیان کرتا تھا لیکن خود اس پر عمل نہیں کرتا تھا۔ یہ کوئی ہلکا جرم نہیں ہے بلکہ اللہ کے رسول محمد ﷺ کے الفاظ میں اس واعظ کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کاٹ دیے جائیں گے جو دنیا والوں کو تو اللہ کی کتاب پڑھ کر سناتا پھرے اور خود اس کو پسِ پشت ڈال دے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی کامیابی اللہ تعالیٰ کے دین کی اتباع میں پوشیدہ ہے۔ اگر اس نے دین سے بغاوت کی روش اختیار کی تو نہ دنیا میں کامیاب ہوگا اور نہ آخرت میں۔ اللہ کی رحمت اس کے فرماں برداروں کو ملتی ہے اگر اس نے اپنی فرماں برداری کا ثبوت نہ دیا تو سوچیے کہ اس کی رحمت کا کیسے مستحق قرار پائے گا؟

اسلام کے کسی بھی خادم کو یہ حقیقت نہیں بھولنی چاہیے کہ اس کی تمام کوشش کے باوجود اسلام کو اگر اس کے ہم وطن رد کردیں، اس کے محلے والے رد کردیں، اس کے خویش و اقارب رد کردیں، حتیٰ کہ اس کے ماں باپ، بھائی بہن اور بیوی بچے سب رد کردیں اور دنیا کا ایک شخص بھی اسے قبول نہ کرے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں ہرگز اس سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی، کیوں کہ اس کو جو توانائی حاصل تھی اس نے لوگوں کو راہِ راست پر لانے میں صرف کردی۔ اس سے آگے چوں کہ اس کے پاس دلوں کو بدلنے کی طاقت نہیں تھی، اس لیے اگر وہ ان کے دل بدل نہیں سکا تو معذور تھا۔ اس کے برعکس اگر خود اس کی زندگی دین سے خالی ہو تو اس کا کوئی عذر نہیں سنا جائے گا۔ کیوں کہ انسان خلوص کے ساتھ اپنی شخصیت کو اللہ تعالیٰ کی بندگی کی طرف موڑنا چاہے تو یقیناً موڑ سکتا ہے۔ اس راہ میں کوئی ایسی رکاوٹ نہیں ہے، جس کا دور کرنا اس کے لیے ممکن نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی ذات پر پورا پورا اقتدار عطا کیا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر وہ اپنے اوپر اللہ کی حکومت قائم نہ کرے تو معذرت کے تمام دروازے اس کے لیے بند ہوجائیں گے اور وہ کسی دوسرے شخص پر اس کی ذمے داری ڈال کر اس کے نتائج سے بچ نہیں سکتا۔ اسے خود ہی اپنا انجام بھگتنا ہوگا۔ یہ انجام بڑا ہی خوف ناک اور دل دہلا دینے والا ہوگا۔

اتباع سے تعلق باللہ بڑھتا ہے

جو شخص اسلام کی خدمت کرنا چاہے اور وہ واقعی اپنے اس ارادے میں سنجیدہ اور مخلص ہے تو اس کو اللہ تعالیٰ سے وہ تعلق بھی پیدا کرنا ہوگا، جو اس کام کے لیے مطلوب ہے۔ اللہ سے یہ تعلق اسی اسلام کی اتباع سے پیدا ہوتا ہے، جس کی وہ خدمت کرنا چاہتا ہے، اس کے علاوہ اس کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے۔ اللہ کے پیغمبر جن قوموں میں مبعوث ہوئے ہیں وہ ان میں اس کے دین کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے داعی ہوتے ہیں۔ اللہ سے ان کا تعلق ناقابل انقطاع ہوتا ہے، ان کا دل ہر وقت اس کی

یاد سے معمور رہتا ہے، ان کی پوری زندگی اللہ کی عبادت اور اطاعت میں اس طرح بسر ہوتی ہے کہ کوئی گوشۂ عمل اس سے آزاد نہیں ہوتا۔ وہ سراپا عبدیت اور مجسم تسلیم و رضا ہوتے ہیں۔ وہ جس دین کی اپنی قوم کو دعوت دیتے ہیں، اس کامل یکسوئی کے ساتھ اس کی اتباع کرتے ہیں کہ ان کے کسی مخالف کو بھی یہ کہنے کی ہمت نہیں ہوتی کہ ان کا عمل ان کی دعوت کے خلاف ہے۔ وہ اللہ کے ہر حکم پر اس طرح عمل کرتے ہیں کہ زندگی کے سخت ترین مرحلوں میں بھی اس سے ذرہ برابر انحراف نہیں پایا جاتا۔ قرآن نے ان کو خشوع و خضوع، زہد و عبادت، تقویٰ و اسلام اور انابت و رجوع الی اللہ جیسی صفات سے متصف بتایا ہے۔ یہ صفات محض ان کے شخصی کردار کو ظاہر نہیں کرتیں، بلکہ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس قسم کے افراد ہیں جو دعوت دین کا کام کرسکتے ہیں۔

اتباع سے صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے

اسلام کی دعوت کسی بھی دوسرے نظریہ کی دعوت سے زیادہ مشکل ہے۔ کیوں کہ دنیا میں جتنی تحریکیں اور نظریات اٹھتے ہیں وہ انسان کے صرف ظاہر کو بدلنا اور اس کے چند مسائل کو حل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اسلام انسان کے ظاہر و باطن دونوں میں انقلاب لاتا ہے اور اس کی پوری زندگی کے لیے ہر نظریہ اور ہر تحریک سے مختلف ایک نیا فکر اور ایک نیا رخ عطا کرتا ہے۔ اس کی خدمت کے لیے دنیا کے کسی بھی نظریہ کے متبع بلکہ کسی بھی نظریہ کے لیڈر اور راہ نما کے مقابلے میں بڑی ہمت، بڑے صبر و استقلال، قربانی کے بے پناہ جذبے اور بہت زیادہ فہم و بصیرت کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر اس کی خدمت کا حق ادا ہی نہیں ہوسکتا۔ انسان کا اللہ تعالیٰ سے تعلق جتنا قوی ہوگا یہ صفات بھی اس کے اندر اتنی ہی قوت کے ساتھ ابھریں گی اور وہ اللہ کے دین کا بہترین خادم ثابت ہوگا۔ جب اللہ سے انسان کا تعلق اتنا مضبوط ہو کہ اس کے دین کی خاطر وہ کسی بھی تعلق کے ٹوٹنے کی پروا نہ کرے، جب اللہ کی یاد اس کے لیے اتنی پرکشش ہو کہ دنیا

کی کوئی بھی چیز اس کو اللہ سے غافل نہ ہونے دے اور جب اللہ کا خوف اور اس کی محبت اس کے دل و دماغ پر اس طرح چھا جائے کہ کوئی دوسرا خوف اور کوئی دوسری محبت اس پر غالب نہ آسکے تو دنیا کی کوئی بھی طاقت اس کو دین کی راہ سے نہیں ہٹا سکے گی اور وہ اس کی اس سے زیادہ اور اس سے اچھی خدمت کر سکے گا، جتنی کہ اس کی سطح کا کوئی بھی فرد اپنے نظریہ اور تحریک کی کرسکتا ہے۔

اتباع کے بغیر حجت قائم نہیں ہوسکتی

اللہ تعالیٰ کے رسول اس طرح اپنی دعوت پیش کرتے ہیں کہ ان کی مخالفت کے لیے کوئی حجت باقی نہیں رہتی۔ جو شخص کارِ رسالت کے لیے اٹھے اس کے اندر بھی دین کی اتباع کا وہی جذبہ ہونا چاہیے جو اللہ کے رسولوں میں ہوتا ہے۔ عمل کا کھوکھلا پن بات کو بے وزن بنا دیتا ہے۔ اس لیے کوئی بے عمل شخص اللہ کی طرف سے اس کے بندوں پر حجت قائم نہیں کرسکتا۔ دنیا انسان کے الفاظ سے زیادہ اس کے کردار کو دیکھتی ہے۔ اگر اس کا عمل اس کے قول سے ٹکرا رہا ہو تو وہ خود اس کی قبولیت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہوگا۔ اس کی بات کو رد کرنے کے لیے لوگوں کے نزدیک یہ دلیل کافی ہوگی کہ اس کی روش اس کے خلاف ہے۔ جب کوئی شخص اسلام کے داعی کی حیثیت سے سامنے آئے تو دنیا اس کی چھوٹی سے چھوٹی غلطی کو بھی معاف نہیں کرے گی۔ وہ اس کی معمولی سی لغزش کو بھی دعوت کے بگاڑ کا نتیجہ قرار دے گی اور اسے بدنام کرے گی۔ کوئی بھی دعوت اسی وقت لوگوں کے لیے قابلِ قبول ہوتی ہے جب کہ داعی کی زندگی اس کی شرح و تفسیر بن جائے اور جو چیز وہ اس کی زبان سے سن رہے ہیں اسے وہ اس کے عمل میں دیکھ لیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص اسلام کو دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ اس کے حق ہونے کی شہادت دے۔

اگر اس کی زندگی سے اس کی صداقت کی آواز بلند نہ ہو تو محض اس کی تبلیغ سے کسی دوسرے شخص کی زندگی بدل نہیں سکتی۔ اللہ تعالیٰ کے دین کی قدر و قیمت جس نے گھٹائی ہے وہ یہی بے عمل دعوت ہے، لیکن سوچیے ہم میں سے کتنے ہیں، جن کے لیے اسلام محض ایک موضوعِ سخن ہے اور کتنے ہیں جن کی زندگیوں میں وہ فی الواقع اترا ہوا ہے۔ اسلام کا نام لینے والے اس کو بہت رسوا کر چکے۔ کم از کم اس کے داعیوں کو اس سے لازماً بچنا چاہیے۔

دعوت و اصلاح کی ترتیب[1]

دعوت ایک اصلاحی کوشش ہے

اسلام کی دعوت ایک خاص رخ سے انسانوں کی فکری و عملی اصلاح ہے، اس لیے اسے ایک اصلاحی عمل بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس میں بیوی اور بچوں کی اصلاح، خاندان اور قبیلہ کی اصلاح، بستی اور شہر کی اصلاح اور ملک و وطن کی اصلاح ہی نہیں، تمام عالم اور ساری نوع انسانی کی اصلاح شامل ہے۔ ہمیں ان لوگوں کی بھی اصلاح کرنی ہے جو اسلام کو ماننے کے باوجود اس کی تعلیمات سے بے خبر ہیں یا جانتے بوجھتے اس پر عمل کے لیے آمادہ نہیں ہیں اور ان لوگوں کی بھی اصلاح کرنی ہے جو اسلام سے بالکل ناواقف یا مختلف اسباب کی بنا پر اس سے بہت دور ہیں اور اسے قبول کرنا نہیں چاہتے۔ اس وسیع اور ہمہ جہت کام میں ہم میں سے ہر شخص کو اپنا حصہ ادا کرنا ہے۔ لیکن اس میں ایک ترتیب ہونی چاہیے۔ اس سے اس میں حسن و خوبی اور استحکام پیدا ہوگا اور دعوت و اصلاح کا کام فطری رفتار کے ساتھ آگے بڑھے گا۔ ورنہ جس میدان میں آدمی کو پہلے پہنچنا چاہیے وہاں وہ بعد میں پہنچے گا اور جہاں اس کو بعد میں جدوجہد کرنی چاہیے وہاں وہ پہلے ہی قدم پر محنت شروع کردے گا۔ ترتیب کا نہ ہونا ایک عیب ہے جو کسی بھی کام کو بگاڑ دیتا ہے۔ دعوت و اصلاح کی کوشش کو اس عیب سے پاک ہونا چاہیے۔ اس لیے ہم

---

[1] اسلام کی دعوت کے ذیل میں غیر مسلموں میں دعوت و تبلیغ اور مسلمانوں کی اصلاح و تربیت کا بیان دو الگ الگ عنوانات کے تحت ہوا ہے۔ یہاں بحث کی سہولت کی خاطر ان پر ایک ساتھ گفتگو کی جارہی ہے۔ ان کی نوعیت میں جو فرق ہے وہ واضح ہے۔ دونوں ہی داعی کے میدانِ کار ہیں۔

یہاں اس کی ترتیب کے بارے میں کسی قدر تفصیل سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ اس کام میں ترتیب کی کیا اہمیت ہے اور اس سے اس کو کتنا فائدہ پہنچتا ہے؟

بیوی اور بچوں کی اصلاح

دعوت و تبلیغ اور اصلاح و تربیت کا آغاز آپ کو اپنے گھر سے کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کے دین کو اگر آپ آج کل کے بہت سے انسانوں کی طرح فرسودہ اور مہمل چیز نہیں سمجھتے بلکہ اس کو وہی اہمیت دیتے ہیں جو فی الواقع اسے حاصل ہے تو آپ کی بیوی اور آپ کے بچے سب سے زیادہ اس کے مستحق ہیں کہ آپ ان کو دین کی حقیقت سمجھائیں اور دین سے انحراف اور بغاوت کے خوف ناک انجام سے باخبر کریں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو شخص اپنے لیے اللہ تعالیٰ کے دین کی اتباع کو ضروری سمجھے گا وہ لازماً اپنی بیوی اور بچوں کو بھی دین کی راہ پر چلائے گا۔ وہ کبھی اس بات کو پسند نہیں کرسکتا کہ خود تو آخرت کے عذاب سے بچ جائے اور اس کے بیوی بچے اس میں گرفتار ہوجائیں۔

بیوی اور بچوں کی اصلاح اور ان کو دین کی راہ پر لے چلنا آپ کے لیے نفل یا مستحب نہیں، بلکہ فرض ہے۔ چناں چہ اللہ کا حکم ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (التحریم:٦)

اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو (دوزخ کی) آگ سے بچاؤ۔

رسول اکرم ﷺ فرماتے ہیں:

الرجل راعٍ علٰی اهل بیته وهو مسئول عن رعیته[1]

مرد نگراں ہے اپنے گھر والوں پر اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں (قیامت کے دن) پوچھا جائے گا۔

اسلام کی دعوت یا کسی بھی اصلاحی کوشش کے نتیجہ خیز ہونے کے لیے پہلی شرط خلوص اور محبت ہے۔ اگر خلوص اور محبت ہے تو مخاطب اس سے اثر لے گا ورنہ اس پر کوئی

---

[1] صحیح بخاری، کتاب النکاح و دیگر مقامات، صحیح مسلم، کتاب الامارة، باب فضیلة الامام العادل ...الخ

اثر نہیں ہوگا۔ اس پہلو سے آپ دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ہر شخص اپنے بیوی بچوں کی اصلاح کے لیے دوسروں سے زیادہ موزوں ہے۔ اسے اپنی بیوی اور بچوں سے بے حد محبت ہوتی ہے، وہ ان کا سچا خیر خواہ ہوتا ہے، ان کی خدمت کو اپنے لیے فرض سمجھتا ہے، ان کی نگہ داشت اور پرورش کرتا ہے، ان کا دکھ درد اٹھاتا ہے اور ان کے لیے قربانیاں دیتا ہے، اس لیے وہ اس کے خلوص اور محبت کے بارے میں کبھی شک نہیں کر سکتے۔ وہ اس کو اپنا خیر خواہ اور محسن ماننے پر مجبور ہیں۔ اس وجہ سے وہ اگر ان کو دین کی دعوت دے یا ان کی اصلاح کرنا چاہے تو توقع یہی ہے کہ وہ اسے اپنی فلاح کا ذریعہ سمجھیں گے اور کسی بھی دوسرے شخص کی دعوتِ دین اور سعیِ اصلاح کے مقابلے میں زیادہ اثر قبول کریں گے۔

بیوی بچوں کی اصلاح کے لیے ایک خاص حد میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اقتدار بھی دیا ہے۔ اس حدِ خاص کے اندر آپ ان کی تادیب بھی کر سکتے ہیں۔ اس لیے اگر وہ حدودِ شریعت سے باہر نکل رہے ہوں تو پہلے آپ نرمی اور افہام و تفہیم کے ذریعے ان کی اصلاح کی کوشش کریں لیکن اگر اس سے ان کی اصلاح نہ ہو سکے تو آپ کو چاہیے کہ ان کے ساتھ سختی کا رویہ اختیار کریں اور یہ واضح کردیں کہ دین سے انحراف یا اس کی خلاف ورزی آپ کے لیے ناقابل برداشت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی بیوی اور بچوں پر جو اقتدار عطا کیا ہے اس کی وجہ سے آپ بہت بڑی آزمائش میں پڑ گئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کی بیوی اور بچے اللہ کے دین سے منحرف ہیں تو آپ نہ خاموش رہ سکتے ہیں اور نہ محض نصیحت کر کے مطمئن ہو سکتے ہیں کہ ذمے داری ادا ہوگئی، بلکہ ان کے اس انحراف کو روکنے کے لیے آپ کو اس حد تک طاقت بھی استعمال کرنی ہوگی، جس حد تک طاقت کے استعمال کی آپ کو اجازت دی گئی ہے۔ اگر آپ ان کی غلط روی کو برداشت کرتے رہے اور حدودِ شریعت کے اندر ان کی اصلاح کی کوشش نہیں کی تو آپ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت بڑے مجرم قرار پائیں گے۔

آپ اس عزم کے ساتھ اٹھے ہیں کہ اگر آپ کو اللہ کی زمین میں اقتدار ملے تو یہاں اس کی حکومت قائم کریں گے۔ آپ کو اپنے گھر پر اللہ نے جو اقتدار دیا ہے اس میں آپ کے اس عزم کا امتحان ہے۔ ایک چھوٹے سے دائرے میں آپ کو چند انسانوں پر جو محدود اقتدار ملا ہے اس کے ذریعے آپ ان کو اللہ تعالیٰ کا مطیع وفرماں بردار بنانے میں کامیاب ہوں تو یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ اس سے وسیع اقتدار حاصل ہو تو آپ خدا کی زمین پر خدا کی حکومت قائم کریں گے۔ لیکن اگر آپ اپنے گھر میں بھی اللہ کا قانون نافذ نہیں کرسکے تو پھر کیسے توقع کی جائے کہ آپ کے ذریعے ساری دنیا میں اس کا قانون نافذ ہوگا۔ آپ اس دنیا میں جو کارِ عظیم انجام دینا چاہتے ہیں، اس کی پہلی منزل گھر کی اصلاح ہے۔ اگر یہ پہلی منزل بھی آپ نے مکمل نہیں کی تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی تمام منزلیں آپ کے ہاتھوں مکمل ہوں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ جب آپ کو اس بات کی کوئی فکر نہیں ہے کہ آپ کی بیوی اور بچے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کررہے ہیں یا اس کی نافرمانی تو پھر آپ دنیا کی ہدایت وضلالت سے بھی بے فکر ہی ہوں گے اور صحیح معنی میں آپ کو اس سے دل چسپی نہیں ہوسکتی۔

بعض اوقات دعوتِ دین کی خدمت انجام دینے والے جب اس وسیع انقلاب کے بارے میں سوچتے ہیں جو وہ دنیا میں لانا چاہتے ہیں تو بیوی اور بچوں کی اصلاح کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے۔ وہ اس موضوع سے اس طرح صرفِ نظر کر جاتے ہیں جیسے وہ ان کے غور وفکر اور توجہ اور محنت کا کچھ زیادہ مستحق نہیں ہے۔ حالاں کہ گھر سے باہر انقلاب کے لیے گھر کے اندر انقلاب بہت ضروری ہے۔ اگر آپ کی بیوی اور بچوں کو دین سے محبت ہو اور وہ دین کی راہ میں آنے والی مشکلات میں نہ صرف ثابت قدم رہیں بلکہ آپ کو بھی استقامت کی ترغیب دیں تو یقیناً آپ کا جذبۂ دعوت طاقت ور ہوگا اور آپ یک سوئی اور انہماک کے ساتھ دین کی خدمت کرسکیں گے۔ لیکن اگر خدانخواستہ آپ کا گھر دین دار نہیں ہے تو گھر سے باہر دین کی خدمت آپ کے لیے آسان نہ

ہوگی۔ آپ جانتے ہیں کہ بہت سے لوگ دین کی خدمت محض اس وجہ سے نہیں کرپاتے کہ ان کی بیوی اور ان کے بچے اس راہ میں رکاوٹ ہیں اور ان کو آگے بڑھنے نہیں دیتے۔ کیا اس حقیقت کو جاننے کے بعد بھی آپ گھر کی اصلاح کی اہمیت محسوس نہیں کریں گے اور اس سے غافل ہی رہیں گے؟

خاندان کی اصلاح

بیوی اور بچوں کی اصلاح کے ساتھ آپ کو اپنے ماں باپ، بھائی بہن اور قریب ترین رشتہ داروں کی بھی اصلاح کرنی چاہیے۔ کیوں کہ عام انسانوں کے مقابلہ میں رشتہ داروں کا حق زیادہ ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

وَ اَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ (الشعراء:۲۱۴) اور اپنے قریب کے رشتہ داروں کو ڈراؤ۔

خاندان ہماری معاشرتی زندگی کا اہم ادارہ ہے۔ ہم اس سے اس طرح بندھے ہوئے ہیں کہ آسانی سے الگ نہیں ہوسکتے۔ خاندان ہمارا محتاج ہے اور ہم اس کے محتاج ہیں۔ اس کو ہماری ضرورت ہے اور ہمیں اس کی ضرورت ہے۔ وہ ہمارا تعاون چاہتا ہے اور ہم اس کا تعاون چاہتے ہیں۔ اس پر ہمارے حقوق ہیں اور ہم پر اس کے حقوق ہیں۔ اس لیے اگر آپ کا خاندان دین دار اور خدا پرست ہو تو آپ اس سے اپنے تمام تعلقات دین کی بنیاد پر قائم کرسکتے ہیں۔ ورنہ حدودِ دین کے اندر رہتے ہوئے آپ کو اپنے خاندان سے تعلقات استوار کرنے میں بلکہ نباہنے میں بھی زحمت ہوگی۔ اس کا بھی خدشہ ہے کہ کسی مرحلے میں آپ کے سامنے یہ سوال پیدا ہو کہ خاندان والوں کو راضی کیا جائے یا اللہ تعالیٰ کو خوش کیا جائے اور اللہ کی رضا کے لیے خاندان والوں سے تعلقات توڑنے پر آپ مجبور ہوجائیں۔

خاندان کی اصلاح ایک اور پہلو سے بھی آپ کے لیے مفید ہے۔ وہ یہ کہ خاندان کے افراد میں تعاون اور ہم دردی کا جذبہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ جذبہ تعصب

کی حد تک پہنچ جاتا ہے اور آدمی خاندان کی ہر جائز و ناجائز بات کی حمایت کرنے لگتا ہے۔ بلاشبہ یہ تعصب ہمارے نزدیک غلط ہے لیکن اس سے قطع نظر یہ واقعہ ہے کہ خاندان کے افراد میں تعاون اور ہم دردی کا جتنا قوی جذبہ ہوتا ہے، خاندان سے باہر اتنا قوی جذبہ آپ کم ہی دیکھیں گے، اس لیے اگر آپ کے خاندان کو دین سے محبت ہو تو وہ دین کی راہ میں آپ کا بہترین معاون ہوسکتا ہے۔ دعوتِ دین کی کوشش میں وہ آپ کا شریک ہو تو وہ آپ کا تعاون محض اس لیے نہیں کرے گا کہ آپ اس کے ایک فرد ہیں، بلکہ اس وجہ سے بھی وہ آپ کی حمایت کرے گا کہ وہ اس کے دین و ایمان کا تقاضا ہے۔ اس طرح خاندان کی اصلاح سے آپ کے تعلقات بھی صحیح ہوں گے اور آپ کو دین کے بہترین حمایتی بھی مل سکیں گے۔

خاندان کی اصلاح سے اگر آپ صرفِ نظر کرلیں تو اس کارِعظیم کو نقصان پہنچائیں گے جو آپ کے پیش نظر ہے۔ دنیا بہ غور دیکھ رہی ہے کہ جو دعوت آپ دوسروں کو دے رہے ہیں کیا وہ اپنے گھر اور خاندان والوں کو بھی دیتے ہیں یا نہیں؟ کیوں کہ دنیا یہ سوچ نہیں سکتی کہ اللہ کا دین نجات کا ذریعہ ہے تو آپ دوسروں کو تو اس سے باخبر کریں اور اپنے گھر اور خاندان والوں کو اس سے غافل رہنے دیں۔ پھر دنیا یہ بھی دیکھ رہی ہے کہ آپ جس دین کی دعوت دے رہے ہیں اس کی اتباع آپ خود اور آپ کے گھر اور خاندان والے کہاں تک کر رہے ہیں؟

اگر آپ کا گھر اور خاندان دین سے منحرف ہے اور آپ اس انحراف کو برداشت کر رہے ہیں تو دعوتِ دین کی راہ میں آپ خود سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ جب آپ کے بیوی بچے اور خاندان کے لوگ دین کا مذاق اڑا رہے ہوں، شرک و بدعت میں مبتلا ہوں، محرمات کا ارتکاب کر رہے ہوں، اپنے کاروبار اور معاملات میں حرام و حلال کی تمیز سے بے نیاز ہوں، خوشی اور غم کے مواقع پر اللہ اور اس کے رسولؐ کے بتائے ہوئے آداب کو چھوڑ کر رسومِ جاہلیت کی پیروی کر رہے ہوں اور آپ ان کی اس حالت کو

بدلنے کے بجائے دنیا کو نصیحت کرتے پھریں تو دنیا پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ ہاں اگر آپ خاندان کے اس رویے سے بیزار ہوں اور اپنی حد تک اتمامِ حجت کردیں تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی بری الذمہ ہوں گے اور اس کی مخلوق بھی آپ کو معذور سمجھے گی۔

گھر اور خاندان کی اصلاح بہت نازک کام ہے۔ بعض اوقات خاندانی تعلق جس کی وجہ سے اصلاح کا کام آسان ہونا چاہیے، اس راہ میں ایک حجاب بن جاتا ہے۔ آدمی اپنے کسی عزیز کو غلطی پر دیکھتا ہے تو محض اس وجہ سے کہ وہ اس کا عزیز ہے، نہیں ٹوکتا، وہ غیروں کو تو آسانی سے ان کی خامیاں بتا سکتا ہے، لیکن اپنے عزیزوں کی خامیوں کی نشان دہی کرنے سے بچنا چاہتا ہے۔ خاص طور پر ان رشتہ داروں کی اصلاح میں بڑی مشکل پیش آتی ہے جو عمر میں اس سے بڑے ہوں اور جن کا ادب و لحاظ شرعاً اس کے لیے ضروری ہو۔ داعیِ دین ایک خاص پوزیشن کا مالک ہوتا ہے کیوں کہ وہ انسانوں کا مصلح اور مربی ہے۔ وہ اس مقصد کے لیے اٹھتا ہے کہ بگڑے ہوئے لوگوں کو راہِ راست دکھائے، لیکن اس کی یہی حیثیت بعض اوقات اس کو اپنے بزرگوں کے سامنے آنے سے روکتی ہے۔ اسے حجاب محسوس ہوتا ہے کہ جن لوگوں کی تعظیم و تکریم کو وہ لازم سمجھتا ہے انھیں ان کی خامیوں سے آگاہ کرے۔ اس کی ایک وجہ اور بھی ہے وہ یہ کہ ہماری معاشرت میں بزرگوں کی کسی لغزش پر ٹوکنا جرم ہے۔ کہا جاتا ہے خطائے بزرگاں گرفتن خطا است۔ حالاں کہ ان کے ساتھ خیر خواہی اور اپنی سعادت مندی کا تقاضا یہ ہے کہ انھیں غلط روی سے روکنے میں کوئی تامل نہ کیا جائے اور صحیح راہ دکھائی جائے۔ یہ کتنی بڑی بدخواہی ہے کہ ان کو تباہی کے راستے پر چلنے دیا جائے اور اس کے انجام سے واقف ہونے کے باوجود انھیں آگاہ نہ کیا جائے۔ خوشی اور غم کا کوئی بھی موقع ہو آپ سب سے پہلے اپنے خاندان والوں کو یاد کرتے ہیں۔ اگر آخرت کی ناکامی اور کامیابی پر آپ کو یقین ہے تو فطری طور پر آپ کو اپنے خاندان والوں کو اس سے باخبر کرنا چاہیے۔ جب آپ کا کوئی عزیز جہنم کی طرف بڑھ رہا ہو اور آپ کے اندر اس کو بچانے کے لیے

اتنی بے چینی بھی نہ ہو جتنی اس کو ڈوبتے ہوئے دیکھ کر آپ کے اندر پیدا ہوسکتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو آپ خود جہنم کی ہولناکی سے بے خبر ہیں یا آپ کو اپنے عزیز سے محبت نہیں ہے۔ آپ کے سامنے حضرت ابراہیمؑ کی مثال ہے۔ ان کا باپ کسی معمولی جرم کا ارتکاب نہیں کر رہا تھا بلکہ شرک اور بت پرستی میں مبتلا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہ نہیں سوچا کہ میں اپنے باپ سے یہ کیسے کہوں کہ تم نے کفر و شرک کی جو روش اختیار کی ہے وہ سیدھے تمھیں جہنم میں پہنچائے گی بلکہ انھوں نے صاف الفاظ میں اس کے نتائج سے باپ کو خبردار کر دیا۔

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَ لَا يُبْصِرُ وَ لَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا۝۴۲ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا۝۴۳ يٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا۝۴۴ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا۝۴۵

(مریم: ۴۲-۴۵)

(یاد کرو) جب کہ اس نے اپنے باپ سے کہا اے ابا جان! آپ ان چیزوں کی کیوں پرستش کرتے ہیں جو نہ سنتی ہیں اور نہ دیکھتی ہیں اور نہ آپ کے کچھ کام آسکتی ہیں۔ ابا جان! میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا ہے۔ لہٰذا آپ میرے پیچھے چلیں۔ میں آپ کو سیدھا راستہ دکھاؤں گا۔ ابا جان! آپ شیطان کی عبادت نہ کریں کیوں کہ شیطان خدائے رحمٰن کا نافرمان ہے۔ ابا جان! مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ رحمٰن کے عذاب میں نہ آجائیں اور شیطان کے ساتھی ہو کر رہ جائیں۔

ٹھیک اسی طرح رسول اکرم ﷺ نے بھی اپنے خاندان والوں کے درمیان 'انذار' کا فرض انجام دیا تھا اور آنے والے ہولناک دن سے انھیں باخبر کیا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ کا حکم نازل ہوا کہ "تم اپنے قریب کے رشتہ داروں کو ڈراؤ" تو آپؐ نے اس پر جس طرح عمل کیا احادیث میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ آپؐ نے اپنے قبیلے کو جمع کیا اور اس کی ہر شاخ کا نام لے کر فرمایا کہ "اللہ کا عذاب آنے والا ہے اور میں اس کے

آنے سے پہلے تمھیں اس کی اطلاع دے رہا ہوں۔ میرا حال ٹھیک اس شخص کا ہے، جس کو یہ معلوم ہو کہ دشمن اس کے خاندان پر حملہ کرنے والا ہے اور وہ اس امید میں چیخ رہا ہو کہ لوگ اس کی بات سنیں اور اس حملے سے بچیں۔ اے بنی عبدالمطلب، اے بنی فہر اور اے بنی لوئی! اپنے آپ کو اللہ کے عذاب سے بچاؤ۔ تمھارا نفع یا نقصان بالکل میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔ ہاں رشتہ داری کی وجہ سے تمھارے جو حقوق ہیں وہ میں ضرور ادا کروں گا۔ اے میری بیٹی فاطمہ! اور اے میری پھوپھی صفیہ! تم بھی اپنے آپ کو اللہ کے عذاب سے بچاؤ۔ میرے پاس جو کچھ مال و اسباب ہے وہ حاضر ہے اس میں سے جو چاہو لے لو۔ لیکن یاد رکھو! کل قیامت کے دن میں کچھ بھی تمھارے کام نہیں آسکتا۔"[1]

اگر آپ کا خاندان دین کی راہ میں آپ کے ساتھ ہے تو اسے ثابت قدم رکھنے کی کوشش کیجیے اور اللہ کا شکر ادا کیجیے کہ اس نے آپ کا ایک بوجھ ہلکا کردیا، لیکن اگر خدانخواستہ آپ کے عزیز و اقارب دنیا میں کھوئے ہوئے اور اللہ کے دین سے منحرف اور باغی ہیں تو آپ کا فرض ہے کہ انھیں صاف صاف الفاظ میں اور وقتِ ضرورت دلائل کے ساتھ بتا دیں کہ تمھاری روش اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینے والی اور تمھیں اس کی رحمت سے دور کرنے والی ہے۔ قیامت آئے گی اور یقیناً آئے گی لیکن افسوس کہ تمھیں اس کا احساس نہیں ہے اور تم نے وہاں کے عذاب سے بچنے کی کوئی تدبیر نہیں کی ہے۔ اسی کا آپ کو حکم ہے اور یہی اللہ کے پیغمبروں کا اسوہ ہے۔

بستی اور شہر کی اصلاح

گھر اور خاندان کی اصلاح کے بعد اس بستی اور شہر کی اصلاح آپ کا فرض ہے، جس میں آپ رہتے ہیں۔ کیوں کہ جس ماحول میں آپ پیدا ہوئے، پرورش پائی اور جوان ہوئے، آپ پر اس کا بڑا احسان ہے۔ اس احسان کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اس میں خدا کا دین پھیلائیں، اس کی تعلیمات عام کریں اور اس کے باشندوں کو آنے

---

[1] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۂ شعراء۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان

والے ہول ناک دن کے عذاب سے آگاہ کریں۔ ظاہر ہے اس کام کے لیے آپ جس قدر موزوں ہوسکتے ہیں اس ماحول سے باہر کا کوئی شخص اتنا موزوں نہیں ہوسکتا۔ آپ کو فطری طور پر اس بات کے مواقع حاصل ہیں کہ اپنے ماحول کی نفسیات، اس کے حالات اور اس کی فکری و عملی خوبیوں اور خامیوں سے واقف ہوں۔ اس لیے آپ ان کے درمیان اللہ تعالیٰ کے دین کے بہترین ترجمان اور داعی بن سکتے ہیں۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آپ اپنی بستی اور شہر کے لیے جانے پہچانے ہوں گے اور آپ سے وہاں کے لوگوں کو وہ اجنبیت نہ ہوگی جو کسی غیر شخص سے ہوتی ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ وہ آپ کی بات کو اپنے ہی میں کے ایک فرد کی بات سمجھیں گے اور اگر آپ خلوص اور ہم دردی سے اور ان کے حالات و مسائل کی رعایت کے ساتھ ان تک اللہ کا دین پہنچائیں تو یہ توقع غلط نہ ہوگی کہ وہ نسبتاً آسانی سے اس کی طرف توجہ کریں گے۔

شہر کے قرب و جوار کی اصلاح

اپنے شہر میں اللہ کا دین پہنچانے کے بعد یہ نہ سمجھئے کہ آپ کا کام ختم ہوگیا کیوں کہ آپ کو اس کے اطراف و اکناف میں بھی یہی کام کرنا ہے۔ چناں چہ آپ قرآن میں دیکھیں گے کہ رسول اکرم ﷺ کو مکہ اور اطرافِ مکہ دونوں جگہ انذار کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَ مَنْ حَوْلَهَا (الشوریٰ:۷)	اسی طرح ہم نے تم پر قرآنِ عربی کی وحی کی ہے تاکہ تم مکہ والوں کو اور ان لوگوں کو جو مکہ کے آس پاس رہتے ہیں اللہ کے عذاب سے ڈراؤ۔

سارے عالم کی اصلاح

اللہ کے رسول محمد ﷺ نے مکہ اور اس کے آس پاس کی آبادیوں میں دین کا پیغام پہنچانے کے بعد اپنا دعوتی کام ختم نہیں کیا، بلکہ ساری دنیا میں اسے پھیلانے کی کوشش کی۔

کیوں کہ جس دین کے آپؐ داعی تھے وہ کسی خاص قوم یا کسی مخصوص خطۂ زمین کے لیے نہیں ہے بلکہ تمام عالم کے لیے ہے۔ اسی وجہ سے آپؐ کے بارے میں قرآن نے اعلان کیا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا — ہم نے تم کو تمام انسانوں کے لیے (جنت کی) خوش خبری دینے والا اور (جہنم سے) ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ (سبا:۲۸)

یاد رکھئے کہ جو دین ساری دنیا کے لیے ہے آپ اس کے داعی ہیں اور جس پیغمبر کی بعثت تمام انسانوں کے لیے ہوئی تھی آپ اس کے جانشین ہیں۔ اس لیے آپ کا فرض ہے کہ اس دین کو سارے عالم میں پھیلانے اور اس کے انکار کے نتائج سے اس کو باخبر کرنے کی کوشش کریں۔ ورنہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر جو فرض عائد کیا ہے، آپ اس سے سبک دوش نہیں ہوں گے اور محمد ﷺ کا نام لینے کے باوجود آپؐ کے صحیح جانشین نہیں کہے جائیں گے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

دعوتِ دین کی جو ترتیب اوپر بیان ہوئی ہے اس کی شریعت کے نزدیک بھی اہمیت ہے اور عقل بھی اس کی اہمیت تسلیم کرتی ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی بھی حال میں اس میں تقدیم یا تاخیر ناجائز ہے اور اس سے ہٹ کر کبھی دعوت کا کام کیا ہی نہیں جاسکتا، بلکہ یہ ایسی ترتیب ہے جو وقتِ ضرورت بدل سکتی ہے اور دعوت کے تقاضوں کے تحت اس میں ترمیم کی جاسکتی ہے۔ یہ ترتیب دعوت کے مختلف مراحل کی شکل میں ہمارے سامنے نہیں آتی کہ ایک مرحلہ ختم ہو تو دوسرا مرحلہ پیش آئے، بلکہ یہ ہمیں دعوت کے مختلف محاذوں کی نشان دہی کرتی ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض اوقات داعی کو ایک ہی وقت میں متعدد محاذوں پر کام کرنا پڑتا ہے کیوں کہ یہ عین ممکن

ہے کہ آپ کو اپنے گھر اور خاندان میں دعوتِ دین کے جو مواقع اور سہولتیں میسر ہیں ٹھیک یہی مواقع اور یہی سہولتیں آپ کو بڑی بڑی قوموں سے خطاب کے لیے بھی حاصل ہوں، بلکہ اس کا بھی امکان ہے کہ کسی وقت دعوتِ دین کے لیے آپ کے اپنے گھر کی فضا سازگار نہ ہو اور باہر کے حالات سازگار ہوں۔ اس وقت ان حاصل شدہ مواقع اور سہولتوں کو یہ سوچ کر کھو دینا کہ ابھی خاندان اور قبیلے میں ہمارا دعوتی کام نہیں ہوا ہے، بہت بڑی نادانی ہوگی بلکہ اس کا عین تقاضا یہ ہے کہ آپ اپنے گھر میں اصلاح کی کوشش کر رہے ہوں یا خاندان اور قبیلے میں، دعوت و اصلاح کا وسیع کام بہرحال آپ کو اپنے سامنے رکھنا ہوگا اور اپنی حد تک اسے انجام دینا ہوگا۔ دعوتِ دین کی جو ترتیب اوپر بیان ہوئی ہے وہ اس لیے نہیں ہے کہ جب دعوت کا عمل ایک خاص دائرے میں ختم ہو تو آپ دوسرے دائرے میں اس کا آغاز کریں، یا جب تک اپنے گھر کی پوری طرح اصلاح نہ ہو، خاندان کی اصلاح کی کوشش نہ کریں، یا آپ کے شہر میں دعوت کا کام مکمل نہ ہو تو اہل وطن کو دین کی دعوت نہ دیں، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان اس فکر میں کہ اسے سارے عالم میں اللہ کا دین پہنچانا ہے، اپنے گھر، خاندان اور قریبی ماحول کو نہ بھول جائے۔ یہ انتہائی نامعقولیت اور بہت بڑی غلطی ہے کہ کوئی شخص دوسروں کی اصلاح کی تو کوشش کرے اور بیوی بچوں کی اصلاح سے غافل ہو جائے۔ اس پر اس کی باز پرس ہوگی۔ لیکن اس کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس غلطی کی وجہ سے اس کی سعیِ اصلاح جو وہ دوسروں کے درمیان کر رہا ہے اللہ کے نزدیک مذموم نہیں ہوگی۔ وہ فی نفسہٖ قابل تعریف ہے اور اسے فی الواقع قابل تعریف ہونا ہی چاہیے۔

دعوت کے اصول و آداب

قرآن و حدیث میں جہاں اسلام کی دعوت کا حکم دیا گیا ہے، وہیں اس کے اصول و آداب بھی بتادیئے گئے ہیں، لیکن بہت سے لوگ جو دعوت کا کام کرتے ہیں، ان اصول و آداب سے ناواقف ہیں یا اگر واقف ہیں تو ان کی اہمیت نہیں محسوس کرتے، حالانکہ اسلام کی دعوت کا حق صرف ان ہی طریقوں سے ادا ہوسکتا ہے جو قرآن و حدیث میں اس کام کے لیے بیان ہوئے ہیں۔ ان سے ہٹ کر شب و روز لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف بلانے اور اس راہ میں اپنی جان کھپانے کے باوجود انسان کامیاب داعی کبھی نہیں بن سکتا، بلکہ اس کام کے خاص اصول و آداب سے انحراف کے بعد اس بات کا بھی سخت خطرہ ہے کہ دین کی کوئی خدمت تو نہ ہو، البتہ اس کو اتنا زبردست نقصان پہنچے کہ مدتوں اس کی تلافی نہ ہوسکے۔

اسلام کی دعوت کے سلسلے میں جو اصول و آداب داعی کے پیش نظر ہونے چاہئیں، ان میں سے بعض کا تعلق اس بات سے ہے کہ اسلام کو کس طرح پیش کیا جائے کہ لوگوں کے سامنے وہ اپنی صحیح شکل میں آئے اور اس کی امتیازی خصوصیات پوری طرح باقی رہیں۔ بعض کا تعلق اسلام کے بارے میں مخاطب کے موقف سے ہے۔ داعی کا خطاب اس کے اسی موقف کے پیش نظر ہوگا، وہ اسی بنیاد پر اس کے ساتھ اپنا داعیانہ طرزِ عمل متعین کرے گا اور دین کے لیے اس کی جتنی اہمیت ہوگی اسے اتنی ہی اہمیت دے گا۔ ان آداب میں سے بعض کا تعلق خود داعی سے ہے کہ اس نے دعوت کو کس حد

تک سمجھا ہے اور کتنی تہذیب و شائستگی کے ساتھ اسے وہ پیش کرتا ہے۔ اس معاملہ میں اس کا علم وفہم اور اخلاق و کردار جتنا اونچا ہوگا اسی قدر اسلام کے قبول کیے جانے کے امکانات بھی زیادہ ہوں گے۔ یہاں ہم ایک ترتیب سے ان اصول و آداب کا ذکر کریں گے۔

۱- اسلام کس طرح پیش کیا جائے؟

سب سے پہلے اس سوال کو لیجیے کہ دنیا کے سامنے اسلام کو کس طرح پیش کیا جائے؟ اس سلسلہ میں بعض بنیادی باتوں کو سامنے رکھنا ہوگا۔

دعوت عام ہو

اللہ تعالیٰ نے اپنا دین اس لیے نازل کیا ہے کہ جو شخص بھی اسے اختیار کرنا چاہے بہ خوشی اختیار کرے۔ یہ کسی خاندان یا گروہ کی میراث نہیں ہے، بلکہ ہر اس شخص کی ملکیت ہے جو اسے قبول کرلے۔ اس لیے اس کی دعوت بالکل عام ہونی چاہیے اور تمام انسانوں کے لیے ہونی چاہیے۔ آپ کو اس کی اجازت ہے کہ آپ اسے کسی فرد یا طبقے کے سامنے پہلے اور کسی دوسرے فرد اور طبقے کے سامنے بعد میں پیش کریں، بلکہ ایسا کرنے پر آپ مجبور بھی ہیں، لیکن یہ بات ہرگز صحیح نہ ہوگی کہ آپ اس دعوت کو ایک قومی اور ملکی تحریک کی حیثیت دے دیں یا ایسا انداز اختیار کریں کہ دنیا اس کو تمام انسانوں کی ہدایت کا ذریعہ سمجھنے کے بجائے ایک مخصوص قوم کی کامیابی یا اصلاح کی کوشش سمجھنے پر مجبور ہوجائے۔ اس دعوت کے حق میں ایسا ماحول پیدا کرنا جس کی وجہ سے بے شمار انسان اس سے محروم ہوکر رہ جائیں، نہ صرف اس دعوت کی تحریف ہے، بلکہ نوعِ انسانی پر بہت بڑا ظلم ہے۔ کسی فرد یا جماعت کو اللہ تعالیٰ کے دین سے دور کردینا، اس کے خلاف اس سے زیادہ سخت اقدام ہے کہ اسے کھلی ہوا میں سانس لینے نہ دیا جائے۔ کیونکہ اس سے اس کی محض یہ چند روزہ زندگی ختم ہوسکتی ہے، لیکن اللہ کے دین سے محرومی کے بعد تو وہ ہمیشہ کے لیے تباہ ہوجائے گا۔ لیکن افسوس کہ اس دین کے ماننے

والوں نے عرصے سے ایسا رویہ اختیار کر رکھا ہے کہ دنیا اس کو خاص ان کا دین سمجھنے لگی ہے۔ وہ اگر سوچتے ہیں تو اپنے نفع ونقصان کے بارے میں سوچتے ہیں اور کام کرتے ہیں تو اس طرح جیسے ان کو اپنے سوا کسی سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ حتیٰ کہ انھوں نے دین کی تبلیغ بھی کی تو اپنے ہی حلقے میں کی۔ گویا اللہ تعالیٰ کا دین صرف اُن کے لیے ہے اور دوسروں کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ جو لوگ اسلام کی دعوت لے کر اٹھیں ان کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ اس کو دنیا کے سامنے اس طرح پیش کریں کہ وہ کسی خاص گروہ کی متاع نہ معلوم ہو، بلکہ پوری نوعِ انسانی اس کو اپنا سرمایہ سمجھے۔ اس کا ثبوت ان کو اپنی زبان ہی سے نہیں بلکہ عمل سے بھی دینا ہوگا۔ ان کو اپنے تمام معاملات میں وہ روش اختیار کرنی ہوگی جو اس عالم گیر دین کے علم برداروں کے لیے درست ہوسکتی ہے۔ ورنہ محض ان کے دعویٰ کی وجہ سے دنیا یہ باور نہیں کرسکتی کہ وہ جس دین کی دعوت دے رہے ہیں وہ تمام انسانوں کا دین ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر طرح کے قومی تعصب کو اپنے اندر سے نکال پھینکیں اور ہر ایک کے ساتھ حق وصداقت کی بنیاد پر معاملہ کریں، بلکہ ہر اس شخص کا ساتھ دیں جو حق پر ہے، خواہ وہ ان کے لیے کتنا ہی اجنبی کیوں نہ ہو اور جو انسان برسرِ باطل ہے اس سے الگ ہوجائیں، خواہ وہ ان کا خونی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ ان کی دوستی اور دشمنی سب کچھ اللہ تعالیٰ کے دین کے تابع ہو اور دنیا کی کوئی قوت ان کو اس سے ہٹا نہ سکے۔

دعوت پوری زندگی کی اصلاح کے لیے ہو

اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ انسان اپنی پوری زندگی میں وہ راہ اختیار کرے جو اس کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ اسی کے لیے اس نے اپنے رسول بھیجے اور اپنا دین نازل کیا۔ داعی الی اللہ اس کے بندوں کے درمیان اس کے دین کی اسی غرض وغایت کو بیان کرنے کے لیے کھڑا ہوتا ہے۔ اس کو چاہیے کہ پوری قوت کے ساتھ زندگی کے ہر معاملہ میں اس کی اتباع کی دعوت دے۔ لیکن یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ ایک طویل عرصے

سے اس دین کے ماننے والے اس کا تعارف اس طرح کرا رہے ہیں کہ گویا وہ زندگی سے غیر متعلق محض چند مابعد الطبعی نظریات کا نام ہے۔ چنانچہ ان کے اصحابِ علم اور پڑھے لکھے لوگوں کی تحریروں اور تقریروں میں بھی یہ بحثیں کم ہی ملیں گی کہ اللہ تعالیٰ کیا چاہتا ہے اور اس کی مرضی کیسے پوری کی جائے؟ البتہ وہ اس پر پورا زور صرف کریں گے کہ روح قدیم ہے یا حادث اور آسمان میں خرق و التیام ممکن ہے یا نہیں؟ ظاہر ہے اس طرح کے مباحث سے کم ہی لوگوں کو دل چسپی ہوسکتی ہے اور جن لوگوں کو دل چسپی ہوسکتی ہے ان کے لیے بھی یہ تحقیق اور ریسرچ کا موضوع تو بن سکتے ہیں، لیکن اس تحقیق کا ان کی عملی زندگی سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ وہ اس سے غیر متاثر ہی رہے گی۔ باقی رہے عوام تو ان کے لے یہ مباحث ہی سرے سے بے سود ہیں۔

یہ تو ان کے خواص اور اہلِ علم کا حال ہوا، ان کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ اس نے اللہ کے دین کے بارے میں اپنی زبان سے نہ سہی کم سے کم اپنے عمل سے یہ تاثر دیا ہے کہ اگر بعض تہوار اور خاص خاص مواقع پر چند بے جان رسمیں انجام دے دی جائیں تو اس کا حق ادا ہوگیا۔ اس تعارف نے دین سے اس کا بے پایاں حسن چھین لیا اور اس کی فطری کشش ختم کردی۔ ظاہر ہے کہ ہر قوم کے پاس اپنی رسمیں ہیں، وہ اس کو اسی طرح محبوب ہیں جس طرح آپ کو اپنی رسمیں محبوب ہیں۔ آخر وہ ان کو چھوڑ کر آپ کی رسوم کی کیوں پابند ہوجائے جب کہ اس کی کوئی معقول وجہ بھی اس کے سامنے نہ آئی ہو۔

اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اپنی صحیح شکل میں ہمارے درمیان موجود ہے۔ اس کے ذریعہ انسان آسانی سے اللہ کے نازل کردہ دین کو معلوم کرسکتا ہے، لیکن اس کتاب کے ساتھ اس کے ماننے والوں کا رویہ اس راہ میں بھی رکاوٹ رہا ہے۔ انھوں نے اسے اس طرح پیش کیا جیسے وہ بے سوچے سمجھے پڑھنے، شادی بیاہ کے وقت تلاوت کرنے، نزع کی تکلیف دور کرنے، میت کے گناہ بخشوانے یا آسیب اور جن دور کرنے کے لیے آئی ہے۔ ان 'بلند مقاصد' کے لیے دنیا والوں کے پاس بہت سے 'صحیفے'

موجود ہیں، اس لیے ان کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ اس خاص کتاب کی طرف رجوع کریں، جسے اس کے ماننے والے کتاب اللہ کہتے ہیں۔ اب جو لوگ دعوت کا کام کرنا چاہیں انھیں اپنوں اور غیروں کے اس رجحان اور رویہ کو بدلنا ہوگا اور بتانا ہوگا کہ دنیا اور آخرت میں انسان کی کامیابی اسی کتاب سے وابستہ ہے۔ وہ اگر اس کو قبول کرلے تو اس کے تمام مسائل اس طرح حل ہوجاتے ہیں جیسے وہ اپنے حل کے پہلے سے منتظر ہوں، لیکن اگر وہ اس کو رد کردے تو نہ صرف یہ کہ وہ اپنے مسائل کے حل کرنے میں ناکام ہوگا بلکہ اس کی آخرت بھی تباہ ہوجائے گی۔

اصول کو اہمیت دی جائے

اسلام کے کچھ اصول ہیں اور پھر ان اصول سے شاخ درشاخ بہت سی تفصیلات نکلی ہیں۔ جو شخص اصول کو مان لے وہ آسانی سے اس کی تفصیلات کا انکار نہیں کرسکتا، لیکن جس شخص کے لیے یہ اصول ہی ناقابلِ قبول ہوں، وہ تفصیلات کے اس پورے نظام ہی کو رد کردے گا جو ان کی بنیاد پر قائم ہے۔ اسی وجہ سے خود اسلام کے نزدیک بھی اصول ونظریات کی بڑی اہمیت ہے اور اس نے ان پر جزئیات اور تفصیلات سے زیادہ زور دیا ہے، لیکن اِدھر ماضی قریب میں اسلام کی جو خدمت ہوتی رہی ہے اس کا رخ بجائے اصول کے فروع کی طرف رہا ہے۔ جن نظریات پر اللہ کے دین کی اساس قائم ہے ان کو ثابت کرنے کی تو کوشش نہیں کی گئی، البتہ فروعِ دین میں سے ایک ایک فرع پر بے حد محنت اور دیدہ ریزی سے دادِ تحقیق دی گئی اور بڑی بڑی ضخیم تصنیفات مرتب ہوگئیں۔ دنیا نے اللہ تعالیٰ کے وجود اور رسول کی رسالت کا انکار کیا اور الحاد و دہریت نے عقائد و افکار، تہذیب وتمدن، علم وفن اور حکومت و سیاست ہر شعبے پر اپنا قبضہ جمالیا۔ حتّٰی کہ بہت سے وہ لوگ جو اسلام کو اللہ کا دین مانتے تھے اس کی صداقت کے بارے میں شک و شبہ میں پڑگئے اور بہت سے اس سے منحرف بھی ہوگئے، لیکن ہمارے خادمانِ دین نے اس حملے سے اس طرح اعراض کیا جیسے دین کے اساسی

نظریات دنیا کے کسی گوشے میں زیرِ بحث ہی نہیں ہیں اور ان کے درمیان رفعِ یدین اور آمین بالجہر کے ثبوت و عدم ثبوت اور ان ہی جیسے مسائل پر معرکے قائم ہوتے رہے۔ بلاشبہ بعض اوقات اس طرح کی بحثیں بھی مفید ہوتی ہیں، لیکن یہ ان لوگوں کے لیے فائدہ مند ہوتی ہیں جو اللہ اور رسول کو مانتے ہیں۔ مگر جہاں دین و ایمان ہی متزلزل ہو وہاں وضو اور غسل کے مسائل بیان کرنا بے کار ہے۔

یہ بات بھی نہیں کہی جا سکتی اور یہ واقعہ کے خلاف ہوگی کہ اسلام کے سب ہی خادم اس طرح کے چھوٹے چھوٹے مسائل میں الجھے رہے اور اس کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کی کوشش نہیں ہوئی بلکہ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ اس میدان میں بہت سی کوششیں ہوئی ہیں اور ان میں سے بعض قابل قدر بھی ہیں، لیکن اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ زیادہ تر یہ کوششیں موجودہ دور کے علمی وفکری معیار سے فروتر ہیں اور ان میں وہ بھرپور سامان نہیں ہے جو آج کے ذہن وفکر کو پوری طرح مطمئن کر سکے۔ لہٰذا اب اسلام کے خادموں کو چاہیے کہ وہ اس کمی کو دور کرنے کی پوری پوری سعی کریں ورنہ آج اسلام جس اعلیٰ پیمانہ کی خدمت چاہتا ہے وہ انجام نہیں پا سکے گی۔

دعوتِ دین کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے ان نظریات کو مستحکم کیا جائے جن پر دین کی اساس قائم ہے اور پھر فروعِ دین میں سے جس فرع کو خود دین نے جتنی اہمیت دی ہے اسے اتنی ہی اہمیت دی جائے۔ اس کی فی الواقع جو حیثیت ہے اسے نہ تو کم کیا جائے اور نہ اس میں اپنی طرف سے کوئی اضافہ کیا جائے۔ اگر آپ کسی شخص کے ذہن میں اساساتِ دین کو راسخ کیے بغیر دین کی بے شمار تفصیلات پر اس کو مطمئن کرنا چاہیں تو اس میں نہ صرف یہ کہ آپ کا وقت ضائع ہوگا، بلکہ آپ ایک ایسی عمارت تعمیر کریں گے جس کی کوئی بنیاد نہیں ہوگی اور جسے بادِ مخالف کا ایک ہی جھونکا زمین پر گرادے گا۔

روحِ دین پیدا کرنے کی کوشش کی جائے

اسلام کی ایک تو روح ہے اور ایک ہے اس کا ظاہری ڈھانچہ۔ اس کی روح یہ

ہے کہ انسان میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور بندگی کا جذبہ پیدا ہو اور وہ اس کے ہر حکم کے سامنے سر جھکانے کے لیے تیار ہو جائے۔ اس کا ظاہری ڈھانچہ وہ نظامِ شریعت ہے جو انسان کے تمام اعمال کے لیے خاص ضوابط متعین کرتا ہے۔ اسلام کی دعوت کا کام صحیح طریقے سے اسی وقت انجام پاسکتا ہے جب کہ آپ اس کے اس ظاہری ڈھانچے پر زور دینے سے زیادہ اس کی روح پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ کیوں کہ اگر یہ روح پیدا ہوگئی تو انسان کو خود ہی اس بات کی فکر ہوگی کہ زندگی کے ہر معاملے میں اللہ کی مرضی پوری کرے۔ لیکن اگر یہ روح کسی کے اندر پیدا نہیں ہوئی ہے تو قدم قدم پر اس کے اسلام سے ہٹ جانے کا خطرہ ہے۔ پھر اس کا ایک نقصان یہ بھی ہے کہ اسلام کی روح پیدا کیے بغیر اگر آپ کسی کو شریعت کے ایک حصے کا پابند بنائیں گے تو وہ عادتاً اس کا پابند ہو جائے گا لیکن دوسرے حصے کی پابندی اس پر شاق گزرے گی۔ شریعت کے جن احکام کی آپ اسے تلقین کریں گے ان پر تو وہ مضبوطی سے جما رہے گا لیکن دوسرے معاملات میں اسے اسلام کے تقاضے معلوم کرنے کی فکر نہ ہوگی۔ چناں چہ دیکھا گیا ہے کہ اللہ کا دین انسان میں جس قسم کی روح پیدا کرنا چاہتا ہے وہ پیدا کیے بغیر جن لوگوں کو چند امورِ شریعت کی مشق کرادی جاتی ہے یا جن احکام کا پابند بنا دیا جاتا ہے، ان کو تو وہ کبھی چھوڑنا گوارا نہیں کرتے، لیکن ان سے زیادہ اہم معاملات میں احکامِ شریعت سے اس طرح غفلت کا شکار رہتے ہیں جیسے ان کی اتباع کا ان کو حکم ہی نہیں ملا ہے۔

۲۔ مخاطبین اور ان کا طرزِ عمل

اسلام کی دعوت کے لیے سب سے پہلے مخاطب کے رجحان اور اس کی ذہنی کیفیت کو سمجھنا ضروری ہے۔ جب تک آپ یہ نہ معلوم کرلیں کہ وہ اسلام کا انکار کر رہا ہے یا اقرار اور پھر اس کا انکار اور اقرار کس درجہ اور کس نوعیت کا ہے اس وقت تک آپ اس سے کامیاب دعوتی خطاب نہیں کر سکتے۔ آپ بغیر ہدف کے تیر چلائیں گے اور اپنی قوت ضائع کریں گے۔

مخاطبین کی مختلف قسمیں

اللہ کے دین کے ساتھ سب انسانوں کا معاملہ یکساں نہیں ہوتا۔ کچھ لوگوں کو خود سے اس کی تلاش ہوتی ہے۔ جب ان تک اس کی دعوت پہنچتی ہے تو وہ اس کی طرف اس طرح لپکتے ہیں جیسے پیاسا پانی کی طرف لپکتا ہے۔ ان کے درمیان دعوتِ دین کا اٹھنا ہی ان کے لیے اس کے قبول کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ یہ لوگ اپنی صحیح فطرت کی وجہ سے اللہ کے دین کے سوا کسی دوسرے دین کو کبھی اختیار نہیں کرتے اور اگر کسی وقت اس کے زیرِ اثر آ بھی جاتے ہیں تو بہت جلد ان پر اس کی خامی اور خرابی واضح ہوجاتی ہے اور وہ کسی پس و پیش کے بغیر اسے رد کردیتے ہیں۔ ان کو دین سے قریب کرنے کے لیے داعی کو بہت زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی، بلکہ دین کی آواز ان کے کان میں پڑتے ہی وہ خود بہ خود اس کی جانب دوڑے چلے آتے ہیں۔ کسی بے اصل فکر پر جمے رہنا ان کے ذہن و مزاج کے خلاف ہوتا ہے۔

بعض لوگ دین سے اختلاف تو کرتے ہیں، لیکن ان کا یہ اختلاف اصولی اور نظریاتی ہوتا ہے۔ وہ اختلاف اس وجہ سے نہیں کرتے کہ انھوں نے دین کو قبول نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے، بلکہ اس وجہ سے کرتے ہیں کہ دین کی حقانیت ان پر واضح نہیں ہوئی ہے۔ اگر ان پر دین کی حقیقت کھل جائے تو وہ ہر بندش کو توڑ پھینکیں گے اور اسے اس طرح سینے سے لگالیں گے جس طرح ماں اپنے گم شدہ بچے کو اس وقت سینے سے لگالیتی ہے جب کہ وہ مدت کے بعد اس کی نگاہوں کے سامنے آجائے۔ ان لوگوں کے معاملے میں داعی کا کام یہ ہے کہ ان کو دین کی حقانیت کا ثبوت فراہم کرے۔ لیکن اس کے لیے اس کو وہ طریقہ نہیں اختیار کرنا چاہیے جو ہمارے اہلِ منطق اور اصحابِ مناظرہ دوسروں کے دلائل کی تردید اور اپنے دعوؤں کے اثبات کے لیے اختیار کرتے ہیں۔ اس میں مخاطب کی زبان تو بند ہوجاتی ہے اور وہ اس کی بحث سے پناہ مانگتا ہوا بھاگ کھڑا ہوتا ہے لیکن قبولِ حق کے لیے اس کے دل کے دروازے نہیں کھلتے۔ جو شخص داعیِ دین

ہے اس کے لیے یہ طریقہ نہ تو صحیح ہے اور نہ اللہ کا دین اپنے ثبوت کے لیے اس کا محتاج ہی ہے۔ اس کو ایسا اندازِ استدلال اختیار کرنا چاہیے جو مخاطب کے دل و دماغ کو پوری طرح مطمئن کردے اور وہ بے ساختہ اللہ کے دین کی طرف کھنچ پڑے۔ اللہ کا دین اس کائنات کے مزاج اور انسان کی فطرت کے عین مطابق ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ انسان نے جب بھی اسے قبول کیا کامیاب رہا اور جب اس کا انکار کیا اللہ کے عذاب میں گرفتار ہوا۔ اس حقیقت کو اگر آپ استدلال کی شکل دے دیں تو کوئی بھی سنجیدہ اور معقول آدمی اس کو رد نہیں کرسکتا۔

دین کا انکار کرنے والوں میں بعض لوگوں کا انکار کسی معقولیت کی بنیاد پر نہیں ہوتا، بلکہ اس کے پیچھے بہت پست محرکات ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اس کا انکار اس لیے نہیں کرتے کہ وہ ابھی ان کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے، بلکہ اس لیے کرتے ہیں کہ وہ کسی قیمت پر اس کو ماننا نہیں چاہتے۔ ان لوگوں کے درمیان داعی کو صرف اسی وقت تک اپنی کوشش جاری رکھنی چاہیے جب تک کہ ان کے اسبابِ مخالفت کھل کر سامنے نہ آجائیں اور جب یہ سامنے آجائیں تو داعی کو اپنی قوت ان پر ضائع کرنے کے بجائے ان لوگوں کی طرف توجہ کرنی چاہیے جن سے قبولِ حق کی توقع ہو۔

بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو فی الجملہ اسلام کے اصول ونظریات سے اختلاف نہیں ہوتا لیکن اس کے فطری اور لازمی تقاضوں کو وہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ ان کے روبرو اسلام کے اصول وکلیات پر لمبی چوڑی بحث کرنا بے سود ہے۔ ان کے سامنے اس طرح اس کا تعارف کرانا ہوگا کہ وہ اس کو ماننے کے بعد اس کے تقاضوں کا انکار نہ کرسکیں۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوں گے جو ان تقاضوں سے بالکل بے خبر ہوں گے، ان کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ یہ تقاضے بتادیے جائیں۔ بعض لوگ اسلام سے پوری طرح اتفاق کرنے کے باوجود عملاً اس کا ساتھ دینے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے۔ ان کے درمیان داعی کو ترغیب وترہیب سے کام لینا ہوگا اور ان کو اس کی اتباع

کے بہترین ثمرات اور اس سے انحراف کے خوف ناک نتائج سے باخبر کرنا ہوگا۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوں گے جن سے داعی کو مختلف مسائل پر بحث کرنی پڑے گی۔ لیکن اس بحث کو 'مناظرہ' نہیں بلکہ افہام و تفہیم کا ذریعہ ہونا چاہیے۔ مناظرے میں مخاطب کو اپنا حریف سمجھ کر اس کی ہر بات کو رد کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، خواہ وہ اپنی زبان سے کلمۂ حق ہی کیوں نہ کہہ رہا ہو۔ لیکن داعیِ دین یہ رویہ نہ تو اختیار کرسکتا ہے اور نہ فی الواقع اسے اختیار کرنا چاہیے۔ اس کو ہر قدم پر ایک حق پسند انسان کا کردار ادا کرنا ہوگا۔ مخاطب کے پاس جو حق ہوگا اسے بخوشی وہ حق کہے گا اور جو باطل ہوگا تہذیب اور متانت کے ساتھ، اس کی تردید کرے گا اور انتہائی تدبر اور حکمت سے اس کے ذہن و فکر کی اصلاح کی کوشش کرے گا۔ اگر کسی کے اندر یہ سنجیدگی اور حکمت و دانائی نہیں پیدا ہوئی ہے تو اس کا مقام اسلام کے داعی کا نہیں ہے۔ ابھی اسے اس مقام تک پہنچنے کے لیے بہت کچھ ریاضت کرنی ہوگی۔

سردارانِ قوم سے خطاب

دعوت کے مخاطبین میں بعض لوگوں کو قیادت اور راہ نمائی کا مقام حاصل ہوتا ہے اور زیادہ تر لوگ ان کے پیچھے چلنے والے ہوتے ہیں۔ داعی اگر یہ چاہے کہ ان راہ نماؤں اور ان کے پیچھے چلنے والوں میں سے جو شخص بھی دین سے غافل ہے ان سب تک اللہ تعالیٰ کا دین پہنچائے تو گویہ ایک مبارک خواہش ہوگی لیکن عملاً یہ اس کے لیے ناممکن ہوگا۔ کیونکہ اس کی قوتیں بہت محدود ہیں اور وہ ایک خاص دائرے ہی میں کام کرسکتا ہے۔ اب اس کے سامنے دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ان لوگوں کو نظر انداز کر جائے جو اپنے ماحول کی قیادت کر رہے ہیں اور عوام الناس میں دعوتی جدوجہد جاری رکھے۔ دوسری صورت یہ کہ پہلے وہ اصلاً وقت کے رہنماؤں سے خطاب کرے اور پھر اس کے ساتھ جس حد تک عام لوگوں میں اپنا پیغام پہنچا سکتا ہے پہنچانے کی کوشش کرے۔ یہی دوسرا طریقہ اللہ کے رسولوں کا رہا ہے۔ ان کا پہلا خطاب اپنی قوم کے

سرداروں اور لیڈروں سے ہوتا ہے اوروہ ایک بار اپنی پوری قوت ان کو راہِ راست پر لانے میں صرف کردیتے ہیں۔ کیوں کہ اس طبقے کا ایک فرد بھی اللہ کے دین کو قبول کرلے تو بہت سے افراد کے لیے قبولِ دین کا راستہ کھل جاتا ہے۔ وہ اپنی قائدانہ صلاحیت اور ماحول میں اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے تبلیغِ دین کی وہ خدمت انجام دے سکتا ہے جو کم زور طبقے کی پوری ایک جماعت کے بس میں نہیں ہوتی۔ اس طرح داعی کا برسوں کا کام مہینوں اور دنوں میں پورا ہونے لگتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک کوئی دعوت اپنے ماحول کے سب سے اونچے طبقے میں نفوذ نہیں کرتی اس پر چھا نہیں سکتی۔

اللہ کے رسولوں میں دعوت وتبلیغ کی بے پناہ صلاحیت ہوتی ہے، اس وجہ سے وہ اپنی قوم کے سرداروں اور لیڈروں سے بآسانی خطاب کرتے ہیں اور کامیاب رہتے ہیں لیکن اب یہ خدمت جس امت کو انجام دینی ہے اس میں کم صلاحیت والے اور زیادہ صلاحیت والے دونوں طرح کے افراد ہیں۔ اس میں وہ اشخاص بھی ہیں جن کو وقت کے قائدین سے خطاب کے مواقع حاصل ہیں اور وہ افراد بھی ہیں جو ان مواقع سے بالکل محروم ہیں۔ اس لیے جس شخص میں جتنی صلاحیت ہے اور اسے جو مواقع حاصل ہیں ان ہی کے لحاظ سے وہ اپنا دائرۂ کار متعین کرنے پر مجبور ہے۔ لیکن یہاں یہ بات بھی ذہن میں تازہ رہے کہ اپنی صلاحیت کا جائزہ لیتے وقت داعی کو کسی قسم کے احساس کم تری میں مبتلا نہ ہونا چاہیے۔ اسے یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اس کے پاس حق ہے اور جو شخص بھی حق کی مخالفت کرے وہ بظاہر کتنا ہی بڑا انسان کیوں نہ ہو اس کی بنیاد کم زور ہے۔ اس لیے داعیِ دین کو ہمیشہ اپنی صلاحیت سے اونچے دائرے میں کام کے مواقع تلاش کرنے چاہئیں اور جب بھی اس کا موقع ملے اسے اپنی بات پیش کرنے میں کوئی جھجک اور تامل نہیں ہونا چاہیے۔ اس راہ میں شروع میں اس کو مشکلات سے بھی دو چار ہونا پڑے گا، لیکن مشکلات ہی آدمی کی صلاحیتوں کو نکھارتی ہیں۔ پھر یہ کہ جس خدا کا پیغام لے کر وہ اٹھا ہے وہ نازک لمحات میں اس کو بے یارو مددگار نہیں چھوڑے گا بلکہ

لازماً اس کی دست گیری فرمائے گا۔ اس کے برخلاف اگر وہ کم صلاحیت کے لوگوں ہی کو دین کی دعوت دے تو گو اس کا کام بہت آسان ہوجائے گا لیکن اس سے اس کی صلاحیتیں ابھر نہیں سکیں گی اور شاید وہ اس طرح اللہ کی طرف رجوع بھی نہ کرے جس طرح مشکلات میں رجوع کرسکتا ہے۔

۳۔ داعی کا فہم و کردار

دعوت کی کامیابی اور ناکامی کا بہت کچھ انحصار دو پہلوؤں سے داعی کی شخصیت پر بھی ہے۔ ایک یہ کہ خود اسے دعوت کا کتنا فہم حاصل ہے، اس نے کس حد تک اسے اپنے اندر جذب کیا ہے اور اس کے لیے وہ کیا اندازِ بیان اور کون سے ذرائع اختیار کرتا ہے؟ دوسرے یہ کہ مخاطب کے ساتھ اس کا رویہ کیا ہے؟ کیوں کہ مخاطب کے ساتھ وہ جتنا اچھا اور معقول رویہ اختیار کرے گا اتنا ہی اس بات کا امکان ہے کہ مخاطب اس سے قریب ہو اور اس کی بات سنے، لیکن اگر مخاطب کے ساتھ اس کا رویہ غلط ہوگا تو مخاطب بھی اس سے اور اس کی دعوت سے دور ہی رہے گا۔ ان دونوں پہلوؤں پر یہاں تھوڑی سی روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔

دعوت کا واضح تصوّر رکھے

اسلام کی دعوت کے لیے ضروری ہے کہ اس کے بارے میں سب سے پہلے خود داعی کا ذہن صاف ہو۔ اسے معلوم ہو کہ اسلام کیا ہے اور اس کی دعوت کیوں دی جاتی ہے؟ اس کا مقصد اور منزل ہر وقت اس کے سامنے رہے، اس کے تقاضوں سے وہ بخوبی واقف ہو اور اچھی طرح جانتا ہو کہ اس کے لیے صحیح طریقۂ کار کیا ہے اور کون سا طریقہ اس کے لیے مناسب ہے؟ اگر داعی کا ذہن ان تمام امور میں صاف نہیں ہے تو اس کے دو نقصانات ہوں گے۔ ایک یہ کہ وہ دوسروں کے سامنے اسلام کو پوری وضاحت کے ساتھ نہیں پیش کرسکے گا۔ ظاہر ہے اس کے بغیر اس کے پھلنے پھولنے اور آگے بڑھنے کی

توقع نہیں کی جاسکتی۔ وہ دعوت یقیناً ناکام ہوگی جس کا علم بردار یہ نہ بتا سکے کہ وہ کیا چاہتا ہے؟ اس کا دوسرا نقصان یہ ہوگا کہ وہ اسلام اور اس کے مخالف نظریات میں فرق نہیں کر سکے گا۔ اس وجہ سے اس بات کا سخت خطرہ رہے گا کہ وہ ان نظریات کو اسلام کے نظریات سمجھ کر قبول کرلے اور پورے جوش کے ساتھ ان کی طرف دعوت دینے لگے۔

صاف اور مؤثر انداز میں دعوت دے

انسان بڑی غفلت میں ہے۔ اس کو جب تک جھنجھوڑا نہیں جائے گا وہ بے دار نہیں ہوگا۔ اس لیے داعی کو چاہیے کہ اپنی بات پورے جوش اور قوت کے ساتھ پیش کرے اور ایسا اسلوب اختیار کرے، جس سے انسان کا خوابیدہ ضمیر جاگے اور اس کے جذبات میں حرکت پیدا ہو۔ فلسفیوں کے سے بے جان اور سپاٹ اندازِ بیان سے دعوت کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح داعی کو چاہیے کہ اپنی دعوت کے لیے بہت ہی صاف اور واضح اسلوب اختیار کرے۔ اگر اس کی طول طویل بحث کے بعد بھی لوگ یہ سوال کرنے پر مجبور ہوں کہ اس کا مقصد کیا ہے اور وہ کیا چاہتا ہے تو یہ معمّے کی زبان ہوگی، داعی کی زبان نہیں ہوگی۔ الجھا ہوا اندازِ بیان، دور از کار تشبیہات، مغلق اصطلاحات، غیرضروری طوالت یا ایسا اختصار جس سے مطلب کے سمجھنے میں زحمت پیش آئے، داعی کی شان سے فروتر اور اس کی راہ میں زبردست رکاوٹ ہے۔ آپ دوٹوک اور صاف لفظوں میں اپنی بات کہیے اور اس طرح کہیے کہ آسانی سے مخاطب کے ذہن کی گرفت میں آجائے۔ اگر آپ کا اندازِ بیان گنجلک اور غیر واضح ہے تو اپنی تاثیر کھو دے گا اور لوگوں کے لیے اس کا قبول کرنا آسان نہ ہوگا۔

حلال ذرائع اختیار کرے

اسلام کی دعوت کے لیے داعی کو وہی طریقے اختیار کرنے چاہئیں، جن کی خود دین نے اجازت دی ہے۔ دین نے حلال وحرام کے جو حدود بیان کیے ہیں، ان کی پابندی

کے بغیر اس کام کا قصد کرنا بھی گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا دین قطعاً اس کا محتاج نہیں ہے کہ کوئی شخص حرام ذرائع سے اس کی آب یاری کرے۔ وہ انسان جو ایک طرف دین کے بتائے ہوئے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرے اور دوسری طرف اتباعِ دین اور اقامتِ دین کے مناقب بیان کرے، وہ یا تو بہت بڑا نادان ہے یا بہت بڑا منافق۔ کیوں کہ غلط طریقوں سے دین کو فائدہ پہنچنے کی کوئی توقع تو نہیں، البتہ اس کا نقصان یقینی ہے۔ اس لیے یہ راستہ وہی شخص اختیار کرسکتا ہے جو اپنی عقل کھو چکا ہویا جو اللہ کے دین کا شعوری یا غیر شعوری طور پر دشمن اور بدخواہ ہو۔ اگر آپ سود کی آمدنی سے تبلیغِ دین کا ادارہ قائم کرتے ہیں تو اس سے دین کی دعوت کبھی نہیں پھیلے گی، البتہ دین رسوا ضرور ہوگا۔ وہ لوگ کتنے بدنصیب ہیں جو اللہ کے دین کی خدمت اور اس کو خوش کرنے کے ارادے سے اٹھیں اور راستہ وہ اختیار کریں، جس سے دین کو نقصان پہنچے اور شیطان مسرت کے شادیانے بجانے لگے۔

مزاجِ دین کی رعایت کرے

اسلام کی دعوت کے سلسلے میں انسان کو نہ صرف یہ کہ اس کے بتائے ہوئے حدود کا پابند رہنا چاہیے بلکہ اس کے مزاج کی بھی رعایت کرنی چاہیے۔ اسلام کا ایک خاص مزاج ہے۔ اس مزاج سے بہت سی چیزیں مناسبت رکھتی ہیں اور بہت سی چیزیں مناسبت نہیں رکھتیں۔ داعی کو وہی چیزیں اختیار کرنی چاہئیں جو اس کے مزاج سے ہم آہنگ ہوں اور جو چیزیں اس سے میل نہ کھاتی ہوں ان سے اس کو احتراز کرنا چاہیے۔ اسلام جن طریقوں کو ناپسند کرتا ہے اگر ان طریقوں سے اس کی دعوت دی جائے تو کبھی اس کی عظمت محسوس نہیں ہوگی اور وہ لوگوں کی نظر میں اتنا ہلکا اور بے وزن ہوجائے گا کہ کوئی شخص اس کی طرف التفات نہیں کرے گا۔ اگر کوئی شخص ان طریقوں سے اسلام کے قریب ہو بھی جائے تو وہ اپنے عمل میں صرف یہی نہیں کہ اس کے مزاج کی پروانہیں کرے گا بلکہ اس کے حدود کو بھی پامال کرے گا۔ جب تک داعیِ دین ان

تمام راستوں کو چھوڑ نہ دے جو مزاجِ دین پر بار ہیں۔ انسانوں پر اس کی اہمیت ظاہر نہیں ہوسکتی۔ اس کی اہمیت اسی وقت ظاہر ہوگی جب کہ اسے اس طرح پھیلایا جائے کہ کہیں اس کے مزاج کو صدمہ نہ پہنچے۔

لوگوں کی آمادگی کا خیال رکھے

داعی کو چاہیے کہ دعوت کو پیش کرنے میں لوگوں کی ذہنی آمادگی کا خیال رکھے۔ ان کے سامنے اس وقت دعوت پیش کرے جب کہ وہ کھلے دل و دماغ کے ساتھ اس کو سن سکتے ہوں اور غور وفکر کے لیے آمادہ ہوں۔ ایسے وقت میں ان کے پاس اپنی دعوت لے کر نہ پہنچ جائے جب کہ وہ اس کو سننے تک کے لیے تیار نہ ہوں۔ اللہ کے دین کے سوا کوئی ذریعہ اس دنیا میں ایسا نہیں ہے، جس سے انسان کو سکون اور چین نصیب ہو، جو شخص اللہ کے دین سے محروم ہے اس کی زندگی میں ایسے بہت سے مواقع آتے ہیں جب کہ اس کو اس بات کا شدید احساس ہوتا ہے کہ وہ جن ذرائع سے سکون اور چین حاصل کرنا چاہتا ہے وہ سب کے سب سخت کم زور اور ناقابل اعتبار ہیں۔ ان مواقع پر داعی کو چاہیے کہ پوری قوت اور انتہائی حکمت کے ساتھ اپنا پیغام پہنچائے۔ یہ مواقع داعی کی خاص محنت کے ہیں اور اس میں مخاطب کے دین کی طرف متوجہ ہونے اور اسے قبول کرنے کا زیادہ امکان ہے۔

جس طرح افراد کی زندگیوں میں ایسے مواقع اور حالات پیش آتے ہیں، جب کہ وہ دین کی دعوت کو کان لگا کر سن سکتے ہیں، ٹھیک اسی طرح اللہ تعالیٰ سے غافل قومیں اور جماعتیں بھی ایسے حالات سے دوچار ہوتی ہیں، جب کہ وہ دین کی دعوت سن سکتی ہیں۔ ان حالات سے فائدہ نہ اٹھانا بہت بڑی غلطی ہے۔ داعی کو کبھی ان مواقع کو ضائع نہیں کرنا چاہیے بلکہ ہمیشہ ان کی تلاش میں رہنا چاہیے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ دور نے اس کے زیادہ مواقع فراہم کردیے ہیں۔ آج ہزار مادّی ترقی کے باوجود

قومی اور بین الاقوامی سطح پر ایک طرح کا اضطراب اور بے چینی پائی جاتی ہے۔ آپ بتا سکتے ہیں کہ اسے اسلام ہی کے ذریعے دور کیا جاسکتا ہے۔

کسی کو کافر اور گم راہ کہنے سے احتراز کرے

داعی کو ایسے بے شمار لوگوں کے درمیان دین کا کام کرنا ہے، جو راہِ راست سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ وہ اگر ان کو گم راہ اور فاسق و فاجر کہے تو واقعہ کے لحاظ سے غلط نہ ہوگا، لیکن اس کے باوجود اس کو سوائے کسی ناگزیر دینی ضرورت کے انھیں کافر اور فاسق کہنے سے احتراز کرنا چاہیے۔ کیوں کہ یہ انسان کی فطرت ہے کہ اگر اس کو بے دین اور گم راہ کہا جائے تو وہ اسے اپنے اوپر بہت بڑا الزام سمجھتا ہے۔ اس لیے ڈر ہے کہ اسے گم راہ قرار دینے سے اس کی حمیتِ جاہلیت بھڑک اٹھے اور وہ اس کی بات سننے سے بالکل انکار ہی کردے۔

غرور اور تحکّم سے بچے

داعی کے اندر اپنے ہدایت یاب اور مصلح ہونے کا غرور نہیں ہونا چاہیے۔ یہ چیز اس کو اپنے مقصد میں ناکام بنادے گی۔ غرور اور نخوت ایسی اخلاقی گندگی ہے کہ دور دور تک فضا اس کی وجہ سے متعفن ہوجاتی ہے اور کوئی سلیم الطبع انسان متکبر شخص سے قریب ہونا پسند نہیں کرتا۔ داعی کو یہ نہیں خیال کرنا چاہیے کہ وہ لوگوں کی اصلاح کرکے ان پر کوئی احسان کر رہا ہے، بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ اپنا ایک فرض ادا کر رہا ہے۔ اس دنیا میں بہت سے انسان راہِ راست سے بھٹکے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے دین سے غافل ہیں۔ اس حالت میں جس شخص کو اللہ نے یہ مقام بخشا ہے کہ وہ ان کو اس کے دین کی طرف بلائے، اس پر اس کا بہت بڑا احسان ہے۔ اگر وہ صحیح معنی میں اس عظیم احسان کا احساس کرسکے تو اس کا سر غرور سے اونچا نہیں ہوگا بلکہ جذبۂ شکر سے اللہ تعالیٰ کے سامنے جھک جائے گا۔

داعی کے اندازِ تخاطب میں تحکم نہیں ہونا چاہیے۔ کیوں کہ یہ انداز ان لوگوں کا ہے، جو دوسروں کو اپنا محکوم سمجھتے ہیں۔ داعی اس لیے نہیں اٹھتا کہ دوسروں کو اپنا غلام بنائے اور ان پر حکومت کرے بلکہ وہ یہ بتانے کے لیے میدان میں آتا ہے کہ تمام انسان اللہِ واحد کے بندے ہیں اور سب کو اسی کی بندگی کرنی چاہیے۔ وہ کسی کو کم تر سمجھ کر اس کے ساتھ معاملہ نہیں کرتا بلکہ اس کو اپنا بگڑا ہوا بھائی سمجھ کر اس کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے۔ کسی شخص کا اللہ کے دین کو قبول کرنا داعی کے لیے دنیا اور اس کے تمام ساز وسامان سے بڑی دولت ہے۔ یہ دولت ہر اس شخص کو نہیں ملتی جو دعوتِ دین کے لیے کھڑا ہوجائے بلکہ اس خوش نصیب انسان کو ملتی ہے، جس کے کلام میں خلوص اور دل سوزی ہو، جس کی زبان محبت کی زبان ہو اور جس کی گفتگو یہ بتا رہی ہو کہ وہ لوگوں کی غلط روی سے دل گرفتہ ہے اور ان کی اصلاح چاہتا ہے۔

با اخلاق رہے

داعی کو مخاطب کے ساتھ ایسا رویہ نہیں اختیار کرنا چاہیے کہ وہ اسے دیکھتے ہی بھاگ کھڑا ہو یا اس کی مخالفت شروع کردے۔ بلکہ داعی کا اخلاق اتنا اونچا ہو کہ لوگ اس کی طرف کھنچیں اور اس کی بات سننے کے لیے تیار ہوں۔ جو لوگ بالعموم اسلام کے خادم سمجھے جاتے ہیں ان کی بدخلقی اور تنگ مزاجی معروف ہے، حالاں کہ سب سے زیادہ ان ہی کو بااخلاق اور شائستہ ہونا چاہیے، کیوں کہ تہذیب اور اخلاق کے بغیر تو اسلام کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ داعی معاشرے کے اندر جن برائیوں کو دیکھے ان کو مٹانے کے لیے وہ بے تاب رہے، لیکن برے انسانوں کو نفرت اور حقارت سے نہ دیکھے۔ وہ ان منکرات سے تو دامن کش رہے جو اس کے گردو پیش پھیلے ہوئے ہیں، لیکن ان کا ارتکاب کرنے والوں کو حقیر اور ذلیل نہ سمجھے اور ان سے قطع تعلق نہ کرلے۔ کیوں کہ جو لوگ بگڑے ہوئے انسانوں کی اصلاح کے لیے اٹھیں وہ اگر ان سے دوری ہی میں عافیت سمجھیں تو ان کی اصلاح کی کوئی صورت نہ ہوگی اور وہ گناہوں میں مزید ملوث ہوتے

چلے جائیں گے۔ داعیِ دین کو یہ حقیقت نہیں بھولنی چاہیے کہ جب فساد معاشرے کی رگ رگ میں سرایت کر چکا ہو اور نیکی اور تقویٰ کی طرف رجحان نہ ہو تو بدی کی راہ اختیار کرنے میں انسان خود کو ایک طرح سے معذور سمجھنے لگتا ہے۔ وہ داعی کی طنز و تعریض، غم و غصہ اور تحقیر کا نہیں بلکہ ہم دردی کا مستحق ہے۔ اگر آپ کسی کی غلط روی پر طنز کریں اور اس کا مذاق اڑائیں تو ڈر ہے کہ اس کے جذبات مشتعل ہوں اور وہ اپنی روش پر اصرار کرنے لگے۔ داعی کو ہمیشہ اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ اس کے لہجے کی تلخی مخاطب کو کہیں دین سے دور نہ کر دے اور وہ ایک نیک مقصد میں محض اپنے بے ڈھنگے پن کی وجہ سے ناکام نہ ہو جائے۔

جلد بازی نہ کرے

اس سلسلے کی آخری لیکن اہم بات یہ ہے کہ داعی کو جلد باز نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ جلد باز انسان دعوت کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ ایسی سعید روحیں کم ہوتی ہیں جو فوراً اصلاح قبول کر لیتی ہیں ورنہ بعض اوقات اس کوشش میں داعی کی عمر ختم ہو جاتی ہے اور لوگوں میں کوئی بڑی تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔ داعی اگر یہ چاہے کہ اس کی سعی و جہد کے نتائج جلد ظاہر ہوں تو اسے مایوسی ہوگی اور وہ دعوت کا کام چھوڑ بیٹھے گا۔ داعی کو پورے صبر کے ساتھ اور مسلسل اللہ کے دین کی طرف بلاتے رہنا ہوگا یہاں تک کہ ہر طرف اس کا دین چھا جائے یا اسی جدوجہد میں داعی کی جان چلی جائے۔

داعی کامیاب ہے

کامیابی کے دو معیار

کسی داعی کی کامیابی و ناکامی کو جانچنے کے دو معیار ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس کی دعوت کیا ہے اور وہ کس نظریہ کی طرف لوگوں کو بلا رہا ہے؟ یہ نظریہ جتنا پاکیزہ اور جتنا ارفع و اعلیٰ ہو، اس کے پیش کرنے والے کو اتنا ہی کامیاب قرار دیا جائے۔ اس دنیا میں کچھ لوگ فاسد نظریات کے علم بردار ہوتے ہیں۔ یہ سب سے زیادہ ناکام انسان ہیں، کیوں کہ وہ اپنے آپ کو بھی اور دوسروں کو بھی تباہ کرتے ہیں۔ کچھ لوگ انسان کی جزوی اصلاح چاہتے ہیں اور ان کی تگ ودو اس کی چھوٹی چھوٹی بھلائیوں کے لیے ہوتی ہے۔ ان کے مقابلے میں بعض دوسرے لوگ ہر پہلو سے انسان کی فلاح کے طالب ہوتے ہیں اور اس کو اوپر اٹھانا چاہتے ہیں۔ یہ دونوں قسم کے افراد گو کہ نوعِ انسانی کے خیر خواہ ہیں، لیکن دونوں کی حیثیتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پہلا گروہ ظاہر ہے اس عظمت اور کام رانی کا حق دار نہ ہوگا، جس کا حق دار دوسرا گروہ ہوسکتا ہے۔

دوسرا معیار جس سے داعی کی کامیابی و ناکامی کو جانچا جاسکتا ہے، یہ ہے کہ اس کے نظریہ اور دعوت سے دنیا کو کتنا فائدہ پہنچا۔ اس نے جو چشمہ جاری کیا اس سے پیاس بجھانے والوں کی تعداد کیا تھی اور اس کے لگائے ہوئے درخت کے سایے میں کتنے مسافروں نے آرام کیا؟ لیکن یہ اس کی کامیابی اور ناکامی کو جانچنے کا حقیقی معیار نہیں

بلکہ ایک اضافی معیار ہے۔ وہ انسان یقیناً کامیاب ہے جو اللہ کی سرزمین پر حق و صداقت کی گواہی دے رہا ہے۔ اگر اس کی کوشش سے کسی کو قبولِ حق کی توفیق نصیب ہو تو یہ اس کی کامیابی کا ایک ظاہری ثبوت ہوگا، لیکن اگر کوئی ایک شخص بھی اس کا ساتھ نہ دے اور ساری دنیا اس کی جدوجہد کے باوجود حق و صداقت کا انکار کردے تو اس سے اس کی عظمت کم نہ ہوگی اور اس کی کامیابی میں کوئی فرق نہ آئے گا۔

اسلام کے پاس نوعِ انسانی کے لیے صحیح ترین نظریات موجود ہیں اور وہ پوری زندگی کے لیے اتنا متوازن نظام پیش کرتا ہے کہ اس کی تمام ناہمواریاں ختم ہو جاتی ہیں، اس لیے جو شخص اسلام کی دعوت لے کر اٹھے اسے ہم کبھی ناکام نہیں کہہ سکتے۔ اس کی کامیابی کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ وہ اسلام کی طرف دعوت دے رہا ہے۔ اگر کوئی فرد یا گروہ اسلام کی راہ سے انحراف کرتا ہے تو وہ خود ناکام ہے اس کا داعی ناکام نہیں ہے۔

داعی کا فرض

داعی کی کامیابی کا تعلق ہرگز اس بات سے نہیں ہے کہ اس کی کوشش کے کیا نتائج نکلے؟ بلکہ اس بات سے ہے کہ اس نے اپنی ذمے داری پوری کی یا نہیں؟ اسلام کو قبول کرنے کے بعد انسان پر اس کی دعوت فرض ہو جاتی ہے۔ اس فرض کا انجام دینا اپنی استطاعت کی حد تک اس کے لیے ضروری ہے، خواہ دنیا اس کو قبول کرے یا رد کردے، خواہ اس کے نتیجے میں وہ غالب ہو یا اس کے غلبہ کے امکانات بہ ظاہر نظر نہ آرہے ہوں۔ جس وقت کسی شخص کو اللہ کا دین ملے اسی وقت اس پر یہ ذمے داری عائد ہو جاتی ہے کہ اسے وہ دوسروں تک پہنچائے۔ یہ ذمے داری محض اس وجہ سے ساقط نہیں ہوتی کہ لوگ اللہ کے دین کے مخالف ہیں اور اس کی بات سننا نہیں چاہتے۔ حق کے پہنچانے کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ سننے والا فوراً اس پر ایمان لے آئے بلکہ اتنی بات کافی ہے کہ انسان کے پاس حق ہے اور دنیا اس سے غافل اور منحرف ہے۔ اس دنیا میں جو لوگ

اللہ تعالیٰ کو بھولے ہوئے اور اس کے دین سے بے خبر ہیں وہ اس بات کے محتاج ہیں کہ ان تک اس کا دین پہنچایا جائے۔ اس کے بعد یہ ان کی مرضی ہے کہ چاہے اس کی اطاعت اختیار کریں یا اس سے بغاوت پر قائم رہیں۔

وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ⑳

اگر وہ منہ پھیرتے ہیں تو پھیرنے دو۔ تمھارا کام بس اس قدر ہے کہ حق ان تک پہنچا دو اور اللہ خود ہی اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے۔

(آل عمران: ۲۰)

اسلام کی دعوت کا حق صحیح معنی میں اسی وقت ادا ہوسکتا ہے جب کہ داعی اسے اپنا فرض سمجھ کر انجام دے اور نتیجے سے بالکل بے نیاز ہو۔ وہ اس کام میں لگا رہے اور مسلسل لگا رہے، قطع نظر اس سے کہ حالات سازگار ہیں یا ناسازگار، دنیا کی طرف سے اس کا استقبال ہوتا ہے یا اس کی مخالفت کی جاتی ہے۔ اگر وہ اس شرط کے ساتھ یہ فرض انجام دینا چاہتا ہے کہ دنیا کی طرف سے خوش آمدید کہا جائے تو کبھی اس کا حق ادا نہ ہوسکے گا۔ اس دنیا میں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو دیکھتے ہیں۔ جو لوگ دوسروں کو دیکھ کر اپنے بارے میں فیصلہ کریں وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ یہاں اس شخص کی قسمت میں محرومی لکھ دی گئی ہے جو دوسروں کی غفلت کو اپنی بے عملی کا بہانہ بنائے اور اپنے فرائض کو بھول جائے۔ دنیا اگر اسلام کا ساتھ نہ دے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کے ماننے والے اس کی دعوت ہی چھوڑ بیٹھیں۔ ان کے مخاطبین اگر اپنا فرض نہیں پہچان رہے ہیں تو ان کو یہ حق کہاں سے حاصل ہوگیا کہ وہ اپنا فرض پورا کرنے میں کوتاہی کریں۔ حالات کتنے ہی نازک کیوں نہ ہوں، اسلام کے علم بردار ایک لمحہ کے لیے اس فرض سے غفلت نہیں برت سکتے اور جب تک اس کی قبولیت کے امکانات ختم نہ ہوجائیں اسے ترک کرنے کی انھیں اجازت نہیں ہے، خواہ ان کی مخالفت میں باطل کی تمام قوتیں ٹوٹ پڑیں اور ان کی مظلومیت پر ہم دردی کا ایک کلمہ کہنے والا بھی کوئی نہ ہو۔

اس میں شک نہیں کہ آج ہر طرف دہریت اور الحاد کی حکومت ہے۔ جدھر دیکھئے خدا بے زاری چھائی ہوئی ہے اور دنیا خدا کو بھول چکی ہے۔ رسمی دین داری تو کہیں کہیں نظر آتی ہے لیکن حقیقی دین داری مفقود ہے۔ اللہ کا نام لینے سے اچھے اچھے گھبراتے ہیں۔ جب کوئی شخص اس کے دین کا ذکر کرتا ہے تو اپنے ماحول میں اجنبی بن جاتا ہے۔ اس کی باتیں دنیا والوں کو نرالی معلوم ہوتی ہیں۔ وہ اس کو اپنے دور کا آدمی نہیں سمجھتے۔ اپنی دین داری کی وجہ سے وہ ان کو وقت کی رفتار سے بہت پیچھے معلوم ہوتا ہے۔ بلاشبہ یہ سب کچھ صحیح ہے، لیکن اس کی وجہ سے کسی داعیِ دین کی ذمے داری ختم نہیں ہوجاتی۔ اس کو ان ہی تاریک حالات میں اپنا فرض انجام دینا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ اس مخالف ماحول میں اس کی باتیں سننے کے لیے کس کا دل کھلا ہوا ہے، کون اس کی پکار پر لبیک کہنے کے لیے تیار ہے اور کس کے اندر قبولِ حق کی صلاحیت موجود ہے؟ اگر یہ صالح نفوس اس کی غفلت کی وجہ سے حق سے محروم ہوگئے تو کل قیامت کے دن اس پر یہ الزام عائد ہوگا کہ اس نے اپنا فرض ادا کرنے میں کوتاہی کی اور وہ اپنی کوتاہی کی جواب دہی نہ کرسکے گا۔ دنیا دوست اور دشمن کو چہرہ دیکھ کر پہچان لیتی ہے۔ لیکن اللہ کے دین کی دعوت دینے والا ایسے دوستوں کی تلاش میں نکلتا ہے، جن کے چہروں پر دوستی کی کوئی علامت نہیں ہے۔ اگر وہ شب و روز اپنے کام میں لگا رہے تو اس کو وہ افراد ملیں گے جن کو وہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس طرح کے چند افراد کا بھی ملنا اس کے لیے دنیا کی ساری نعمتوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ وہ انسانیت کے لعل و جواہر ہیں جو اس کے ہاتھ لگ گئے ہیں۔ رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت علیؓ کو نصیحت فرمائی اور یہی نصیحت ہر داعیِ حق کے لیے ہے۔

فَوَ اللّٰهِ لَاَنْ يَّهْدِيَ اللّٰهُ بِکَ رَجُلًا وَاحِدًا خَيْرٌ لَّکَ مِنْ اَنْ يَّکُوْنَ لَکَ حُمُرُ النَّعَمِ[1]

اللہ کی قسم اگر تمھارے ذریعے اللہ تعالیٰ کسی ایک شخص کو بھی راہ دکھادے تو یہ تمھارے حق میں سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الجھاد والسیر

داعی کامیاب ہے

اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ انسانوں پر اس کا دین واضح ہوجائے، تاکہ دلیل کی دنیا میں اس سے بغاوت کی کوئی معقول وجہ باقی نہ رہے۔ اسی کی ذمے داری اس نے اس دین کے ماننے والوں پر ڈالی ہے۔ اگر انھوں نے دین کی طرف دعوت دینے میں کوتاہی نہیں کی اور اپنی حد تک اس کو واضح کر دیا تو اپنے فرض سے بالکل سبک دوش ہوگئے۔ اب وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بری الذّمہ ہیں، خواہ دنیا کا ایک بھی انسان اس کا ساتھ نہ دے اور سب کے سب اس کی دعوت کا انکار کردیں۔ کسی داعیِ دین سے اللہ کے ہاں یہ سوال ہرگز نہ ہوگا کہ اس نے کتنے انسانوں کے ذہن بدلے اور کس کس کو مومن و مسلم بنایا۔ دعوت دینے والے کی کامیابی قطعاً اس کی محتاج نہیں ہے کہ کوئی اس پر ایمان بھی لے آئے، بلکہ اس کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ اس نے دعوت کو پیش کرنے میں اپنی پوری قوت صرف کردی۔ اللہ تعالیٰ کا مطالبہ اس کے دین کے ماننے والوں سے صرف ان ہی چیزوں کے بارے میں ہے جو ان کے اختیار میں ہیں، جو چیز ان کے اختیار میں نہیں ہے اس کا ان سے ہرگز مطالبہ نہیں ہے۔ ان کو اپنی ذات پر اختیار ہے وہ اس کو اللہ کے حکم کے مطابق بدل سکتے ہیں لہٰذا اسے بدل دیں، اس کی رضا کی طلب میں وہ اپنے آپ کو کھپا سکتے ہیں، لہٰذا کھپا دیں، ان کے پاس جو دل و دماغ ہے، جو مال و دولت ہے اور فکر و عمل کی جو قوت ہے اسے اللہ کی راہ میں صرف کرسکتے ہیں لہٰذا اسے صرف کریں۔ اگر اس میں انھوں نے کوتاہی کی تو یقیناً ان سے باز پرس ہوگی۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں ان کو عطا کی تھیں ان کو انھوں نے اس کی راہ میں خرچ کرنے سے دریغ کیا۔ لیکن جس چیز کے وہ مالک ہی نہیں ہیں اسے وہ نہ دے سکتے ہیں اور نہ اس کے بارے میں ان سے کوئی سوال ہوگا۔ ایک اپنی ذات کے سوا ان کے بس میں نہیں ہے کہ کسی کو بدل دیں، اس لیے اس کی ذمے داری بھی ان پر نہیں ڈالی گئی ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (البقرۃ:۲۷۲)
تم پر ان کی ہدایت کی ذمے داری نہیں ہے۔ البتہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

اسلام کے ماننے والوں پر اس کی دعوت فرض ہے، لوگوں کو مومن و مسلم بنانا فرض نہیں ہے۔ ان کا کام دعوت و تبلیغ ہے۔ اگر انھوں نے حق تبلیغ ادا کر دیا تو اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے۔ کیوں کہ انھوں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ ان کی دعوت کو سننے کے بعد مخاطب اسے رد کر دیتا ہے تو یہ اس کا اپنا قصور ہے۔ وہ اس کے بارے میں اللہ کے ہاں ہرگز جواب دہ نہ ہوں گے۔ ہمارے سامنے پیغمبروں کی مثال ہے۔ اگر داعیِ حق کی کامیابی کا پیمانہ یہ ہے کہ مخاطب اس کی دعوت کو قبول کر لے تو بہت سے پیغمبر آپ کو ناکام نظر آئیں گے۔ وہ انتہائی دل سوزی اور خیر خواہی کے ساتھ زندگی بھر دین کی طرف بلاتے رہے لیکن اس کے باوجود ایسا بہت ہوا ہے کہ وہ اپنے قریب ترین افراد کو بھی نہیں بدل سکے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغی جدوجہد ساڑھے نو سو سال جاری رہی لیکن ان کا اپنا لڑکا 'غیر صالح' ہی رہا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوتِ اخلاص اپنے باپ کو 'اتباعِ حق' پر آمادہ نہ کرسکی، بالآخر ان کو 'سلام علیک' کہہ کر باپ سے کنارہ کش ہونا پڑا۔ حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی بیوی پر تبلیغ کی، لیکن یہ تبلیغ اس کے حق میں بے سود ثابت ہوئی اور اللہ کا عذاب آیا تو اس فیصلے کے ساتھ آیا کہ

اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَ اَهْلَكَ اِلَّا امْرَاَتَكَ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۳۳﴾ (العنکبوت:۳۳)
ہم تم کو اور تمھارے گھر والوں کو بچالیں گے سوائے تمھاری بیوی کے، جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے۔

آخری رسول محمد ﷺ کی دعوت کے ساتھ آپؐ کے چچا ابو طالب کے رویہ کو دیکھیے کہ ایک طرف وہ آپ ﷺ کو اپنی اولاد سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں، آپ ﷺ کی خاطر ہر طرح کی تکلیف برداشت کرتے ہیں اور دنیا سے لڑ جاتے ہیں، پہاڑ کی گھاٹی میں قید ہونا پسند کرتے ہیں لیکن اپنے بیٹے محمد (ﷺ) کو دشمن کے حوالے کرنا نہیں چاہتے۔ دوسری

طرف حضور ﷺ کی دعوتی جدوجہد پر دس سال کی مدت گزر جاتی ہے اور وہ اس کا ساتھ نہیں دیتے، حتّٰی کہ جس وقت ابو طالب بسترِ مرگ پر تھے، آپؐ ان کے قریب تشریف لے گئے اور فرمایا:

ای عم قل لَا الٰہ الّا اللّٰہ کلمۃ احاجّ لک بھا عند اللّٰہِ[1]	چچا جان! کہہ دیجیے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اس کلمہ کی بنیاد پر میں اللہ کے ہاں آپ کی نجات کی کوشش کروں گا۔

یہ وہ جملہ تھا جس سے دل کو پگھل جانا چاہیے تھا، لیکن ابو طالب نے اسے قبول نہیں کیا اور دینِ آباء پر جان دینا پسند کیا۔ یہی نہیں پیغمبروں کی تاریخ میں، رسولِ خدا ﷺ فرماتے ہیں کہ ایک وہ پیغمبر بھی گزرے ہیں، جن کا صرف ایک شخص نے ساتھ دیا اور ان کی اتباع کی۔[2] اس کے باوجود کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ناکام تھے؟ ہرگز نہیں! انھوں نے دین کی راہ میں اپنی پوری قوت صرف کی اور حقِ تبلیغ ادا کر دیا، اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں پورے اجر کے مستحق ہو گئے۔

بعض لوگوں میں دعوت کا بڑا جوش ہوتا ہے، لیکن وہ اپنی صحیح حیثیت نہیں سمجھتے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے دین کے محض داعی ہیں، لیکن اپنے آپ کو دوسروں کی ہدایت کا ذمے دار تصور کرتے ہیں۔ یہ ایک بہت ہی خوف ناک اور مہلک غلطی ہے۔ ایسے لوگ زیادہ دیر تک اپنی دعوتی جدوجہد جاری نہیں رکھ سکتے اور بہت جلد ان پر مایوسی چھا جاتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک شخص پورے خلوص کے ساتھ کارِ دعوت کا آغاز کرتا ہے، لیکن جب دیکھتا ہے کہ مدتِ دراز کی کوشش کے باوجود مخاطب کا سینہ اس کی دعوت کے لیے کھل نہیں رہا ہے، حق کی وضاحت کے باوجود وہ اپنے انکار پر جما ہوا ہے، خیر خواہی کے جواب میں مخالفت پر کمر بستہ ہے، تو وہ سوچنے لگتا ہے کہ کیا میری مدت العمر کی کوشش رائیگاں جائے گی؟ کیا یہ دعوت کامیاب نہ ہوگی؟ کیا میں مخاطب کو اس کے موقف سے

---

[1] صحیح بخاری، کتاب مناقب الأنصار، و کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ التوبۃ

[2] صحیح مسلم، کتاب الأیمان، باب فی قول النبیؐ انا اول الناس یشفع فی الجنۃ...الخ

نہ ہٹاسکوں گا؟ یہ احساس اس کی کمر توڑ دیتا ہے اور وہ ہمت ہار کر بیٹھ جاتا ہے۔ ایک بہترین آغاز کا یہ مایوس کن انجام محض اس لیے پیش آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے صرف اس بات کا حکم دیا تھا کہ وہ جس دین کو دینِ حق مان رہا ہے اسے دوسروں تک پہنچائے، لیکن اس نے اپنے آپ کو اس بات پر مامور سمجھ لیا کہ لوگوں کو اس کا متبع بنائے۔ حالاں کہ اس معاملہ میں اللہ کا قانون اس کی کتاب میں صاف صاف بیان ہوا ہے۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ۚ

(اے پیغمبر) تم جسے چاہو راہِ ہدایت پر نہیں لگا سکتے۔ البتہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ (القصص:۵۶)

جو شخص اس وجہ سے دل شکستہ ہو جائے اور اپنی دعوتی جدوجہد ختم کردے کہ حق سنا نہیں جاتا اور دنیا اس کی طرف متوجہ نہیں ہے، اس سے یہی کہا جائے گا کہ تم نے ایک ایسا بوجھ اٹھا رکھا ہے، جس کے اٹھانے کا تمہارے پروردگار نے تمھیں حکم نہیں دیا ہے۔ تم ایک ایسے غم میں مبتلا ہو جس کا علاج تمھارے پاس نہیں ہے۔ یہ کام تمھارا نہیں ہے کہ لوگوں کو حق کی راہ پر لگادو، بلکہ یہ اس خدائے برتر کا ہے، جس کے ہاتھ میں ہدایت و ضلالت ہے۔ یہ کتنی بڑی نادانی ہے کہ جو کام اپنا ہے اسے تو انسان بھول جائے اور جو کام اللہ تعالیٰ کا ہے اسے اپنا سمجھ بیٹھے:

وَ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَیْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِیَ نَفَقًا فِی الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِی السَّمَآءِ فَتَاْتِیَهُمْ بِاٰیَةٍ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ ﴿۳۵﴾

اور اگر ان کا حق سے اعراض کرنا تم پر شاق گزر رہا ہے تو تم سے ہو سکے تو زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈ نکالو یا سیڑھی لگا کر آسمان پر پہنچ جاؤ اور ان کے پاس کوئی ایسی نشانی لے آؤ کہ وہ حق کا انکار نہ کرسکیں (یاد رکھو) اگر اللہ چاہتا تو ان کو ہدایت پر جمع کر دیتا۔ لہٰذا تم جاہل نہ بنو۔ (الانعام:۳۵)

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر شخص نے اپنی ایک راہ متعین کر رکھی ہے، جس پر وہ آنکھیں بند کر کے دوڑا چلا جا رہا ہے۔ وہ اس کی محبت میں اس قدر گرفتار ہے

کہ کسی قیمت پر اسے چھوڑنا نہیں چاہتا۔ لیکن اللہ کا دین ان باہمت نفوس کے حصہ میں آتا ہے جو غلطی واضح ہونے کے بعد اپنی روش بدل سکتے ہوں، جو باطل کے ساتھ چمٹے رہنے کا فیصلہ نہ کر چکے ہوں، بلکہ قبولِ حق کے لیے ہر آن آمادہ ہوں۔ حق اس شخص کو ملتا ہے جو حق کا طالب ہے۔ جس کے اندر حق کی پیاس ہی نہیں ہے اس کے لیے حق کی دعوت بے سود ہے۔ حق کی آواز اس کے کان کے پردوں سے ٹکرائے گی، لیکن اس کے دل میں نہیں اترے گی۔ یہاں تک کہ حق کا اُجالا چاروں طرف پھیل جائے گا، لیکن اس کی آنکھیں بند ہوں گی اور وہ اس کو دیکھ نہ سکے گا، دنیا حق پر چل رہی ہوگی، لیکن اس کے قدم بوجھل ہوں گے اور اس پر چلنا اس کے لیے دشوار ہوگا۔ حق کو پوری طرح سمجھنے کے بعد جو شخص اسے رد کردے اس کے لیے قبولِ حق کی راہیں بند ہو جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں قرآن کی ہدایت ہے کہ داعی اس طرح کے لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دے اور اپنے کام میں لگا رہے، ان کا انکار اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ خدانخواستہ غلطی پر ہے اور اس کو اپنی راہ بدل دینی چاہیے، بلکہ جب وہ دیکھ رہا ہے کہ حق اس کے ساتھ ہے اور لوگ محض ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے اس کی مخالفت کر رہے ہیں تو اس کے اس یقین میں اضافہ ہونا چاہیے کہ اس کا موقف صحیح ہے اور اس کے مخالفین کم زور مقام پر کھڑے ہیں۔ اس کے پاس دلائل کی قوت ہے اور وہ دلائل کے لحاظ سے تہی دست و بے مایہ ہیں۔ یہ کتنی بڑی دولت ہے، جو ایک داعی کو حاصل ہے اور جس سے اس کے حریف محروم ہیں:

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ ﴿۱۹﴾ وَ لَا الظُّلُمٰتُ وَ لَا النُّوْرُ ﴿۲۰﴾ وَ لَا الظِّلُّ وَ لَا الْحَرُوْرُ ﴿۲۱﴾ وَ مَا يَسْتَوِي الْأَحْيَآءُ وَ لَا الْأَمْوَاتُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ مَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴿۲۲﴾
(فاطر: ۱۹-۲۲)

اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہو سکتے، نہ تاریکی اور روشنی، نہ سایہ اور دھوپ اور نہ زندے اور مردے برابر ہو سکتے ہیں۔ بے شک اللہ جسے چاہتا ہے (اپنی بات) سناتا ہے اور تم ان کو نہیں سنا سکتے جو قبروں میں پڑے ہوئے ہیں۔

دعوت کی کامیابی اور داعی کی کامیابی کا فرق

بہت سے لوگ دعوت کی کامیابی اور داعی کی کامیابی میں فرق نہیں کرتے، حالاں کہ یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ داعی کی کامیابی کے لیے دعوت کی کامیابی ضروری نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ داعی اللہ کے دین کی طرف دعوت دیتے دیتے ختم ہوجائے اور معاشرہ کا کوئی ایک فرد بھی اس کا ساتھ نہ دے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ نظامِ باطل کو ختم کرکے اللہ تعالیٰ کی زمین پر اس کی حکومت قائم کردے۔ وہ ہر حال میں فلاح یاب ہے۔ اس کی کامیابی قطعاً اس بات پر موقوف نہیں ہے کہ حق عملاً غالب اور باطل مغلوب ہوجائے۔ کیوں کہ اس کا تعلق داعی سے نہیں، بلکہ اس بات سے ہے کہ جن لوگوں کو دعوت دی جا رہی ہے وہ اس کے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہیں؟ اگر وہ حق کو قبول کرتے ہیں تو حق غالب ہوگا اور رد کرتے ہیں تو اسے غلبہ حاصل نہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ایک ایسا واقعہ جس کا تعلق داعی کی ذات سے نہیں ہے وہ اپنی کامیابی کے لیے اس کا محتاج نہیں ہوسکتا۔ داعی کے پیغام کو اگر ساری دنیا مل کر بالاتفاق رد کردے تو بھی اس پر یہ جرم ہرگز عائد نہ ہوگا کہ تمھاری بات کیوں رد کردی گئی؟ کیوں کہ یہ داعی کی کوتاہی نہیں بلکہ اس کے مخاطبین کی کوتاہی ہے اور اللہ کے دربار میں کوئی بھی شخص کسی دوسرے کے جرم میں پکڑا نہیں جاتا۔

حق کی دعوت جب کبھی اٹھے تو ضروری نہیں کہ دنیا سے لازماً باطل کا خاتمہ ہوجائے اور حق کی حکومت قائم ہوجائے۔ یہاں حق کو مظلوم بھی دیکھا گیا ہے اور اسے فتح و کام رانی بھی حاصل ہوئی ہے۔ لیکن داعیِ حق ہمیشہ کامیاب رہتا ہے۔ وہ کبھی ناکام نہیں ہوتا۔ دعوت کی کامیابی یہ ہے کہ مخالف قوتیں اس کی راہ سے ہٹ جائیں اور وہ دنیا پر چھا جائے۔ لیکن داعی کی کامیابی یہ ہے کہ وہ دعوت کے لیے اپنا سب کچھ لگا دے۔ داعی کی سب سے بڑی تمنا یہ ہوگی کہ حق غالب اور باطل مغلوب ہو، اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق تمام معاملات کے فیصلے ہوں اور دنیا کی جھوٹی عدالتیں ختم ہوں، وہ اس وقت

تک چین سے نہیں بیٹھے گا جب تک کہ اللہ کا دین تمام دینوں پر غالب نہ آجائے اور ہر طرف اسی کی حکومت نہ ہونے لگے۔ داعی اگر اس کوشش میں اپنے آپ کو فنا کردے تو اس کی کامیابی میں کوئی شبہ نہیں ہے، خواہ اس کی کوشش کے نتیجے میں دعوت غالب ہو یا نہ ہو۔ داعی کو اپنی دعوت کی راہ میں مختلف مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ کبھی دوسروں تک دعوت پہنچاتا ہے، کبھی مخالفین کے ظلم سہتا ہے، کبھی حق پرستوں کی تنظیم کرتا ہے اور کبھی فتح و نصرت کا تخت بچھاتا ہے۔ دعوت کے اس آخری مرحلے کے آنے سے پہلے داعی اگر ختم ہوجائے تو یقیناً دعوت کا کام ابھی باقی ہے، لیکن داعی کا کام ختم ہوگیا۔ دعوت کے جس مرحلے میں اس نے جان دی وہی اس کی منزل ہے۔ اس کا ہر مرحلہ کامیابی کا مرحلہ ہے۔ وہ جہاں بھی مارا جائے کامیاب ہے۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَ مَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾

(الاحزاب:۲۳)

ایمان والوں میں کتنے مرد ایسے ہیں جنھوں نے اپنے اس عہد کو سچا کر دکھایا جو اللہ سے کیا تھا۔ ان میں سے بعض اپنا عہد پورا کر چکے اور بعض انتظار کر رہے ہیں، اور وہ اپنے اس عہد سے بالکل نہیں بدلے۔

قرآن کہتا ہے کہ حق کو غالب اور باطل کو مغلوب کرنا تمھارے اختیار میں نہیں ہے بلکہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے اسے اللہ ہی کے حوالے کرو۔ وہ جب چاہے گا اپنے دین کو سربلند کرے گا، لیکن نتائج سے مایوس ہوکر تم اپنی جدوجہد نہ چھوڑو کہ یہ تمھاری سب سے بڑی ناکامی ہوگی:

وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ ﴿۴۰﴾

(الرعد:۴۰)

جس (عذاب) کا ہم ان سے وعدہ کر رہے ہیں اس کا کچھ حصہ یا تو ہم تم کو (اسی زندگی میں) دکھا دیں گے یا (اس کے آنے سے پہلے) تم کو اس دنیا سے اٹھالیں گے (تم اس کی فکر نہ کرو) تمھارا کام تو بس اللہ کے دین کو پہنچانا ہے اور ہمارا کام حساب لینا ہے۔

دعوت کے اثرات

انسان فطری طور پر اس دنیا میں اپنے عمل کے نتائج دیکھنا چاہتا ہے۔ نتائج سے بے نیاز ہوکر کسی کام کو جاری رکھنا اور مسلسل جاری رکھنا اس کے لیے آسان نہیں ہے۔ لیکن اگر ہم نتائج کو سیاسی غلبہ سے الگ کر کے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ جو شخص خلوص کے ساتھ اللہ کے دین کی دعوت لے کر اٹھے، وہ اس کو غالب نہ بھی کر سکے تو اس کی آواز جہاں تک پہنچتی ہے، کسی نہ کسی درجے میں اپنے اثرات لازماً چھوڑ جاتی ہے۔ تاریخ میں ایسے کتنے افراد گزر چکے ہیں جنھوں نے صداقت، اخلاص، امانت، خدا ترسی اور تقویٰ و طہارت کی دعوت دی۔ ان کی اس دعوت سے کوئی سیاسی انقلاب تو نہیں آیا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کی تعلیمات ان کے مخالفین تک کی زندگیوں میں دبے پاؤں داخل ہوگئیں اور وہ اپنے بہت سے معاملات میں ان ہی کے بتائے ہوئے اقدار کے تحت سوچنے پر مجبور ہوگئے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب کوئی جان دار دعوت اٹھتی ہے تو اس کے اثرات سے ماحول کا آزاد رہنا مشکل ہے۔ بعض اوقات یہ اثرات ٹھوس اور مادّی شکل میں ہمارے سامنے نہیں ہوتے، لیکن وہ انسان کی رگوں میں خون بن کر اس طرح دوڑنے لگتے ہیں کہ اسے خبر تک نہیں ہوتی۔ وہ اس کے جذبات و احساسات میں شامل ہوجاتے ہیں اور وہ محسوس بھی نہیں کر پاتا۔

انکارِ دین کے اسباب[۱]

اللہ تعالیٰ نے اپنا دین واضح کر دیا ہے۔ جو شخص بھی سنجیدگی سے اس پر غور کرے گا اس کو حق پائے گا، لیکن اس کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ کبھی تمام انسانوں نے اسے قبول نہیں کیا۔ ہر دور میں بے شمار انسان اس کا انکار کرنے والے پائے گئے اور آج بھی اس کے منکرین اکثریت میں ہیں۔ قرآن نے اس کے اسباب کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ جو شخص دعوتِ دین کا کام کرنا چاہے، اس کے لیے ان اسباب کا جاننا متعدد پہلوؤں سے مفید ہے۔

(۱) اس سے معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے دین کا انکار کیوں کیا جاتا ہے اور اس کا علاج کیا ہے؟ ہم نے اسباب کا صرف اصولی تجزیہ کیا ہے، لیکن ان کا انطباق دشوار نہیں ہے۔ ان کی روشنی میں بہ آسانی یہ بات معلوم ہوسکتی ہے کہ کون شخص کن اسباب کے تحت دین کا انکار کر رہا ہے اور ان کو کیسے دور کیا جاسکتا ہے؟

(۲) بعض اوقات کسی نظریہ کی اتنی شدت سے مخالفت ہوتی ہے کہ اس کے ماننے والے بھی اپنی استقامت کھو بیٹھتے ہیں۔ داعیِ دین جب یہ دیکھے گا کہ اللہ تعالیٰ کا دین مضبوط دلائل پر قائم ہے اور اس کی مخالفت محض جذبات اور سطحی ذہن سے کی جا رہی

---

[۱] انسان جن اسباب کی بنا پر دین کا انکار کرتا ہے، ان میں سے بعض تو اس کی اپنی ذات میں موجود ہوتے ہیں اور بعض اس کے ماحول اور خارج کی دنیا میں۔ یہاں صرف پہلی قسم کے اسباب کا ذکر ہے۔ دوسری قسم کے اسباب سے ہم نے اپنی کتاب 'انسان اور اس کے مسائل' میں بحث کی ہے۔

ہے، تو اس کے ایمان میں اضافہ ہوگا اور وہ پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ اس کو مخاطب کے سامنے پیش کر سکے گا۔

(۳) انکارِ دین کے اسباب یہ بتاتے ہیں کہ دین کے سامنے آنے کے بعد انسان اس کو رد کیوں کرتا ہے؟ لیکن اس کے بین السطور جس شخص کا دین پر ایمان ہے وہ بھی اپنی خامیاں دیکھ سکتا ہے۔ ان کے مطالعے سے وہ سمجھ سکتا ہے کہ دین کو قبول کرنے کے باوجود وہ اس سے دور کیوں ہے، اس کے اندر وہ زبردست تبدیلی کیوں نہیں پیدا ہوتی جو اللہ تعالیٰ کا دین پیدا کرنا چاہتا ہے، وہ کون سی چیز ہے جو دین کی حقانیت کو ماننے کے باوجود اس کی اتباع سے اس کو روک رہی ہے؟ کیوں کہ اس کے اسباب بھی چھوٹے پیمانے پر وہی ہیں جو انکارِ دین کے اسباب ہیں۔ اس طرح اس تجزیہ کے اندر دین پر ایمان رکھنے والوں کی تربیت کا سامان بھی ہے۔ جو لوگ دین کی خدمت کے ارادے سے اٹھیں، دین کے ساتھ ان کا رویہ ان لوگوں کے رویہ سے یکسر مختلف ہونا چاہیے جو دین کے دشمن ہیں اور اسے مٹانا چاہتے ہیں۔ ورنہ وہ دین کے ترجمان اور داعی تو کیا بنیں گے دین کے حامل بھی نہیں قرار پا سکتے۔

یہ ان اسباب کے ضمنی فوائد ہیں۔ ان کا اصلی فائدہ یہ ہے کہ یہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کے دین کا انکار کرنے والوں کو بتاتے ہیں کہ ان کی روش قطعاً نامعقول ہے۔ اس کے لیے کوئی عقلی جواز فراہم نہیں کیا جا سکتا۔ اس روش کو اختیار کر کے وہ بہت ہی خوف ناک انجام سے دوچار ہونے والے ہیں۔

اب ہم انکارِ دین کے چند نمایاں اسباب کا یہاں ذکر کریں گے۔

غلط افکار کا غلبہ

صحیح فکر انسان کو اللہ تعالیٰ کے دین سے ملتا ہے۔ اس کے علاوہ جتنے بھی افکار و نظریات ہیں وہ سب غلط اور باطل ہیں۔ جو شخص اللہ کے دین کو چھوڑ دے وہ کسی نہ کسی

غلط فکر کو اختیار کرنے پر مجبور ہے۔ اگر جلد ہی اسے اپنی غلطی کا احساس نہ ہو تو وہ اس کو غلط ماننے سے انکار کر دیتا ہے اور اس کے حق میں دلائل فراہم کرنے لگتا ہے۔ اس کی وجہ خالص نفسیاتی ہے۔ وہ یہ کہ کسی فکر پر مدت تک قائم رہنے سے انسان کو اس سے محبت ہو جاتی ہے اور اس کے بارے میں اس کے اندر ایک طرح کی عصبیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ عصبیت کسی صحیح فکر سے ہو تو یقیناً قابلِ تعریف ہے، اس لیے کہ اس سے اس کی ذات کو اور دوسروں کو فائدہ پہنچتا ہے، لیکن اگر یہی عصبیت کسی غلط فکر سے پیدا ہو جائے تو اس کی قطعاً تعریف نہیں کی جا سکتی۔ یہ اس کے لیے بھی اور اس معاشرے کے لیے بھی جس سے وہ تعلق رکھتا ہے، سخت تباہ کن ہے۔ کسی غلط فکر کو اختیار کرنے کے بعد صحیح فکر کی طرف وہی شخص پلٹ سکتا ہے جو مضبوط قوتِ ارادی کا مالک ہو اور جس میں اتنی ہمت ہو کہ ہر وقت اپنے رویے کا تنقیدی جائزہ لے سکے۔ لیکن ایسے لوگ کم ہوتے ہیں۔ عام طور پر جب کسی شخص پر کوئی غلط فکر چھا جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کے دین کے حق میں اس کی نفسیات بدل جاتی ہے۔ وہ دین کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا، بلکہ اس کی پوری قوت دین پر اعتراض اور تنقید میں صرف ہوتی ہے۔ اللہ کے دین کو رد کرنے کے لیے اسے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ کم زور سا بہانہ بھی کافی ہوتا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں اس پر شیطان کی گرفت مضبوط ہو جاتی ہے۔ شیطان اس کو بڑی تیزی سے غلط راستے پر لے چلتا ہے اور ساتھ ہی اس دھوکے میں رکھتا ہے کہ وہ راہِ راست پر ہے اور بہترین دلائل کی بنا پر اس نے اللہ تعالیٰ کے دین کو رد کیا ہے:

وَ مَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ﴿۳۶﴾ وَ اِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ﴿۳۷﴾ (الزخرف: ۳۶، ۳۷)	جو شخص خدائے رحمٰن کی یاد سے اعراض کرے ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں اور وہ اس کا ساتھی بن جاتا ہے۔ یہ شیاطین ان کو راہِ راست سے روکتے ہیں لیکن وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ سیدھے راستے پر قائم ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنا دین نازل کرنے سے پہلے تمام مخالف نظریات کو مٹا نہیں دیا، بلکہ ان کو باقی رکھا اور اس بات کے مواقع دیے کہ اس کے دین کے ساتھ وہ بھی اپنا کام کرتے رہیں۔ کیوں کہ اسی میں انسان کا امتحان ہے اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ کس شخص کو اللہ کا دین عزیز ہے اور کون ان نظریات کو اختیار کرتا ہے، جو اس سے متصادم ہیں۔ چناں چہ جب بھی اللہ تعالیٰ کا دین انسانوں کے سامنے پیش ہوا، باطل نظریات نے پوری قوت سے اس کی مخالفت کی اور اس کو مٹانے اور اس پر غالب آنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ یہی بات قرآن کی اس آیت میں کہی گئی ہے:

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَ مَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ وَ لِتَصْغٰۤى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَ لِيَرْضَوْهُ وَ لِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

(الانعام: ۱۱۲، ۱۱۳)

اس طرح ہم نے انسانوں اور جنوں میں کے شیاطین کو ہر نبی کا دشمن بنا دیا ہے۔ وہ دھوکا دینے کے لیے ایک دوسرے کے دل میں خوش آئند باتیں ڈالتے رہتے ہیں۔ اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کر پاتے تو تم ان کو اور ان کی افترا پردازیوں کو (اللہ پر) چھوڑ دو۔ (یہ سب کچھ ہم انھیں اس لیے کرنے دے رہے ہیں) تاکہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل اس کی طرف مائل ہوں اور وہ اس سے راضی ہو جائیں اور جن برائیوں کا وہ اکتساب کرنا چاہتے ہیں ان کا اکتساب کرلیں۔

اللہ تعالیٰ کا دین ہمیشہ ایک رہا ہے، لیکن اس کا مقابلہ مختلف ادوار میں مختلف نظریات کرتے رہے ہیں۔ جو شخص بھی سنجیدگی سے ان نظریات کا اللہ کے دین سے موازنہ کرے گا، اسے معلوم ہوگا کہ ان میں سے ہر نظریہ انسانی فکر کی خامیوں کا اعتراف ہے اور نجات صرف اللہ کے دین میں ہے۔ اللہ نے انسان کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دی ہے۔ وہ حق و باطل میں تمیز کرسکتا ہے، لیکن غلط نظریات اس کے دل و دماغ پر اس طرح چھا جاتے ہیں کہ وہ ان سے ہٹ کر سوچنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾
(الاعراف:۱۷۹)

ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے نہیں سوچتے اور ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے نہیں دیکھتے اور ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے نہیں سنتے۔ یہ جانوروں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

جو شخص باطل نظریات کا گرویدہ ہوجائے، اس کے سامنے اللہ تعالیٰ کے دین کو اس کا رسول بھی پیش کرے تو وہ اس کو بہ آسانی رد کرسکتا ہے۔ ممکن ہے کہ ان مضبوط دلائل کی وجہ سے اس کی زبان بند ہو جائے جو اللہ کا رسول اس کے دین کے حق میں پیش کرتا ہے، لیکن اس کے دل کے دروازے اس کے استقبال کے لیے کھل نہیں سکتے۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَ فِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّ مِنْۢ بَيْنِنَا وَ بَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ ﴿۵﴾
(حٰمٓ السجدة:۵)

وہ کہتے ہیں کہ جس بات کی طرف تم ہمیں بلا رہے ہو، ہمارے دل اس سے پردے میں ہیں اور ہمارے کانوں میں گرانی ہے اور ہمارے اور تمھارے درمیان حجاب حائل ہے۔ پس تم اپنی جگہ کام کرو۔ ہم بھی اپنی جگہ کام کر رہے ہیں۔

غلط عمل سے محبت

اللہ تعالیٰ کے دین کو قبول کرنے کی راہ میں ایک رکاوٹ انسان کا غلط عمل بھی ہے۔ انسان اگر کسی غلط نظریۂ حیات کو اختیار کرلے تو وہ صحیح رُخ سے پھر جاتا ہے اور غلط رُخ پر چل پڑتا ہے اور جب صحیح فکر کو اپناتا ہے تو اس کی زندگی کا سارا نظام درست ہو جاتا ہے۔ کسی فکر کی خوبی یا خامی کو خالص علمی و عقلی بنیاد پر معلوم کرنا یقیناً دشوار ہے، لیکن اس کے نتائج کو دیکھ کر اس کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کرنا نسبتاً آسان ہے، جس شخص کو کسی غلط فکر کے نتائج بے چین کردیں اس پر دین کی حقیقت آسانی سے کھل جاتی ہے، لیکن جو شخص ان نتائج سے بے پروا ہوکر زندگی گزارنے لگے۔ دین کی طرف اس کا

متوجہ ہونا بہت مشکل ہے۔ دنیا کے بیش تر انسان اسی وجہ سے اللہ کے دین کو چھوڑے ہوئے ہیں کہ انھیں اس کا احساس نہیں ہے کہ غلط افکار ونظریات نے ان کی زندگی کو کس قدر فتنہ وفساد سے بھر دیا ہے۔ صحیح فکر کے نہ ہونے سے ان کے اخلاق تباہ ہوگئے ہیں، ان کی معاشرت بگڑ گئی ہے، ان کی معیشت و سیاست میں خلل آ گیا ہے، لیکن اس کے باوجود ان میں اپنی اصلاح کے لیے کوئی بے چینی اور اضطراب نہیں ہے۔ قرآن کے الفاظ میں گو وہ عقل وفہم رکھتے ہیں اور صحیح و غلط میں تمیز کر سکتے ہیں، لیکن شیطان نے ان کی غلط روش کو ان کی نظر میں انتہائی حسین بنا دیا ہے اور وہ اس فریب میں مبتلا ہیں کہ بہت اچھے کام کر رہے ہیں۔

وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَ كَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ ﴿۳۸﴾ (العنکبوت:۳۸)

شیطان نے ان کے اعمال کو ان کے لیے آراستہ کر دیا اور انھیں سیدھے راستے سے روک دیا حالاں کہ وہ سوجھ بوجھ والے تھے۔

انسان کے لیے نجات کا راستہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دین جس عقیدہ کی دعوت دیتا ہے، اخلاق کا جو تصور پیش کرتا ہے، تہذیب و معاشرت کے جو آداب سکھاتا ہے، معیشت و سیاست کے جو اصول دیتا ہے، عدل و انصاف کے جو قوانین فراہم کرتا ہے، ان کو اخلاص کے ساتھ قبول کرلے اور اپنی زندگی کو ان کا تابع بنا دے، لیکن جو شخص اپنی ناکام زندگی ہی کو کامیاب زندگی سمجھ بیٹھے وہ خود ہی تباہ ہونا چاہتا ہے، اسے تباہی سے کون بچا سکتا ہے؟

اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ؕ فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۖ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ﴿۸﴾ (فاطر:۸)

کیا وہ شخص جس کے لیے اس کا برا عمل خوشنما بنا دیا گیا ہے اور وہ اس کو اچھا خیال کرتا ہے، (اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جو نیک عمل کر رہا ہے؟) حقیقت یہ ہے کہ اللہ جسے چاہتا ہے گم راہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔ لہٰذا ان پر حسرت اور افسوس میں تمھاری جان نہ جاتی رہے۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں یقیناً اللہ اسے جانتا ہے۔

اکثریت کی اتباع

اللہ تعالیٰ کے دین کو قبول کرنا ان لوگوں کے لیے بھی آسان نہیں ہے جو حق و باطل کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتے، بلکہ دنیا کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ جن کے ہر اقدام کو دنیا کی روش متعین کرتی ہے اور دنیا کی روش اگر بدل جائے تو ان کا رویہ بھی بدل جاتا ہے۔ یہ لوگ کسی نظریہ کو اس کے دلائل کی وجہ سے نہ قبول کرتے ہیں اور نہ رد کرتے ہیں، بلکہ ان کی موافقت اور مخالفت دنیا کے رجحان کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک دنیا جس چیز کو قبول کرلے وہ حق ہے اور جسے قبول نہ کرے وہ باطل ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کا دین وقت کے نظریات کو ہر محاذ پر چیلنج کرتا ہے اور اپنی حقانیت اس طرح ثابت کر دیتا ہے کہ علم و عقل کے میدان میں اس کی مخالفت ناممکن ہو جاتی ہے تو وہ حیرت کے ساتھ اپنے چاروں طرف دیکھتے ہیں کہ دنیا اس کو کیوں نہیں قبول کرتی؟ مگر خود ان میں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ دنیا کے رویے کے برخلاف اپنے بگڑے ہوئے عقائد کو چھوڑ کر اللہ کے دین کو اختیار کرلیں اور اس کے مطیع و تابع بن جائیں۔ وہ یہ سوچ کر اپنے نفس کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ گو خدا کا دین بہ ظاہر حق ہے لیکن دنیا جب اس کو قبول نہیں کر رہی ہے تو یقیناً اس میں کوئی خرابی ہوگی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ساری انسانی آبادی غلط راستے پر چل رہی ہو اور راہِ حق صرف چند اشخاص پر منکشف ہوجائے؟ آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ جب انسان کا ذہن پستی کی اس حد کو پہنچ جائے کہ وہ پاکیزہ چیز کے مقابلے میں گندگی کو اس لیے ترجیح دے کہ وہ بڑی مقدار میں ہے تو اس سے کسی فکری بلندی کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے؟ اللہ کا دین ان لوگوں کو ملتا ہے جو پاکیزہ ذوق اور صحیح فکر رکھتے ہوں اور جو دنیا کے رویے کی بنا پر نہیں، بلکہ اس کی خوبیوں کی وجہ سے اسے قبول کرنے کے لیے آمادہ ہوں۔ قرآن کہتا ہے کہ دنیا کے بیش تر انسان اپنے خیالات کے لیے کوئی علمی بنیاد نہیں رکھتے، بلکہ محض وہم و قیاس کی اتباع کرتے ہیں۔ اس لیے یہ بات صحیح نہ ہوگی کہ دنیا کی اکثریت کو دیکھ کر باطل کو اختیار کرلیا

جائے، بلکہ معقولیت کی راہ یہ ہے کہ اکثریت کے طریقے کو چھوڑ کر حق کی اتباع کی جائے ورنہ جس طرح انسانوں کی اکثریت گم کردہ راہ ہے اسی طرح تم بھی بھٹکتے پھروگے اور منزل تم سے دور ہوتی چلی جائے گی۔

وَ اِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ۝ (الانعام:۱۱۶)

اگر تم ان لوگوں کی اکثریت کی اتباع کروگے جو زمین پر پائے جاتے ہیں تو وہ تم کو اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے۔ وہ تو گمان کی پیروی کرتے ہیں اور محض اٹکل پچو سے کام لیتے ہیں۔

گم راہ لیڈروں کی غلامی

حق اور باطل کے درمیان فیصلہ کرنا ہر شخص کا اپنا کام ہے، لیکن دنیا کے بیش تر انسان یہ کام خود نہیں کرتے، بلکہ اسے اپنے راہ نماؤں اور لیڈروں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے راہ نماؤں کو گو خدا نہ کہیں، لیکن ان کا کوئی بھی حکم ان کے لیے حکمِ خدا سے کم نہیں ہوتا۔ ان کے نزدیک حق وہ ہے جسے ان کے لیڈر کی زبان حق کہہ دے اور جس خیال کے باطل ہونے کا فیصلہ ان کا راہ نما کردے وہ یقیناً باطل ہے، جس راستے پر ان کے راہ نما چلیں وہی ان کی راہ ہوتی ہے۔ کسی مخالف سمت میں قدم اٹھانا ان کے لیے ناممکن ہوتا ہے۔ وہ ہر معاملہ میں اپنے راہ نماؤں کی عقل سے سوچتے ہیں اور ان کے راہ نما ان کو جانوروں کی طرح جدھر چاہتے ہیں ہانکتے پھرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے نجات کا راستہ اپنے رسولوں کے ذریعے بتا دیا ہے۔ اب انسان کے سامنے دو ہی صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ براہِ راست اس کے رسولوں کی تعلیمات سے واقفیت حاصل کرے اور ان کی روشنی میں خود بھی زندگی گزارے اور دوسروں کی بھی راہ نمائی کرے۔ دوسری صورت یہ کہ ان لوگوں کی اتباع کرے جو اسے ان رسولوں کی راہ دکھا سکتے ہیں۔ بلاشبہ ایسے افراد کم ہوتے ہیں جو زندگی کے مختلف مسائل میں علومِ

نبوت سے براہِ راست استفادہ کریں اور دنیا کو صحیح راہ دکھائیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو اتنی صلاحیت ضرور دی ہے کہ وہ اس کے رسولوں کے راستے پر لے چلنے والوں اور ان لوگوں کے درمیان فرق کر سکے جو اس راہ سے اس کو پھیرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود انسان اگر اپنی زمامِ کار ان ہی اشخاص کے ہاتھ میں دے دے جو اللہ کے رسولوں کے راستے سے خود بھی منحرف ہیں اور دوسروں کو بھی برگشتہ کر رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے خود ہی اپنے لیے نجات کی راہ بند کرلی ہے۔ اس کے سامنے وہ ہول ناک نتائج آکر رہیں گے، جن کا مشاہدہ اللہ کے رسولوں کی مخالفت کے بعد تاریخ ہمیشہ کرتی رہی ہے۔ اگر کسی کے دل پر اپنے راہ نما کا اس طرح قبضہ ہوگیا ہے کہ وہ اس کے پیچھے جہنم میں بھی جانے کے لیے تیار ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے جہنم سے نکال کر جنت میں نہیں پہنچا سکتی۔ انسان صرف اللہ تعالیٰ کے قانون کا پابند ہے لیکن اس کی کتنی بڑی بدقسمتی ہے کہ وہ اپنے ہی جیسے انسانوں کے احکام کی اس طرح پیروی کرتا ہے جیسے قانونِ الٰہی کی اسے پیروی کرنی چاہیے۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٣١﴾ (التوبۃ:۳۱)

انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے عالموں کو، اپنے درویشوں کو اور عیسیٰ ابن مریم کو رب بنا لیا حالاں کہ ان کو یہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ صرف ایک اللہ کی عبادت کریں۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ پاک ہے وہ اس شرک سے جو وہ کرتے ہیں۔

ماضی کی پرستش

بہت سے لوگ ماضی کے پرستار ہوتے ہیں۔ وہ کسی ایسے نظریے کو قبول نہیں کرتے جو ان کے ماضی کو غلط قرار دے اور ان کے اسلاف پر تنقید کرے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے حق کو چھوڑنا ان کے لیے آسان ہوتا ہے، لیکن ماضی کی غلط

روایات کو اپنی زندگی سے خارج کرنا آسان نہیں ہوتا۔ ان کو ماضی کی خوبیوں ہی سے نہیں خامیوں سے بھی محبت ہوتی ہے۔ وہ ماضی سے سبق نہیں لیتے، بلکہ اس کی خوبیوں اور خرابیوں دونوں ہی کو فخر کے ساتھ دہراتے ہیں۔ ان کو اپنے بزرگوں میں عقل، بصیرت، دیانت، احتیاط غرض ہر خوبی نظر آتی ہے اور ان سے کسی بھی غلطی کو وہ خارج ازامکان سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ماضی میں جو کچھ ہوا وہ حق ہے اور جس چیز کو ماضی کی سند حاصل نہیں ہے وہ باطل ہے۔ غلط سے غلط فلسفہ بھی ان کے لیے قابلِ قبول ہوتا ہے، اگر ماضی نے اس کو شرفِ قبولیت بخشا ہے اور زندگی کے بہترین نظریے کو بھی وہ قبول نہیں کرسکتے اگر ان کے غلط رَو اسلاف نے اس کو رد کر دیا ہے۔ قرآن ماضی کی اس پرستش پر سخت تنقید کرتا ہے۔ اس کے نزدیک ماضی یقیناً سینے سے لگانے کے قابل ہے جب کہ حق کی روشنی اس میں موجود ہو، لیکن ماضی اگر حق سے خالی ہے تو باعثِ فخر نہیں باعثِ ننگ ہے۔ اگر کوئی شخص اس وجہ سے حق کو رد کرتا ہے کہ اس کے آباء و اجداد نے اسے رد کیا تھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کے انجام سے عبرت حاصل کرنا نہیں چاہتا، بلکہ ان ہی کی طرح تباہ ہونا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا دین بڑی قربانیوں کے بعد ملتا ہے۔ جو شخص اس کے لیے ماضی کی فرسودہ روایات کو بھی نہ چھوڑ سکے وہ اس سے بہرہ ور نہیں ہوسکتا۔ انسان کو اپنے ماضی کی محبت کے بجائے اللہ کے دین سے محبت ہونی چاہیے، لیکن افسوس کہ وہ ماضی کی محبت میں اللہ کے دین کو بھول جاتا ہے۔

وَ كَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ﴿۲۳﴾ قٰلَ اَوَ لَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ؕ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۲۴﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ

اور اسی طرح (اے پیغمبرؐ) ہم نے تم سے پہلے جس بستی میں بھی کسی ڈرانے والے کو بھیجا تو اس کے آسودہ حال لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم ان ہی کے نقشِ قدم کی پیروی کر رہے ہیں۔ پیغمبر نے ان سے کہا کہ اگر میں اس سے زیادہ سیدھا طریقہ تمھیں بتاؤں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے (تو کیا اس وقت بھی تم اپنے طریقے ہی پر قائم رہوگے؟) انھوں نے

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۵﴾ جواب دیا کہ جس دین کے ساتھ تمھیں بھیجا گیا ہے ہم اس کے منکر ہیں۔ پھر ہم نے ان سے انتقام لیا۔ پس دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا؟ (الزخرف:۲۳-۲۵)

دنیا کی محبت

انسان دنیا کی زندگی میں کھویا ہوا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا دین چاہتا ہے کہ آخرت کی فکر اس پر چھا جائے اور وہ دنیا کی کامیابی اور ناکامی سے بے نیاز ہو کر صرف آخرت کے لیے کام کرے۔ کیوں کہ دنیا اس قابل نہیں ہے کہ انسان کا مطمحِ نظر بن سکے۔

اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ ۫ وَّ اِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ ﴿۳۹﴾ یہ دنیا کی زندگی تو محض (چندروزہ) ساز و سامان ہے اور آخرت تو وہی ہمیشہ رہنے کا گھر ہے۔ (المومن:۳۹)

دنیا کی زندگی ایک فریب ہے لیکن انسان یہ سمجھتا ہے کہ یہی سب سے بڑی اور آخری حقیقت ہے۔ اس سے اونچی کسی حقیقت کا وجود نہیں ہے کہ اسے وہ تلاش کرے۔ دنیا اس کے شب و روز پر چھا گئی ہے اور اس کی ساری جدوجہد اسی کے لیے ہے۔ قرآن کے الفاظ میں:

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ هُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ﴿۷﴾ یہ لوگ دنیا کی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں اور آخرت سے بالکل بے خبر ہیں۔ (الروم:۷)

دین کی بہت سی حقیقتوں کا تعلق عالمِ آخرت سے ہے۔ ان حقیقتوں کو انسان اسی وقت سمجھ سکتا ہے جب کہ وہ اس مادی دنیا سے ہٹ کر سوچنے کے لیے تیار ہو۔ لیکن کم ہی انسان اس کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگ آخرت کے امکان ہی کو تسلیم نہیں کرتے اور بہت سے اس کے بارے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان کو یقین نہیں ہے کہ فی الواقع وہ آئے گی۔ حالاں کہ آخرت گو آج ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہے، لیکن وہ وقت جلد آنے والا ہے، جب کہ وہ بالکل بے نقاب ہوگی اور انسان

انکارِ آخرت کے نتائج کو دیکھ کر کانپ اٹھے گا، لیکن اس وقت کی حسرت اور ندامت اس کے کچھ کام نہ آئے گی، کیوں کہ مہلتِ عمل ختم ہو چکی ہوگی اور اپنے اعمال کا نتیجہ سامنے ہوگا:

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يَنفَعُ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَعْذِرَتُهُمْ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ ﴿٥٧﴾ (الروم:۵۷)

پس اس دن ظلم کرنے والوں کو نہ تو ان کی عذر خواہی کچھ کام دے گی اور نہ انہیں اللہ کو خوش کرنے کا موقع دیا جائے گا۔

اسبابِ دنیا کی کثرت

اسبابِ دنیا کی کثرت اور آسائش و راحت سے بھرپور زندگی بھی بعض اوقات قبولِ حق کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ آسودہ حالی انسان کے اندر سے اطاعت کا جذبہ چھین لیتی اور اسے اللہ تعالیٰ کا باغی بنا دیتی ہے۔ عیش و عشرت میں انسان اللہ کی ہدایت کو اس طرح رد کر دیتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ اس کا حاکم اور وہ اس کا محکوم نہیں ہے۔ اس سرکشی پر اللہ تعالیٰ بار بار اس کو متنبہ کرتا ہے لیکن وہ اپنی نافرمانی سے باز نہیں آتا۔ یہاں تک کہ اللہ کا قانونِ مکافات اس کو پیس کر رکھ دیتا ہے۔

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا ﴿١٥﴾ وَإِذَا أَرَدْنَا أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيرًا ﴿١٦﴾ (بنی اسرائیل:۱۵،۱۶)

ہم اس وقت تک لوگوں کو عذاب نہیں دیا کرتے جب تک کہ اُن کے درمیان ایک رسول نہ بھیج دیں۔ جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے خوش حال لوگوں کو (اپنی اطاعت کا) حکم دیتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اس میں نافرمانی کرتے ہیں۔ تب اس بستی پر عذاب کا فیصلہ ہو جاتا ہے اور ہم اسے تباہ کر کے رکھ دیتے ہیں۔

آسودہ حال انسان کبھی اس دھوکے میں ہوتا ہے کہ حق اس کے ساتھ ہے۔ اس سے آگے بعض اوقات وہ اس فریب میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ وہ حق کا ترجمان ہے۔ اس کا حکم، خدا کا حکم اور اس کی مخالفت خدا کی مخالفت ہے۔ وہ کسی خستہ حال کو اس

قابل نہیں سمجھتا کہ اس کی غلطیوں پر تنقید کرے اور اسے راہِ راست دکھائے۔ وہ جب کسی کم حیثیت انسان کی زبان سے حق کا پیغام سنتا ہے تو حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیتا ہے۔ وہ اس منطق سے اپنے آپ کو اور دوسروں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ جب مجھے دنیا کا عیش حاصل ہے تو یہ میرے برحق ہونے کی دلیل ہے۔ میری راہ اگر غلط ہوتی تو مجھ پر خدا کا اس طرح التفات نہ ہوتا اور میں اس کے انعام و اکرام سے نوازا نہ جاتا۔ اس کے برعکس جو شخص میری روش کو غلط قرار دے رہا ہے اس کو سکون اور چین کی زندگی تک نصیب نہیں ہے۔ اگر اس کی راہ اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی راہ ہوتی اور اس کا طرزِ عمل اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہوتا تو وہ اسبابِ دنیا سے محروم نہ ہوتا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے اس دعوے میں جھوٹا ہے اور اللہ کی توجہ اور عنایت اسے حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا ایسے شخص کی اتباع کرنا اپنے آپ کو تباہ و برباد کرنا ہے۔ حضرت نوحؑ کی قوم کے خوش حال طبقہ کی یہی نفسیات تھی۔ قرآن مجید نے اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

وَ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَ اَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَ يَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَ لَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۳۴﴾

(المومنون: ۲۳: ۳۳، ۳۴)

اس کی قوم کے سردار جنھوں نے کفر کیا اور آخرت کی پیشی کا انکار کیا اور جن کو ہم نے دنیا کی زندگی میں آسودہ کر رکھا تھا، کہنے لگے کہ یہ تو تم ہی جیسا آدمی ہے۔ تم جو کچھ کھاتے ہو وہی وہ بھی کھاتا ہے اور تم جو کچھ پیتے ہو وہی وہ بھی پیتا ہے۔ اگر تم نے اپنے ہی جیسے کسی انسان کی پیروی اختیار کی، تو تم یقیناً خسارے میں رہو گے۔

ہر قوم کے اور ہر دور کے لیڈروں میں یہ نفسیات کام کرتی رہی ہے۔ محمد ﷺ کے بارے میں آپؐ کے مخالفین کا اندازِ فکر یہی تھا۔

وَ قَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴿۳۱﴾ (الزخرف:۳۱)

وہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن دونوں شہروں (مکہ اور طائف) کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں نازل کیا گیا؟

دنیا میں ایسے انسانوں کی کمی نہیں ہے جو اس طرح کی غیر عقلی باتوں پر آسانی سے ایمان لے آتے ہیں۔ وہ حق کا بحیثیت حق کے مطالعہ نہیں کرتے، بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ اسے مالی و مادّی حیثیت کے کس انسان نے پیش کیا ہے اور پھر اسی لحاظ سے اس کے ساتھ ان کا رویہ متعین ہوتا ہے۔ وہ حق کو آسانی سے رد کرسکتے ہیں، اگر کوئی مفلسِ بےنوا اسے پیش کرے، لیکن کھلے ہوئے باطل کو رد نہیں کرسکتے، بلکہ اس کی طرف لپک پڑیں گے اگر سردارانِ قوم اس کی دعوت دیں۔ ان کی عقل میں یہ بات نہیں آتی کہ جو شخص آسائش سے محروم اور ساز و سامانِ دنیا سے خالی ہے وہ تو حق کا امین ہو اور اصحابِ تخت و تاج اور بڑے بڑے امراء و رؤساء اس سے ناواقف ہوں۔ ظاہر ہے اس نادانی اور غلط اندازِ فکر کی بنا پر وہ انکارِ حق کے انجام سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ چناں چہ تاریخ گواہ ہے کہ وہ کبھی محفوظ نہیں رہے۔

وَ نَادٰى فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَ هٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۱﴾ اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ ۙ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ ﴿۵۲﴾ فَلَوْ لَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ ﴿۵۳﴾ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۵۴﴾ فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ

فرعون نے اپنی قوم میں پکار کر کہا کہ اے میری قوم! کیا ملکِ مصر میرا نہیں ہے اور یہ نہریں (جو) میرے نیچے بہہ رہی ہیں، کیا تم (ان سب چیزوں کو) نہیں دیکھتے ہو؟ میں (یقیناً) بہتر ہوں اس شخص سے جو کہ ذلیل ہے اور صاف صاف بات تک نہیں کرسکتا۔ پس کیوں نہیں اتارے گئے اس کے لیے سونے کے کنگن یا آئے اس کے ساتھ فرشتے پرے باندھ کر؟ اس طرح اس نے اپنی قوم کو حقیر سمجھا اور بے وقوف بنایا اور وہ اس کی بات مان گئے۔ یقیناً وہ

فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۵﴾ فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلْاٰخِرِيْنَ ﴿۵۶﴾ (الزخرف:۵۱-۵۶)

فاسق لوگ تھے ہی۔ جب انھوں نے ہمیں غصہ دلایا تو ہم نے ان سے بدلہ لیا اور ان سب کو ڈبو دیا اور بعد والوں کے لیے پیش رَو اور مثال بنا کر رکھ دیا۔

اقتدار اور حکومت

تاریخ کا تجربہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کو اربابِ اقتدار نے بالعموم رد کیا ہے۔ جب کبھی اللہ کا دین ان کے سامنے آیا اسے انھوں نے اپنے اقتدار کے لیے خطرہ سمجھا اور اس کی مخالفت شروع کردی۔ وہ شخص ان کا سب سے بڑا سیاسی حریف بن جاتا ہے جو ان کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ اللہ کے دین کے حق ہونے پر وہ مضبوط دلائل پیش کرتا ہے، لیکن وہ یہ کہہ کر ان کو رد کر دیتے ہیں کہ یہ اقتدار پر قبضہ کرنے کی چال ہے۔ اگر دنیا کا سب سے بڑا بے غرض اور مخلص انسان انھیں دین کی دعوت دے تو اس کی بے نفسی میں بھی انھیں ہوسِ اقتدار نظر آتی ہے اور وہ چیخنے لگتے ہیں۔

اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ ﴿۶﴾ (ص:۶)

یقیناً یہ بات کسی غرض ہی سے کی جا رہی ہے۔

فرعون کے نزدیک حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ جیسی شخصیتوں کے اندر بھی اقتدار کی بھوک تھی اور ان کی دعوت کا مقصد اقتدار اور حکومت پر قبضہ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿۶۳﴾ (طٰہٰ:۶۳)

انھوں نے کہا یہ دو جادوگر ہیں جو چاہتے ہیں کہ جادو کے زور سے تم کو تمھاری زمین سے نکال دیں اور تمھارے مثالی طریقے کو ختم کردیں۔

یہی بات ایک دوسری جگہ ان الفاظ میں کہی گئی ہے:

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ؕ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۸﴾ (یونس:۷۸)

انھوں نے کہا کہ کیا تم اس لیے آئے ہو کہ جس طریقے پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے اس سے پھیر دو اور زمین میں بڑائی تم دونوں کے لیے ہوجائے۔ ہم تمھاری بات ماننے والے نہیں ہیں۔

نفس پرستی

اللہ تعالیٰ کے دین کو اختیار کرنے کی راہ میں ایک رکاوٹ نفس پرستی بھی ہے۔ نفس پرست انسان کسی بھی چیز پر غور کرنے سے پہلے اپنے نفس کی راحت کا خیال کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ اس دنیا میں اس کو صرف تسکینِ نفس کی تلاش ہوتی ہے۔ وہ اس فیصلے کے ساتھ زندگی گزارتا ہے کہ اسے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہیے جس سے اس کے نفس کو تکلیف پہنچے، وہ کسی ایسے خارزار میں الجھنا نہیں چاہتا جو اس سے سکونِ نفس چھین لے اور اسے بے چین کردے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے دین کو مبنی برصداقت جاننے کے باوجود وہ اسے قبول نہیں کرتا۔ کیوں کہ اس سے اس کے نفس کے آرام میں خلل پڑتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا دین بہت غیور ہے۔ جو شخص اس کو جاننے اور سمجھنے کے بعد بے نیازی سے ٹھکرادے وہ اس سے کوسوں دور ہو جاتا ہے۔ جب انسان اپنے نفس کے سامنے سر ٹیک دے تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنے در سے اٹھا دیتا ہے۔ وہ نفس کی غلامی کرتے ہوئے مرجائے گا لیکن اس کو اللہ کے سامنے سر جھکانے کی توفیق نہ ہوگی:

أَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوٰىهُ وَ أَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ۭ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ۭ أَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۳﴾ (الجاثیۃ: ۲۳)

کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا الٰہ بنا لیا ہے۔ اور باوجودیکہ وہ علم رکھتا ہے، اللہ نے اسے گم راہ کر دیا اور اس کے کانوں اور اس کے دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ پس جب اللہ (ہی) نے اس کو گم راہ کر دیا ہے تو کون اسے سیدھی راہ دکھا سکتا ہے، تو کیا تم نصیحت نہیں حاصل کرتے۔

استکبار

اللہ تعالیٰ سے بغاوت کا ایک سبب استکبار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرے لیکن اس نے اللہ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ قرآن نے اس کی

وجہ یہ بتائی ہے کہ اس کے اندر استکبار تھا۔ استکبار کے معنی ہیں اپنے آپ کو بڑا سمجھنا۔ یہ جذبہ دو شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی ایک شکل ہے انکارِ حق اور دوسری شکل ہے لوگوں کی تحقیر۔ یہ دونوں باتیں شیطان کے استکبار میں موجود تھیں۔ ایک طرف تو اس نے حضرت آدمؑ کو اپنے سے فروتر سمجھا اور دوسری طرف اللہ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔

استکبار کی وجہ سے انسان میں اللہ تعالیٰ سے بغاوت اور سرکشی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ جذبات جس درجہ اور جس نوعیت کے ہوں گے اللہ سے بغاوت بھی اسی درجہ اور اسی نوعیت کی ہوگی۔ جب استکبار اپنے شباب پر ہو تو اللہ سے بغاوت بھی اپنی آخری حد کو پہنچ جاتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اپنی بڑائی کا احساس انسان کو اللہ کے سامنے سر جھکانے سے روکتا ہے اور وہ اپنے لیے ایسی حیثیت کا مطالبہ کرتا ہے جو فی الواقع خدا نے اسے نہیں دی ہے۔ جس شخص میں استکبار ہو اس کی نفسیات اللہ کے مطیع و فرماں بردار بندے کی نفسیات سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اللہ کی اطاعت وہ شخص کرتا ہے جو اس کو اپنا معبود اور حاکم سمجھے، لیکن متکبر انسان کسی کو اپنے سے برتر ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اللہ کی اطاعت اسے شاق گزرتی ہے اور وہ اپنے آپ کو ہر قید و بند سے آزاد سمجھتا ہے۔

اسی طرح متکبر شخص چاہتا ہے کہ سوسائٹی میں اس کو سب سے اونچی حیثیت حاصل ہو اور کوئی شخص اس کی ہم سری کا دعویٰ نہ کرے۔ گم کردہ راہ ہونے کے باوجود اس کو اپنی عقل و بصیرت اور دانائی پر ناز ہوتا ہے۔ وہ اندھوں کی طرح ٹھوکریں کھاتا رہتا ہے، لیکن اس کا غرور اس کو اپنی غلط روی پر سوچنے کا موقع نہیں دیتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ ناممکن ہے کہ حق و صداقت ہماری نگاہوں سے پوشیدہ رہے اور کوئی دوسرا شخص اس سے واقف ہو جائے۔ اگر کہیں خیر و خوبی ہوگی تو سب سے پہلے ہمارے علم میں آئے گی اور کسی کے اس تک پہنچنے سے قبل ہم پہنچیں گے۔ حتیٰ کہ وہ دوسرے انسان میں کسی اخلاقی خوبی کو ماننے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتا۔ وہ شریف اور مہذب اپنے آپ کو سمجھتا ہے یا

ان لوگوں کو جو اس کے ہم مسلک ہوں۔ جو لوگ اسے اللہ کے دین کی طرف دعوت دیں اور اس کے فسق و فجور پر تنقید کریں وہ اس کے نزدیک اراذل اور اشرار ہوتے ہیں۔ وہ اس بات کو برداشت نہیں کرسکتا کہ کوئی شخص بڑا بن کر اس کو نصیحت کرے اور اس کی غلطی واضح کرے۔ وہ اپنی غلطی پر مرجانا پسند کرتا ہے لیکن کسی کی نصیحت قبول کرکے اپنی اصلاح کرنا نہیں چاہتا۔ جس شخص کے تکبر کا یہ عالم ہو کہ وہ اپنے سوا کسی اور چیز کو دیکھنے ہی کے لیے آمادہ نہ ہو، وہ اللہ کے دین کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، البتہ دین اس کے لیے ایک سربمہر حقیقت ہوگا جس تک پہنچنے کی تمام راہیں بند ہوں گی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ۙ اِنْ فِيْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِيْهِ ۚ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴿۵۶﴾

(المومن:۵۶)

وہ لوگ جو اللہ کی آیتوں میں جھگڑا کرتے ہیں بغیر کسی دلیل کے جو ان کے پاس آئی ہو ان کے دلوں میں تو بس غرور بھرا ہوا ہے (کہ ہم اس کو ختم کرکے رہیں گے مگر) وہ اس تک پہنچ نہیں سکتے تو تم اللہ سے پناہ مانگو۔ بے شک وہی سننے اور دیکھنے والا ہے۔

دین میں ترمیم کا مطالبہ

جب کوئی نظریہ دلیل سے ثابت ہوجائے تو انسان کے لیے معقول رویہ یہ ہے کہ آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگالے اور ان تمام نظریات کو رد کردے جو اس سے ٹکراتے ہیں۔ لیکن بہت سے لوگ اللہ تعالیٰ کے دین کے بارے میں یہ معقول رویہ اختیار نہیں کرتے۔ وہ غلط سے غلط اور اوچھے سے اوچھے طریقے سے اس کی مخالفت کرتے رہتے ہیں اور جب مخالفت بے جان اور ناکام ہوتی چلی جاتی ہے تو صاف صاف نہ تو اسے رد کرتے ہیں اور نہ اسے اپنی صحیح شکل میں قبول کرتے ہیں، بلکہ اس میں ایسی ترمیم چاہتے ہیں جو اسے ان کے غلط افکار و نظریات سے قریب کردے۔ ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ اللہ کے دین میں ان کی خواہشات کی بھی گنجائش نکل آئے

تاکہ اللہ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ جذباتِ نفس کی بھی تسکین ہوتی رہے۔ حالاں کہ اللہ کا دین اپنی خالص اتباع چاہتا ہے۔ کسی بڑے سے بڑے شخص کو، حتیٰ کہ اللہ کے رسول کو بھی اس کی اجازت نہیں ہے کہ اس میں ایک لفظ کی کمی بیشی کردے اور حسبِ خواہش اس کی پیروی کرنے لگے:

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾ (یونس:۱۵)

جب ان کو ہماری صاف صاف آیتیں سنائی جاتی ہیں تو جو لوگ ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے، یہ کہتے ہیں کہ اس کی جگہ کوئی دوسرا قرآن لاؤ یا اس میں ترمیم کردو۔ اے پیغمبر! ان سے کہہ دو کہ مجھے یہ حق نہیں ہے کہ اس میں اپنی طرف سے ترمیم کردوں۔ میں تو بس اس وحی کی اتباع کرتا ہوں جو میرے پاس آتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے۔

جو لوگ باطل کو چھوڑے بغیر اللہ کے دین کی طرف آئیں حقیقت میں اللہ کے دین سے انھیں محبت نہیں ہوتی، بلکہ اپنے نفس سے محبت ہوتی ہے، اپنی خواہشات سے محبت ہوتی ہے اور ان غلط افکار ونظریات سے محبت ہوتی ہے جنھیں اللہ کا دین مٹانا چاہتا ہے۔ اللہ کا دین اس لیے نہیں آتا کہ باطل کے ساتھ صلح صفائی کرے، بلکہ اس لیے آتا ہے کہ باطل سرنگوں ہو اور وہ اس پر غالب آجائے۔ جب تک انسان باطل سے بالکل دست بردار نہ ہو حق کا ساتھی نہیں بن سکتا۔

وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ کا دین ملتا ہے

اس دنیا میں کچھ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا دین ملتا ہے اور کچھ لوگ اس سے محروم ہوتے ہیں۔ آج کے دور میں یہ کوئی اہم بات نہیں ہے۔ حالاں کہ کسی کو اللہ کے دین کے ملنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ کامیاب ہے اور کسی کے اس سے محروم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ ناکام ہے۔ اتنا بڑا واقعہ انسان کی زندگی میں بخت و اتفاق سے نہیں پیش آتا، بلکہ یہ اس کا اپنا ارادہ اور فیصلہ ہے جو اس کو اللہ کے دین سے قریب یا دور کرتا ہے۔ جن لوگوں پر اللہ کے دین کی حقیقت کھلتی ہے اور جو آگے بڑھ کر اس کو قبول کرتے ہیں ان میں کچھ خصوصیات ہوتی ہیں جو ان کو دین سے الگ رہنے نہیں دیتیں اور دین ان کے لیے اس قدر ضروری ہو جاتا ہے کہ اس کے بغیر وہ زندگی کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ یہاں ان ہی خصوصیات کو قرآن مجید کی روشنی میں بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

صحیح الفطرت انسان

اللہ تعالیٰ کا دین انسان کی فطرت کے عین مطابق ہے۔ وہ فطرتاً جن چیزوں کو پسند کرتا ہے وہ اللہ کے دین میں بھی پسندیدہ ہیں اور جن چیزوں کو اس کی فطرت ناپسند کرتی ہے وہ اللہ کے دین میں بھی ناپسندیدہ ہیں۔ اللہ کا دین اس سے کوئی ایسی چیز نہیں چاہتا جو اس کے لیے نامانوس ہو اور جس کے قبول کرنے سے اس کی فطرت انکار کرے۔ اللہ تعالیٰ کے دین کو ماننا حقیقت میں انسان کا اپنی فطرت کے مطالبات کو ماننا

ہے۔ اسی وجہ سے قرآن میں کہا گیا ہے:

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (الروم: ۳۰)	پس تم یکسو ہو کر اپنا رخ (اللہ کے) دین کی طرف کیے رہو۔ اس فطرت پر جم جاؤ جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ یہی دینِ قیم ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

دین کی حقیقت کو اگر ہم دو لفظوں میں بیان کرنا چاہیں تو اسے توحید اور عدل کہہ سکتے ہیں۔ توحید کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کو ماننا اور اس کی ذات و صفات میں کسی کو شریک نہ قرار دینا اور صرف اسی کی عبادت کرنا۔ عدل کا مطلب ہے لوگوں کے ساتھ معاملات میں افراط و تفریط سے بچنا اور انصاف پر قائم رہنا۔ یہ دونوں باتیں انسان کی فطرت میں داخل ہیں لیکن فطرت کا بگاڑ ان کے قبول کرنے سے اسے باز رکھتا ہے۔

انسان کی ذات کے اندر اور باہر اس دنیا میں بہت سے ایسے اسباب ہیں جو اس کی فطرت کو مسخ کر دیتے ہیں۔ اگر یہ اسباب نہ ہوں تو اللہ کے وجود کا انکار یا اس کے ساتھ شرک اس کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح ظلم و زیادتی اس کو طبعاً ناپسند ہے لیکن غلط عوامل اس کو عدل و انصاف کی راہ سے پھیر دیتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جب تک انسان اپنی فطرت کو دبا نہ دے، اللہ کے دین اور اس کی تعلیمات کو رد نہیں کرسکتا۔ وہ اسی طرح اس کی طرف بڑھے گا، جس طرح بچہ ماں کی طرف لپکتا اور پیاسا پانی کی طرف بڑھتا ہے۔

اگر انسان کی فطرت صحیح حالت میں ہے تو یہی نہیں کہ دین کو قبول کرنے میں اسے کوئی تامل نہیں ہوتا بلکہ وہ دین کا مبلغ اور ترجمان بن کر ابھرتا ہے۔ کیوں کہ صحیح الفطرت انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کے دین کے علاوہ کسی نظریہ پر مطمئن ہونا اور اپنے ماحول کے اندر اس سے انحراف اور بغاوت کو برداشت کرنا ممکن نہیں ہے۔ فطرت کی اس صحیح ترین

حالت کو قرآن 'قلب سلیم' سے بھی تعبیر کرتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں اس کا بیان ہے:

اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ﴿۸۴﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ وَقَوْمِهٖ مَاذَا تَعْبُدُوْنَ﴿۸۵﴾ اَئِفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِیْدُوْنَ﴿۸۶﴾ فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴿۸۷﴾
(الصّٰفّٰت: ۸۴-۸۷)

یاد کرو جب وہ اپنے رب کے پاس 'قلب سلیم' کے ساتھ آیا (اور) جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ یہ کیا چیز ہے جس کی تم عبادت کرتے ہو؟ کیا محض جھوٹ گھڑ لیا ہے، جو اللہ کے سوا دوسرے معبودوں کو چاہتے ہو؟ تو تمھارا اللہ رب العالمین کے بارے میں کیا خیال ہے؟

اس کے بعد قرآن نے معبودانِ باطل پر ان کی تنقیداوراس راہ میں ان کی استقامت اور قربانی کا ذکر کیا ہے۔ یہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ جس شخص کو 'قلبِ سلیم' حاصل ہو وہ معبودانِ باطل کے ساتھ وہی روش اختیار کرے گا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی۔ یہ روش گو خطرات سے بھری ہوئی ہے لیکن آخرت کی کامیابی اسی میں چھپی ہوئی ہے۔

یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّ لَا بَنُوْنَ﴿۸۸﴾ اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ﴿۸۹﴾
(الشعراء: ۸۸، ۸۹)

اس دن نہ مال کام آئے گا اور نہ اولاد، ہاں صرف اس شخص کو نجات ملے گی جو 'قلبِ سلیم' کے ساتھ اللہ کے حضور میں حاضر ہوگا۔

جو غور وفکر کرتے ہیں

جو شخص دین کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کرے اس کا دین تک پہنچنا آسان ہے اور جس کو یہ کوشش ہی ناگوار گزرے اسے دین خود بہ خود نہیں مل سکتا۔ اسی لیے قرآن کا مطالبہ ہے:

وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ

جب قرآن پڑھا جائے تو توجہ سے سنو اور

وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۝ خاموش رہو (اس سے) امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔ (الاعراف:۲۰۴)

اللہ تعالیٰ کا دین کوئی افسانہ یا بے حقیقت چیز نہیں ہے، جسے نظر انداز کر دیا جائے، بلکہ اس میں غور وفکر کا بڑا سامان ہے۔ وہ اپنی صداقت کا محض دعویٰ نہیں کرتا بلکہ اس پر بہت ہی مضبوط دلائل فراہم کرتا ہے اور ان پر غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْۤا اٰيٰتِهٖ وَ لِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ۝ یہ کتاب جو ہم نے تم پر نازل کی ہے بڑی برکت والی ہے تاکہ یہ لوگ اس کی آیتوں میں تدبر کریں اور عقل والے اس سے نصیحت حاصل کریں۔ (صٓ:۲۹)

اللہ تعالیٰ کے دین پر غور وفکر سے انسان پر اس کی عظمت کھلتی ہے اور وہ اس سے قریب ہوتا ہے۔ جو لوگ دین کی مخالفت کر رہے ہیں ان کا سب سے بڑا مرض یہ ہے کہ وہ اس پر غور نہیں کرتے۔ ان کو اندازہ ہی نہیں ہے کہ وہ کتنی بڑی حقیقت کو جھٹلا رہے ہیں۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ کسی سوجھ بوجھ والے انسان کے لیے اس کا انکار ممکن نہیں ہے۔ اس کا انکار تو انسان اسی وقت کرسکتا ہے جب کہ وہ غور وفکر ہی کے لیے آمادہ نہ ہو یا پہلے سے نہ ماننے کا فیصلہ کر چکا ہو۔ قرآن حیرت کے ساتھ پوچھتا ہے کہ عقل تو اللہ کے دین کو ماننے کی دعوت دیتی ہے اور لوگ اس کو جھٹلا رہے ہیں، آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا۝ (محمد:۲۴) کیا وہ قرآن پر غور نہیں کرتے یا دلوں پر ان کے قفل چڑھے ہوئے ہیں؟

انسانی علم کی جہاں تک رسائی ہے اللہ کا دین اس کے عین مطابق ہے۔ انسان نے آج تک کوئی ایسی چیز دریافت نہیں کی جو دین اور اس کی تعلیمات کی تردید کرتی ہو۔ اسی وجہ سے قرآن کہتا ہے کہ اصحابِ فکر اور علم والوں کو دین کے ماننے میں کوئی فکری الجھن نہیں پیش آتی۔ وہ بہ خوشی اسے قبول کرتے ہیں اور اس کے حق ہونے کی

گواہی دیتے ہیں:

وَيَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ ۙ (سبا:٦)

جن لوگوں کو علم دیا گیا ہے وہ جانتے ہیں کہ جو دین تم پر تمھارے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے وہ حق ہے۔

اللہ تعالیٰ کا دین کوئی پیچیدہ فلسفہ نہیں ہے، جس کے سمجھنے کے لیے عقل وخرد کی بہت بڑی مقدار مطلوب ہو بلکہ وہ 'کتاب مبین' کی شکل میں نازل ہوا ہے۔ اسے دیکھ کر ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ وہ کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں چاہتا، اس کے نزدیک انسان کی صحیح حیثیت اور اس کی نجات کی سبیل کیا ہے؟ ان حقیقتوں کے اظہار میں اس نے کوئی ابہام نہیں رکھا ہے بلکہ کھول کھول کر صاف اور سیدھی زبان میں بیان کر دیا ہے۔ اس لیے ہر شخص اپنی ذہنی صلاحیت کے لحاظ سے اسے سمجھ بھی سکتا ہے اور اس سے فائدہ بھی اٹھاسکتا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَ لَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۟ؕ (الکہف:۱)

ساری حمد و ثنا اللہ کے لیے ہے، جس نے اپنے بندے پر یہ کتاب نازل کی اور اس میں کوئی کجی نہیں رکھی۔

اللہ کے دین نے اپنے آپ کو انسان کے سامنے اس طرح پیش کر دیا ہے کہ جو شخص فی الواقع اسے سمجھنا چاہے اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ اب یہ اس کا اپنا کام ہے کہ دین کو سمجھنے کی کوشش کرے یا اپنی عقل کو اس سے ہٹا کر کسی اور کام میں لگا دے۔

وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝۱۷ (القمر:۱۷)

ہم نے قرآن کو آسان کر دیا ہے تاکہ لوگ اس سے نصیحت حاصل کریں۔ پس ہے کوئی جو اس سے نصیحت حاصل کرے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین پر غور وفکر کرنے والا ہر

شخص اس کو پا نہیں لیتا، بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان ہر طرح کے تعصّبات سے بلند ہو اور صاف ذہن سے اس پر سوچے۔ انسان کو جس چیز سے تعصب ہو اس کے علاوہ کوئی اور چیز اسے نظر نہیں آتی۔ اسے دین کی حقانیت پر اگر یقین آ بھی جائے تو اس کے قبول کرنے کے لیے اس کے دل کے دروازے نہیں کھلتے۔ چھٹی صدی عیسوی میں اللہ کے آخری رسول کے ساتھ بنی اسرائیل کا رویہ اس کی گواہی دیتا ہے۔ وہ آپ کے لائے ہوئے دین کو اس طرح پہچانتے تھے جس طرح باپ اپنے بچے کو پہچانتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی اکثریت نے محض اس وجہ سے اسے قبول نہیں کیا کہ اس کا پیش کرنے والا ان کی قوم کا فرد نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ان میں وہ لوگ بھی تھے، جن کے نزدیک اللہ کا دین قوم و وطن اور حسب و نسب سے اونچا تھا۔ جب اُن کے سامنے اللہ کا دین آیا تو پکار اٹھے کہ یہی حق ہے، ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اور بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ دعا کرنے لگے کہ خدایا! ہم اس کے حق ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔ ہماری اس شہادت کو قبول فرما اور ہمیں ان لوگوں میں جگہ دے جنھوں نے تیرے دین کی گواہی دی:

وَ اِذَا سَمِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰۤى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۳﴾ (المائدة: ۸۳)	جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر نازل کیا گیا ہے تو تم دیکھو گے کہ حق کو پہچاننے کی وجہ سے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے۔ پس ہمیں بھی گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔

بعض چیزیں اللہ تعالیٰ کے دین پر غور و فکر کی راہ میں رکاوٹ بھی بنتی ہیں۔ چناں چہ دنیا کی محبت اور یہاں کی آسائش کی فکر انسان کے اوقات اور اس کی صلاحیتوں کو اس سے چھین لیتی ہے اور اسے اس بات کا موقع نہیں دیتی کہ وہ دین کو اپنے فکر کا موضوع بنائے اور یکسوئی کے ساتھ اس پر غور کرے۔ اسی طرح اقتدار کا نشہ دین پر غور و

فکر کی راہ میں ایک حجاب ہے۔ جب تک یہ نشہ دور نہ ہو دین کی طرف انسان کی توجہ نہیں ہوتی۔ ان کے علاوہ اور بھی اسباب ہیں جو انسان کو دین پر غور وفکر کرنے سے روکتے ہیں[1] لیکن اگر انسان میں حق کو دیکھنے اور پہچاننے اور سمجھنے کی صلاحیت ہے تو وہ ان تمام اسباب کو ہٹا کر اس طرح دین کی طرف بڑھتا ہے جیسے ان میں سے کوئی بھی سبب اس کی راہ کی رکاوٹ نہ ہو۔ اسی صلاحیت نے ملکۂ سبا کو دین کے قبول کرنے پر آمادہ کیا اور وہ ایمان لے آئی۔ اس کے برعکس اس صلاحیت کے نہ ہونے کی وجہ سے فرعون اس گھمنڈ میں پڑا رہا کہ میں ہی سب سے بڑا خدا ہوں۔ اس لیے کسی کے سامنے سر جھکانا میری توہین ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَ لَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ۝ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِى الْعُمْىِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ (النمل: ۸۰،۸۱)

تم مردوں کو سنا نہیں سکتے اور نہ بہروں کو سنا سکتے ہو (اور وہ بھی) جب کہ وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ رہے ہوں اور نہ تم اندھوں کو راستہ بتا کر بھٹکنے سے بچا سکتے ہو۔ تم تو صرف ان لوگوں کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں اور پھر فرماں بردار بن جاتے ہیں۔

قرآن کے اس فقرے کا مطلب کہ ”تم تو صرف ان لوگوں کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں“ اس وقت واضح ہوگا جب کہ آپ اسے اوپر کے جملوں کی روشنی میں دیکھیں، جن میں کہا گیا ہے کہ تم ان لوگوں کو جو مر چکے ہیں، جو اندھے اور بہرے ہیں اور جو پیٹھ پھیر کر بھاگ رہے ہیں، سنا نہیں سکتے۔ مطلب یہ ہے کہ وہی لوگ تمھاری بات سنیں گے اور اللہ کے دین پر ایمان لائیں گے، جن میں حق کو سننے اور قبول کرنے کی صلاحیت ہے، جن کے دل زندہ اور ضمیر بیدار ہیں۔ جو اللہ کا کلام سن کر اپنے کانوں میں انگلیاں نہیں ٹھونس لیتے، بلکہ اسے توجہ سے سنتے ہیں اور سمجھنے کی کوشش

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ہماری پچھلی بحث ’انکارِ دین کے اسباب‘۔

کرتے ہیں۔ اس صلاحیت کو قرآن نے زندگی اور حیات سے تعبیر کیا ہے۔ اگر یہ صلاحیت ہے تو اللہ کا دین ملتا ہے ورنہ انسان چلتی پھرتی میت ہے اور مردوں کو سنانا اللہ کے رسولوں کے بس میں بھی نہیں ہے۔ اللہ کے رسول کی بعثت اس لیے ہوتی ہے اور اس پر وحی اس لیے نازل ہوتی ہے:

لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ۝ (یٰسٓ:۷۰)

تاکہ ڈرائے اس شخص کو جو زندہ ہے اور کافروں پر حجت تمام ہوجائے۔

عبرت حاصل کرنے والے

اللہ تعالیٰ کے دین کو رد کرنا اس کے عذاب کو دعوت دینا ہے۔ جن قوموں نے اسے ٹھکرایا، وہ بالکل تباہ ہوگئیں اور دنیا کی کوئی قوت انھیں بچا نہ سکی۔ جس شخص کے اندر تاریخ کے اس واقعہ سے عبرت حاصل کرنے کی صلاحیت ہوگی وہ کبھی یہ جرأت نہیں کرسکتا کہ اللہ کے دین کو رد کردے۔ جب بھی دین کی آواز اس کے کان میں پہنچے گی وہ تیزی سے اس کی طرف لپکے گا اور بہ خوشی اسے قبول کرے گا۔ سورۂ قٓ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

وَ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ۝ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَ هُوَ شَهِيْدٌ۝ (قٓ:۳۶،۳۷)

ہم نے ان سے پہلے کتنی ایسی قوموں کو ہلاک کر دیا جو (اپنی) پکڑ میں ان سے زیادہ سخت تھیں (جب ان پر اللہ کا عذاب آیا تو) انھوں نے شہروں کو چھان مارا کہ کہیں کوئی جائے پناہ ہے؟ (لیکن ان کو کوئی پناہ نہ ملی) یقیناً اس میں نصیحت ہے اس شخص کے لیے جس کے (سینے میں زندہ) دل ہو یا جو کان لگا کر حضور قلب کے ساتھ بات سنے۔

ہر انسان فطرتاً نجات کا طالب ہے۔ کوئی بھی شخص ہلاک ہونا نہیں چاہتا۔ اس لیے اسے تاریخ کی تنبیہات سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ لیکن بعض اوقات انسان پر

غفلت اور بے حسی طاری ہو جاتی ہے۔ وہ ان تنبیہات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا اور ہلاکت سے بچنے کی خواہش کے باوجود ہلاکت ہی کی راہ پر بڑھتا چلا جاتا ہے۔ آخر ایک دن دین کی مخالفت کرنے والے بے شمار انسانوں کی طرح خود بھی بعد والوں کے لیے عبرت کا نمونہ بن جاتا ہے:

فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَ هِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَ بِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّ قَصْرٍ مَّشِيْدٍ﴿۴۵﴾ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ﴿۴۶﴾ (الحج:۴۵،۴۶)

کتنی ہی بستیاں ہیں کہ جب انھوں نے ظلم کی روش اختیار کی تو ہم نے ان کو ہلاک کر دیا اور اب وہ اپنی چھتوں پر الٹی پڑی ہیں اور کتنے کنویں بے کار پڑے ہیں اور کتنے ہی مضبوط محل (ویران ہو چکے ہیں) تو کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ ان کے ایسے دل ہوتے جو سمجھتے ہیں اور ایسے کان ہوتے جو سنتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔

دین کے طالب

اللہ تعالیٰ کا دین اس شخص کو ملتا ہے جو اسے چاہے۔ جس شخص کے اندر دین کی طلب ہی نہ ہو وہ اس سے محروم رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس معاملے میں اپنا قانون صاف الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔

يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ﴿۲۷﴾ (الرعد:۲۷)

وہ اپنے دین تک پہنچنے کا راستہ اس شخص کو دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے۔

اللہ تعالیٰ کے دین کے بغیر زندگی میں اتنا زبردست خلا پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر انسان بے حسی کی زندگی گزارنے کا عادی نہیں ہے تو اس کو دین کی طلب میں اس سے زیادہ بے چین ہونا چاہیے جتنا کہ وہ بھوک کے وقت غذا کے لیے بے قرار ہوتا ہے۔

کیوں کہ جن پہلوؤں سے یہ خلا پیدا ہوتا ہے، اسے اللہ کا دین ہی پُر کرسکتا ہے۔ کسی اور ذریعے سے اس کا پُر ہونا ممکن نہیں ہے۔ ان میں سے بعض پہلوؤں کی طرف یہاں اشارہ کیا جارہا ہے۔

(۱) ہر انسان یہ جاننا چاہتا ہے کہ اس کا کوئی خالق و مالک اور حاکم و معبود ہے یا نہیں اور اگر ہے تو اس سے اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اللہ کا دین اس سوال کا اس قدر صحیح اور اطمینان بخش جواب دیتا ہے کہ اگر انسان میں کسی نظریے پر غیر جانب داری سے غوروفکر کی صلاحیت ہے تو وہ بے اختیار پکار اٹھے گا کہ یہی حق ہے اور اسی کی مجھے تلاش ہے۔

(۲) انسان کو قانون کی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کو اس نے جب بھی خود سے پورا کرنا چاہا، سخت ناکام رہا۔ کیوں کہ یہ واقعہ ہے کہ اس کا بنایا ہوا ہر قانون توازن اور اعتدال سے محروم ہوتا ہے۔ اس میں ایک چیز کی رعایت پائی جاتی ہے تو دوسری چیز کا وجود ہی غائب ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اللہ کا دین ہمیں ایک ایسا قانون دیتا ہے جو افراط و تفریط سے بالکل پاک اور انتہائی متوازن ہے۔ اگر انسان اپنے بنائے ہوئے غیر معتدل قوانین کا اس سے مقابلہ کرے تو اس کا دل از خود گواہی دے گا کہ یہ کسی انسان کا تصنیف کردہ نہیں ہے بلکہ اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ اس کے باوجود اگر دین کی طلب اس کے اندر پیدا نہیں ہو رہی ہے تو اس دنیا میں کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے کہ دین خود بخود اس کے سینے میں اتر جائے۔

(۳) موت ایک ننگی تلوار ہے، جو ہر شخص کے سر پر لٹک رہی ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ موت کب آئے گی اور کب مدتِ حیات ختم ہوجائے گی؟ موت کے بعد کیا ہوگا؟ یہ ایک اہم سوال ہے جو ہر سوچنے سمجھنے والے انسان کو پریشان کیے ہوئے ہے۔ وہ جاننا چاہتا ہے کہ موت کے بعد کوئی خطرہ تو نہیں ہے تاکہ وہ سکون اور اطمینان کے ساتھ زندگی کی یہ تھوڑی سی مہلت جو اسے حاصل ہے گزار سکے، اور اگر کوئی خطرہ ہے تو اس سے محفوظ رہنے کی تدبیر کیا ہے؟ اللہ کا دین اسے بتاتا ہے کہ موت کے بعد یا تو وہ ہمیشہ

کے لیے کامیاب قرار پائے گا، یا اس کی ابدی ناکامی کا فیصلہ ہوگا۔ کامیاب وہ ہوں گے جو اس کو قبول کریں گے اور جو اس کو رد کریں گے وہ ناکامی سے کسی طرح اپنے آپ کو بچا نہیں سکتے۔ اس حقیقت کو اس نے بار بار اتنے زور دار طریقے سے اور اتنی قوت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ انسان کے لیے ممکن نہیں ہے کہ اس سے صرف نظر کرے۔

یہ ہیں وہ اسباب جن کی وجہ سے انسان کے اندر لازماً دین کی طلب پیدا ہونی چاہیے، جس شخص میں یہ طلب پائی جائے اللہ کا دین اسے یقیناً ملے گا۔ کیوں کہ جو شخص اللہ سے اس کا دین مانگے یہ اس کی رحمت سے بعید ہے کہ وہ اسے بے دینی میں پڑا رہنے دے اور اسی حال میں اس کو دنیا سے اٹھا لے۔

جن میں ہمت ہوتی ہے

اللہ تعالیٰ کا دین اس شخص کو ملتا ہے جس کے اندر حق کے لیے باطل سے لڑنے کی جرأت ہو۔ جو اس بات کے لیے تیار ہو کہ اللہ کے دین کے سامنے آنے کے بعد ہر قیمت پر اسے قبول کرے گا، جو دین کی خاطر بڑے سے بڑے فائدے، اعزاز اور منصب اور بڑی سے بڑی دولت کو قربان کر سکے اور جس میں یہ عزم و حوصلہ ہو کہ اللہ کا دین اس سے اس کی جان بھی مانگے تو بہ خوشی اسے نذر کر دے گا۔ عزم و ہمت ہو تو اللہ تعالیٰ ایک معمولی انسان کو بھی اپنے دین کا حامل بنا دیتا ہے اور اگر ہمت ہی نہیں ہے تو بڑے بڑے مفکر اور شاہانِ وقت بھی اس کے حق دار نہیں قرار پاتے۔ اس کی مثال ہمیں ان جادوگروں میں ملتی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں آئے تھے۔ فرعون نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ اپنے کرتب کے ذریعے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شکست دے دیں تو وہ اس کے دربار کے مقرب ہوں گے، لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جادوگر نہیں، بلکہ داعیِ حق اور اللہ کے رسول ہیں تو فوراً ان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ ایمان لے آئے۔ حالاں کہ وہ اس بات سے ناواقف نہیں

تھے کہ ان کا یہ اقدام ان کو فرعون کے غضب کا نشانہ بنا دے گا۔ لیکن انھوں نے اس کی پروا نہیں کی اور ہر مشکل کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ چناں چہ فرعون نے جب ان کو دھمکی دی کہ میں پہلے تمھارے ہاتھ پیر کاٹوں گا اور پھر تختۂ دار پر لٹکاؤں گا تو انھوں نے وہی جواب دیا جو ہر صاحبِ ایمان کو دینا چاہیے۔

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَ الَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ؕ﴿۷۲﴾ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَ مَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿۷۳﴾ (طٰہٰ: ۷۲، ۷۳)

یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ جو کھلی دلیلیں ہمارے سامنے آئی ہیں اور جس خدا نے ہمیں پیدا کیا ہے اس کے مقابلے میں تجھے ہم ترجیح دیں۔ پس تجھے جو کچھ کرنا ہے کر لے۔ تو دنیا کی اسی زندگی پر اپنا حکم چلا سکتا ہے۔ ہم تو اپنے رب پر ایمان لے آئے تا کہ وہ معاف کرے ہمارے گناہوں کو اور اس جادوگری کو جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا تھا اور اللہ بہتر ہے اور باقی رہنے والا۔

اللہ تعالیٰ کا دین اس طرح سامنے آتا ہے کہ کم ہمت انسان اسے دیکھ کر کانپ اٹھتا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں جو لوگ یہ کہتے ہوں کہ ''اگر ہم تمھارے ساتھ اس ہدایت کی اتباع کریں تو اپنی اس سرزمین سے نکال دیے جائیں گے'' (القصص: ۵۷) ان کا اللہ کے دین کو قبول کرنا آسان نہیں ہے۔ وہ سکون اور اطمینان چاہتے ہیں اور اللہ کا دین اُن لوگوں کو ملتا ہے جو خطرات کا سامنا کر سکتے ہوں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ کے دین کا استقبال ہمیشہ ان باہمت نفوس نے کیا ہے اور اب بھی وہی کر سکتے ہیں جن کو اس کے سوا کسی چیز کے پانے یا کھونے کی فکر نہیں ہوتی۔ بے ہمت انسان کو اپنی ہر متاعِ حقیر بہت بڑا سرمایہ معلوم ہوتی ہے۔ وہ اس سرمائے کو نہ کھوئے گا اور نہ اللہ کا دین اسے نصیب ہوگا۔

دعوت کے لیے
ضروری اوصاف

- ایمان باللہ
- ایمان بالآخرۃ
- قرآن مجید۔ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب
- نماز اور دعوتِ دین
- انفاق فی سبیل اللہ
- قربانی
- اخلاص۔ روحِ دین
- استقامت

دعوت کے لیے ضروری اوصاف

اسلام ایک دعوت ہے۔ جو لوگ اس دعوت کو قبول کریں ان پر یہ ذمے داری ڈالی گئی ہے کہ وہ اسے ساری دنیا میں پھیلائیں اور جب تک اس روئے زمین پر اس کا نہ ماننے والا ایک فرد بھی باقی ہے، اپنی جدوجہد جاری رکھیں۔ اتنے بڑے کام کے لیے انسان میں وہ اعلیٰ اوصاف بھی ہونے چاہئیں جو اسلام اس کے اندر دیکھنا چاہتا ہے۔ ان اوصاف کا پایا جانا ایک طرف تو اس بات کا ثبوت ہوگا کہ اس کی زندگی اسلام کے سانچے میں ڈھل چکی ہے اور دوسری طرف ان ہی سے اسلام کی دعوت کا بوجھ اٹھانے کی اس میں صلاحیت پیدا ہوگی، کیوں کہ یہ اس راہ کا بہترین ساز و سامان اور بہت بڑا سرمایہ ہیں۔ ان اوصاف کے ساتھ جب وہ دعوت کے میدان میں آئے گا تو مضبوط سیرت و کردار، بے پناہ قوتِ عمل اور غیر معمولی جوش و جذبہ کے ساتھ آئے گا۔ ان کے بغیر اس کی مثال اس کم زور، غیر تربیت یافتہ اور نہتے انسان کی ہوگی جسے محاذِ جنگ پر بھیج دیا جائے۔ ظاہر ہے اس سے کسی بڑے کارنامے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ وہ دشمن پر فتح کیا پائے گا اس کے مقابلے میں دیر تک جم بھی نہیں سکتا۔

اسلام کو اپنے ماننے والوں سے جو صفات مطلوب ہیں، یہاں ان سب کا احاطہ نہیں کیا گیا ہے، بلکہ کارِ دعوت کے لیے ان میں سے بعض صفات کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ لیکن اس سے بہرحال یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام ذہن و فکر کی کس طرح تربیت کرتا ہے اور اس کی خدمت کے لیے کن اوصاف کی ضرورت ہے۔

ایمان باللہ

ایمان باللہ دین کی اساس ہے

اللہ تعالیٰ پر ایمان اس کے دین کی اساس ہے۔ اسی سے مومن اور کافر کے درمیان فرق کیا جاتا ہے۔ انسان اس زندگی میں دو ہی طریقے اختیار کرسکتا ہے یا تو وہ اللہ تعالیٰ کا پرستار ہوگا یا شیطان کے پیچھے چلے گا۔ ہر وہ راہ جو اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی راہ سے ٹکراتی ہے شیطان کی راہ ہے اور یہ واقعہ ہے کہ شیطان کی راہ پر چلنے والا اللہ تعالیٰ تک کبھی نہیں پہنچ سکتا۔ اسلام انسان کے اندر خدا پرستی پیدا کرنا چاہتا ہے اور خدا پرستی کا آغاز ایمان سے ہوتا ہے۔ انسان اگر اپنے ایمان میں سچا اور مخلص ہے تو اس کی روح بندگی کے جذبات سے سرشار ہوگی اور اس کی پوری زندگی پر خدا پرستی چھا جائے گی۔ طاغوت سے اس کا رشتہ کٹ جائے گا اور خدا سے اس کا تعلق استوار ہوجائے گا۔

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۚ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵۶﴾ (البقرۃ:۲۵۶)

پس جو شخص طاغوت کا انکار کردے اور اللہ پر ایمان لے آئے تو اس نے ایک مضبوط رسی تھام لی جو کبھی ٹوٹنے والی نہیں ہے۔ اور اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

ایمان باللہ کے لازمی تقاضے

اللہ تعالیٰ پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے خود کو پوری طرح اس کے

حوالے کر دیا ہے۔ آپ نے اس کی بندگی میں اپنے آپ کو اس طرح دے دیا ہے کہ اب آپ پر کسی دوسرے کی حکومت قائم نہیں ہوسکتی۔ آپ دنیا میں صرف اللہ تعالیٰ کی بندگی کے لیے جی رہے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کی زندگی کا اور کوئی مقصد نہیں ہے۔ ایمان کے ذریعے آپ اس بات کا عہد کرتے ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے حکم کے تابع ہیں۔ آپ ٹھیک اس طرح زندگی بسر کریں گے جس طرح ایک وفادار بندہ زندگی بسر کرتا ہے۔ آپ اس طرف قدم بڑھائیں گے جس طرف اللہ تعالیٰ آپ کو قدم بڑھانے کا حکم دے اور آپ کے قدم اس جانب بڑھنے سے رُک جائیں گے، جس جانب بڑھتے ہوئے اللہ تعالیٰ آپ کو دیکھنا نہیں چاہتا۔ آپ جو بھی کام انجام دیں گے اللہ کی ہدایت کے عین مطابق انجام دیں گے۔ صرف اللہ کا فیصلہ آپ کے لیے فیصلہ ہوگا، کسی دوسرے کا فیصلہ آپ کے سر کو نہ جھکائے گا۔

ایمان عہدِ وفا ہے

بندگی کا یہ عہد آپ سے آپ کا سب کچھ چھین لیتا ہے۔ اگر آپ اس عہد میں سچے ہیں تو کوئی چیز آپ کی اپنی نہیں رہتی بلکہ اللہ تعالیٰ کی ہو جاتی ہے۔ اس عہد کے بعد آپ کا ذہن وفکر آپ کا نہیں بلکہ اللہ کا ہوگا۔ آپ اسی کی رضا کے لیے سوچیں گے اور اسی کی خوش نودی کے لیے فکر مند ہوں گے، آپ کو اللہ کی یاد کے سوا اور کوئی یاد نہ ستائے گی، آپ کے جذبات اللہ تعالیٰ کے لیے وقف ہوں گے، آپ کی خوشی اور غم کا محرک صرف اس کی ذات ہوگی۔ آپ اس کی محبت میں جئیں گے اور اس کی محبت ہی میں اپنی جان دیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہوگا تو آپ اپنے جانی دشمن کو سینے سے لگانے کے لیے تیار ہوجائیں گے اور اگر اس کی مرضی نہ ہو تو اپنی اولاد کو بھی اپنے سے جدا کرنے میں آپ کو تامل نہ ہوگا۔ آپ کے تمام اوقات پر اللہ تعالیٰ کا قبضہ ہوگا۔ آپ ہر اس مصروفیت سے دامن کش ہوں گے، جو آپ کو اس سے دور کردے۔ یہی صبح وشام

جن کی رنگینیوں میں دوسرے کھوئے ہوئے ہیں آپ کے لیے اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کا ذریعہ ہوں گے۔ اس کی خوش نودی آپ کا مقصود و مطلوب ہوگی اور آپ کی ہر جدوجہد کے پیچھے صرف یہ جذبہ کام کر رہا ہوگا کہ آپ اس سے قریب ہو جائیں۔ آپ جس حال میں بھی ہوں گے سراپا بندگی کی تصویر ہوں گے، آپ کی روح اس طلب میں بے چین ہوگی کہ اللہ تعالیٰ آپ سے خوش ہو جائے۔ آپ کی بہترین تمنا یہ ہوگی کہ کل اللہ کے حضور جب پیشی ہو تو اس کے سچے غلام کی حیثیت سے ہو۔ آپ اپنا سب کچھ لٹا چکنے کے بعد کانپتے ہوئے ہونٹوں سے بے تابانہ عرض کریں گے۔ مولا! جو کچھ تھا غلام نے حاضر کر دیا۔ اب تو قبول فرما!

اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾ (الانعام:۱۶۲)

یقیناً میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا رب ہے۔

ایمان اللہ تعالیٰ کی غلامی کا نام ہے اور اللہ تعالیٰ کی غلامی ایک اونچا منصب ہے جو ہر کسی کو آسانی سے حاصل نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ اپنی غلامی کے لیے اس شخص کو قبول کرتا ہے جو دل و جان سے اس کے لیے وقف ہو جانا چاہتا ہو۔ آپ اپنا بہترین وقت، اپنا قیمتی سرمایہ اور اپنی عمدہ صلاحیتیں اللہ تعالیٰ کے حوالے کرنے کے لیے ہر دم آمادہ ہیں تو اللہ تعالیٰ بھی آپ کو اپنی غلامی میں لینے کے لیے تیار ہے۔ آپ اپنا سب کچھ اس کی راہ میں صرف کر دیجیے تو آپ کو عبدیت کا بلند مقام حاصل ہوگا۔ اگر آپ اس مکمل حوالگی کے لیے آمادہ نہیں ہیں اور اللہ تعالیٰ کی غلامی کو اپنی زندگی میں محض ایک ذیلی حیثیت دینا چاہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کو ایسی ناقص غلامی منظور نہیں ہے۔ بہت سے کاروباری اپنا ایک حقیقی کاروبار رکھتے ہیں، جس پر وہ اپنی اصل قوت صرف کرتے ہیں اور ایک ان کا ضمنی کاروبار ہوتا ہے، جس کو وہ اپنے فاضل اوقات میں انجام دیتے ہیں، لیکن آپ اللہ تعالیٰ کی بندگی کو ضمنی طور پر اختیار نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ کی غلامی آپ کا مقصود و مطلوب ہے

تو اس کے لیے آپ کو اپنی پوری زندگی کا سودا کرنا پڑے گا۔ آپ اللہ تعالیٰ کے بندے اور غلام بن کر رہنا چاہتے ہیں اور اپنے اس ارادے میں مخلص ہیں تو اپنے آپ کو پوری طرح اس کی غلامی میں دے دیجیے۔ جو شخص کسی ایک آقا کا غلام بن چکا ہو اس کے لیے یہ بات ہرگز زیب نہیں دیتی کہ وہ ایک لمحہ کے لیے بھی دوسرے کی غلامی پسند کرے۔ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا کہ آپ غیر کی غلامی میں لگے ہوئے ہیں اور بے کار کے اوقات میں اللہ تعالیٰ کا نام لے کر اس کی غلامی کی سند حاصل کرلیں۔ اللہ تعالیٰ بے حد غیور ہے۔ وہ شرک کو گوارا نہیں کرتا، جو شخص اس کی غلامی کے ساتھ دوسرے کی غلامی کا پیوند لگائے وہ ایسی غلامی کو قبول نہیں کرتا۔ وہ اپنی غلامی میں صرف اس شخص کو لیتا ہے جو غلامی کے ہر بندھن کو توڑ کر تنہا اس کی غلامی کا قلادہ اپنی گردن میں ڈال لے۔

اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی بندگی میں اس طرح آتا ہے کہ کسی معاملہ میں فیصلہ کا اختیار اس کو نہیں دینا چاہتا تو صحیح معنی میں وہ ابھی اس کی بندگی میں داخل ہی نہیں ہوا ہے۔ جب تک انسان اپنی مرضی سے دست کش نہ ہوجائے اور اپنی ہر چیز کو اللہ کے حوالے نہ کردے، اس کا بندہ نہیں بن سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا مطالبہ ہم سے جزوی غلامی کا نہیں بلکہ کلی غلامی کا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿٢٠٨﴾ (البقرة:۲۰۸)	اے ایمان والو! تم پورے کے پورے اسلام میں داخل ہوجاؤ اور شیطان کے پیچھے نہ چلو وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

وفاداری اور بے وفائی یکجا نہیں ہوسکتے

بعض اوقات انسان سوچتا ہے کہ اس کو ایمان کی دولت حاصل ہے لیکن اس کے باوجود اس کی زندگی روحِ بندگی سے خالی ہوتی ہے۔ وہ اقرار کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کا مالک اور آقا ہے لیکن اللہ کی اطاعت اور بندگی کے لیے اس کے اندر کوئی بے چینی

اور تڑپ نہیں پائی جاتی۔ وہ اللہ پر ایمان کا دعویٰ کرتا ہے لیکن اس کے لیے قربانی اس کو ناگوار گزرتی ہے۔ وہ اللہ سے محبت کا اظہار کرتا ہے لیکن دنیا کی محبت اس کے دل و دماغ پر چھائی رہتی ہے۔ وہ بار بار اللہ کا نام لیتا ہے لیکن اس کے اعمال پر اللہ کی حکومت قائم نہیں ہوتی۔ یہ ایک کھلا ہوا تضاد ہے۔ دنیا کی محبت اور اللہ کی محبت کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتیں۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ انسان کا سینہ اللہ کے خوف سے بھی کانپ رہا ہو اور دوسروں کا خوف بھی اسے کھائے جا رہا ہو۔ اللہ تعالیٰ پر انسان کا ایمان بھی ہو اور اس کا دل قربانی کے جذبے سے خالی بھی ہو۔ ایمان تو وہ چیز ہے جو باپ کے ہاتھ سے بیٹے کے حلق پر چھری چلا دیتا ہے اور بیٹے کو باپ کے خلاف کھڑا کر دیتا ہے، جو جسم و جان کے رشتے سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے انسان کے تعلق کو مضبوط کرتا ہے، جو مال و دولت کی محبت کو نکال کر اللہ کی محبت کو دل کی گہرائیوں میں اتارتا ہے، جو انسان کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اللہ کو خوش کرنے کے لیے گھر بار اور قوم و وطن کی بندشوں کو توڑ دے۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيٓ إِبْرٰهِيْمَ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ إِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَ مِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؗ كَفَرْنَا بِكُمْ وَ بَدَا بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ أَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ (الممتحنہ:۴)

تمھارے لیے اچھا نمونہ ہے ابراہیم اور اس کے ساتھیوں میں جب کہ انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم بری ہیں تم سے اور تمھارے معبودوں سے جن کی تم اللہ کے سوا پرستش کرتے ہو۔ ہم تمھارے چال چلن کے منکر ہیں۔ ہمارے اور تمھارے درمیان ہمیشہ کے لیے دشمنی اور عداوت ظاہر ہوچکی ہے۔ یہاں تک کہ تم اللہ واحد پر ایمان لے آؤ۔

ایمان انسان کو اللہ تعالیٰ کا مخلص اور وفادار بندہ بناتا ہے۔ وہ اس کے سوا کسی کو خدائی کا مقام دینے یا خدائی میں شریک کرنے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوتا۔ ایمان کی حقیقت جب کسی پر کھل جاتی ہے تو اس کے دل پر باطل کا قبضہ نہیں رہتا اور وہ پوری طرح اللہ کی غلامی میں چلا آتا ہے۔ جھوٹ سے انسان اسی وقت دھوکا کھاتا ہے جب

کہ وہ سچائی سے ناواقف ہوتا ہے۔ اگر سچائی بے نقاب ہوچکی ہے تو جھوٹ کا اثر ختم ہوجانا چاہیے۔ جھوٹ کی اگر حکومت ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ سچائی ابھی نگاہوں سے اوجھل ہے۔ جس شخص کو یہ یقین حاصل ہو کہ وہ اللہ کا بندہ ہے اور اس کی بندگی کے سوا کوئی دوسری روش اس کے لیے صحیح نہیں ہے وہ کیسے اس سے بغاوت کی روش اختیار کرسکتا ہے۔ ایمان وہ چیز ہے جس سے مردہ دل زندگی پاتے ہیں۔ اس لیے ممکن نہیں ہے کہ انسان کے دل میں ایمان بھی ہو اور اس پر موت کی سی غفلت بھی طاری ہوجائے۔ ایمان محض ایک نظریہ نہیں ہے جو ذہن میں پیدا ہوتا اور ذہن ہی میں دفن ہو جاتا ہے، بلکہ یہ ایک انقلابی فکر ہے جو انسان کو سراسر بدل دیتا ہے، جو انسان کو دنیا کے ہر اقتدار سے نکال کر ایک اکیلے خدا کے اقتدار میں پہنچا دیتا ہے۔

روایتی ایمان اور حقیقی ایمان

اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے یہ ایک بڑی نعمت ہے کہ اس نے ہم کو ایسا خاندان اور ماحول عطا کیا جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان رکھتا ہے۔ اگر اس ماحول کے بجائے کسی دوسرے ماحول میں ہم پیدا ہوتے تو نہیں معلوم آج ہم اللہ تعالیٰ کا نام بھی لیتے یا نہ لیتے، لیکن اس اعتراف کے ساتھ اس حقیقت کو بھی ماننا پڑے گا کہ ایمان ایسی چیز نہیں ہے جو محض ماحول کے زیرِ اثر اختیار کی جائے، بلکہ ایمان ذہن وفکر کے فیصلے کا نام ہے۔ اس کو وراثت میں ملنے والا ساز و سامان نہیں، بلکہ اپنی کمائی ہوئی دولت ہونا چاہیے۔ بلاشبہ اصطلاحی معنی میں ہم کسی ایسے شخص کو کافر نہیں کہہ سکتے جو اللہ اور اس کے رسول کا اقرار کرتا ہو، خواہ یہ اقرار اپنے گھر اور ماحول کے زیر اثر ہی کیوں نہ ہو۔ جو انسان دین کی بنیادی باتوں کو مانتا ہے وہ مومن ہے۔ کسی کو قطعاً یہ حق نہیں حاصل ہے کہ اس کو ایمان کے دائرے سے خارج کردے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ یہ ایمان وہ ایمان نہیں جو انسان کو یکسر بدل کر رکھ دیتا ہے۔ یہ وہ یقین نہیں

جس سے کفر و شرک کے پردے چاک ہوتے ہیں۔ یہ ایمان اس روح سے خالی ہے جو کسی انسان میں داخل ہوتا ہے تو اس کو ایک نیا وجود عطا کرتا ہے۔ حق کی آواز پر انسان اگر دوڑ پڑے تو اس کو ایمانی زندگی نصیب ہوتی ہے۔ اس زندگی سے محرومی کے معنی ہی یہ ہیں کہ حق کی آواز اس کے کانوں تک نہیں پہنچی اور اگر پہنچی ہے تو ابھی اس نے اس پر لبیک نہیں کہا ہے:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا ٱسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ ۖ (الانفال: ۲۴)

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی پکار پر لبیک کہو جب کہ رسول تمھیں اس چیز کی طرف بلائے جو تمھیں زندگی بخشنے والی ہے۔

یہاں اس حقیقت کو نہ بھولنا چاہیے کہ ایمان کے حقیقی ثمرات اسی وقت پیدا ہوتے ہیں، جب کہ وہ شعوری ایمان ہو۔ روایتی ایمان سے کبھی اس کے مطلوبہ نتائج ظاہر نہیں ہوسکتے۔ اگر آپ اپنا تھوڑا سا وقت بھی اس سوال کے حل کرنے میں صرف کرنا نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات کا خالق و مالک ہے تو وہ ہم سے کیا چاہتا ہے؟ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ روایتی ایمان پر قانع ہیں اور اس کو شعوری اور حقیقی ایمان میں بدلنے کے لیے فکر مند نہیں ہیں، اس لیے آپ کو ان بہترین ثمرات کی بھی توقع نہیں رکھنی چاہیے جو صرف شعوری ایمان کے ساتھ مخصوص ہیں۔ روایتی ایمان ورثہ کے طور پر ملتا ہے اور شعوری ایمان زندگی میں انقلاب بن کر داخل ہوتا ہے۔ اگر آپ صرف روایتی ایمان پر قانع ہیں تو آپ کے اندر ایمانی انقلاب کبھی نہیں آسکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ایمان و یقین کی جڑیں آپ کے دل میں اتر چکی ہوں اور آپ کے افکار و اعمال پر اس کی حکومت قائم ہوچکی ہو۔

ہر انقلاب دلیل و برہان کی روشنی میں آتا ہے۔ بے دلیل دعویٰ کبھی کسی انسان کو بدل نہیں سکتا۔ اس سے وقتی جوش و خروش تو پیدا ہوسکتا ہے لیکن وہ طاقت حاصل نہیں ہوسکتی جو انسان کو مستقل سرگرمِ عمل رکھتی ہے۔ بے دلیل دعویٰ انسان کے اندر بزدلی پیدا

کرتا ہے لیکن جس دعوے کے پیچھے دلیل ہو وہ انسان کو جرأت مند اور باحوصلہ بنا دیتا ہے۔ آپ کسی ایسے مقصد کے لیے قربانی نہیں دے سکتے، جس کا حق ہونا آپ کے نزدیک ثابت نہ ہو۔ لیکن اگر آپ نے کسی مقصد کو حق سمجھ کر قبول کیا ہے تو قربانی کی راہ آپ کے لیے آسان ہوجائے گی۔ اس کے لیے آپ اپنا سب کچھ لٹا سکیں گے۔ اس کی خاطر آپ کی دنیا آپ سے چھن جائے تو بھی آپ کو غم نہ ہوگا۔ آپ کو یہ خواہش اور تمنا پریشان نہ کرے گی کہ کسی بھی قیمت پر آپ کا اور آپ کے بچوں کا مستقبل تاب ناک ہو۔ آپ اس فکر سے بے نیاز ہوں گے کہ آپ کی قربانیوں کا کوئی صلہ آپ کو مل رہا ہے یا نہیں؟ جس مقصد کو آپ نے حق سمجھ کر پورے شعور کے ساتھ قبول کیا ہے وہ ہمیشہ آپ کی نگاہوں کے سامنے ہوگا۔ اس سے آپ کے سینے میں حرارت پیدا ہوگی اور آپ کے عزائم کو مسلسل تحریک ملتی رہے گی۔ اس کے ہوتے ہوئے آپ غفلت اور بے حسی کی شکایت نہ کریں گے۔ آپ کسی بھی چیز کی محبت میں اس مقصد کو بھولنے والے نہ ہوں گے۔

یہی حال اللہ تعالیٰ پر ایمان کا ہے۔ اگر آپ نے اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کو پورے شعور کے ساتھ اپنے ذہن میں جگہ دی ہے تو ممکن نہیں کہ آپ کے فکر و عمل کی دنیا میں جمود پایا جائے اور آپ کے اندر کوئی ہلچل اور اضطراب نہ ہو۔ اگر یہ ناممکن ہے کہ آگ ہو اور اس کی گرمی نہ محسوس کی جائے تو یقین مانئے کہ اس سے زیادہ یہ بات ناممکن ہے کہ ایمان کی حرارت موجود ہو اور انسان کا دل سرد خانہ بنا رہے۔ قرآن نے پیغمبروں کی تاریخ بیان کی ہے۔ یہ تاریخ بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر اندھی تقلید نہیں کرتے تھے، بلکہ اپنے موقف پر علیٰ وجہ البصیرت جمے ہوئے تھے۔ وہ جو کچھ کہتے دلیل کی روشنی میں کہتے۔ ان کے ہر دعوے کے پیچھے استدلال کی قوت ہوتی۔ ہر پیغمبر اس اعلان کے ساتھ اپنی قوم کے سامنے آتا کہ اس کے پاس اللہ کی عطا کردہ دلیل موجود ہے۔ یہی دلیل و برہان کی قوت تھی جس کی وجہ سے پیغمبروں کی تاریخ مسلسل جدوجہد کی تاریخ،

قربانی اور ایثار کی تاریخ اور عزم و حوصلہ کی تاریخ بن گئی۔

ایمان اور نفاق کی پہچان

اللہ تعالیٰ پر ایمان جتنا قوی اور مضبوط ہوگا اس سے اتنا ہی اعلیٰ کردار وجود میں آئے گا۔ اگر اس پر ضعف اور اضمحلال طاری ہو جائے تو سیرت و کردار پر بھی لازماً اس کا اثر پڑے گا۔ ایمان کی کم زوری کے ساتھ بلند کردار کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اس لیے ضعفِ ایمان سے چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔ اس کا علاج جلد ہونا چاہیے۔ ورنہ یہ کبھی نفاق کی طرف بھی لے جاسکتا ہے۔ نفاق دین و ایمان کے لیے سخت تباہ کن ہے۔ جس شخص کو نفاق کا روگ لگ جائے اور جڑ پکڑ لے وہ دین کے معاملہ میں کبھی مخلص اور یکسو نہ ہوگا، کفر و ایمان کے درمیان ہمیشہ تذبذب اور بے یقینی کا شکار رہے گا۔ ایک قدم آگے بڑھے گا تو دس قدم پیچھے ہٹے گا۔ حق کو اچھی طرح پہچاننے کے باوجود اس کی خاطر کسی تکلیف کو برداشت کرنے کے لیے ہرگز تیار نہ ہوگا۔ بزدلی اور پست ہمتی اس کا ساتھ نہ چھوڑے گی۔ اس کے برخلاف ایمان، یقین کی دولت عطا کرتا ہے، عزم و حوصلہ، استقامت اور پامردی پیدا کرتا ہے، حق کے لیے جینا اور مرنا سکھاتا ہے۔ ایمان تو وہ ہے جس سے مخالفت کے طوفانوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت ملتی ہے، دین کی سربلندی کے لیے جان و مال کی قربانی دینے میں پس و پیش اور تامل نہیں ہوتا۔ اس راہ میں سر کٹانا اور مال لٹانا آسان ہوتا ہے۔

ان پہلوؤں کی طرف سورۂ احزاب (آیت: ۹ تا ۲۷) میں تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

جنگ احزاب میں مدینہ کے اوپر (مشرق کی جانب) سے اور نیچے (مغرب کی طرف) سے دشمنوں کے لشکر امنڈ آئے۔ ان کی تعداد، جوش و خروش، کرّ و فر، ساز و سامان اور تیاری کو دیکھ کر، کلیجے منہ کو آرہے تھے، کم زور ایمان والوں کے دل لرز رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور وعدوں کے بارے میں طرح طرح کے خیالات اور

وسوسے جگہ پانے لگے تھے۔ اس وقت منافقین خود اپنی زبان سے جن جذبات کا اظہار کر رہے تھے اس سے ان کا خبثِ باطن کھل کر سامنے آ رہا تھا۔ کہنے لگے اللہ اور اس کے رسول نے تو ہم سے کہا تھا کہ عرب و عجم سب تمھارے زیرِ نگیں ہوں گے اور ہر طرف اس کے دین کا پرچم لہرائے گا، لیکن اب تو صاف نظر آ رہا ہے کہ یہ سب طفل تسلی کی باتیں تھیں۔ یہاں تو جان بچانی مشکل ہو رہی ہے۔

مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا ⑫ ہم سے اللہ اور اس کے رسول نے جو وعدہ کیا تھا وہ محض ایک دھوکا تھا۔ (الاحزاب:۱۲)

ان میں کا ایک گروہ اپنے دوست احباب اور ساتھیوں سے کہہ رہا تھا کہ اب تو یہاں رہنے کی بھی کوئی صورت نہیں ہے۔ جن مقامات اور بستیوں کو چھوڑ کر تم یہاں آئے ہو وہیں لوٹ چلو ورنہ پیس دیے جاؤ گے۔

بعض لوگ اپنے نفاق پر پردہ ڈالنے کے لیے عذر تراشنے لگے کہ ہمارے گھر غیر محفوظ اور کھلے پڑے ہیں۔ اس لیے ہمیں محاذ سے واپس جانے کی اجازت دی جائے۔ قرآن نے کہا وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ (فی الواقع ان کے گھر غیر محفوظ نہیں تھے) عورتوں اور بچوں کی حفاظت کا پہلے سے انتظام کرلیا گیا تھا۔ عذر بے معنی تھا۔ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ⑬ [الاحزاب:۱۳] (وہ تو بس محاذ سے فرار ہونا چاہ رہے تھے)۔

قرآن نے کہا اگر مدینہ پر چاروں طرف سے دشمن حملہ کردے تو وہ اپنا دین و ایمان بھی چھوڑ بیٹھیں گے اور فتنۂ ارتداد ان میں پھوٹ پڑے گا۔ اس کے بعد ایک اہم بات فرمائی:

وَ لَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ ۭ وَ كَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْـُٔوْلًا ⑮ (الاحزاب:۱۵) انھوں نے اس سے پہلے اللہ سے عہد کیا تھا کہ وہ پیٹھ نہیں پھیریں گے۔ اللہ سے جو عہد کیا گیا ہے اس کے بارے میں ضرور سوال ہوگا۔

اسلام اس بات کا عہد و پیمان ہے کہ آدمی ہر حال میں اللہ کے دین پر قائم رہے

گا اور اس کی نصرت و حمایت میں جان و مال کی قربانی سے دریغ نہ کرے گا۔ انھوں نے اسلام کا اعلان کرکے یہی عہد کیا تھا۔ ان میں سے کتنے ہی تھے جنہوں نے کہا تھا کہ جنگِ بدر واحد میں ہم اپنی جاں نثاری کا ثبوت نہیں پیش کرسکے تھے، اب کوئی موقع آیا تو اس کی تلافی کردیں گے اور سرفروشی و جاں سپاری میں کسی سے پیچھے نہیں رہیں گے۔ ان سب باتوں کے باوجود اس نازک گھڑی میں جس طرح انہوں نے راہِ فرار اختیار کی وہ اس عہد و پیمان کی صریح خلاف ورزی تھی۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی ضرور باز پرس ہوگی۔

ان منافقین کے بارے میں کہا گیا اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ (وہ تمھارے معاملے میں سخت بخیل ہیں) اس کا مفہوم یہ ہے کہ انہیں تمہارے غریبوں، حاجت مندوں اور ناداروں سے کوئی ہم دردی نہیں ہے، وہ ان پر اپنا مال خرچ کرنا نہیں چاہتے۔ دین کی دعوت اور اس کی سربلندی کی جو جدوجہد ہو رہی ہے اس میں ان کی دولت کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ جہاد میں یا جہاد کی تیاری میں شریک ہونے اور اپنا مال صرف کرنے پر ان کے اندر کوئی آمادگی نہیں ہے۔ کسی کارِ خیر میں تمہیں ان کی ہم دردی حاصل نہ ہوگی۔

اس کے ساتھ فرمایا اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ (وہ مال کے حریص ہیں) جنگ کا ذکر ہوتو وہ تمھیں اس طرح دیکھتے ہیں جیسے موت کی غشی ان پر طاری ہو، جب جنگ کا خطرہ ٹل جائے اور مالِ غنیمت تقسیم ہو رہا ہو تو ان کی چرب زبانی دیکھنے کی ہوتی ہے کہ مال غنیمت میں ان کا بھی حصہ ہونا چاہیے۔ وہ بھی اس کے حق دار ہیں۔

اس نازک وقت میں رسول اللہ ﷺ نے جس استقامت، صبر و ثبات، جرأت و ہمت، توکل علی اللہ اور ایثار و قربانی کا ثبوت دیا وہ ایک بے مثال اسوہ ہے۔ اللہ کی ذات اور آخرت پر ایمان ہو تو آدمی اس اعلیٰ نمونہ کو ہمیشہ پیش نظر رکھے گا اور اس کی اتباع کی کوشش کرے گا۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ	تمہارے لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات میں بہترین نمونہ ہے ہر اس شخص

الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿۲۱﴾ (الاحزاب:۲۱) — کے لیے جو اللہ اور آخرت کے دن پر یقین رکھے اور اللہ کو کثرت سے یاد کرے۔

سچے اور مخلص اہلِ ایمان نے جب دیکھا کہ کفار کا دَل بادل مدینہ پر یورش کر بیٹھا ہے تو وہ ہراساں ہوئے اور نہ ہمت ہاری، بلکہ اس سے ان کے ایمان و یقین میں اضافہ ہوگیا کہ جن مراحل سے گزر کر حق کامیاب و سربلند ہوتا ہے وہ مراحل آ گئے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ نے جو وعدے کیے تھے یا قیصر وکسریٰ کا دور ختم ہونے اور روم و فارس کی فتح و کامرانی کی جو بشارت دی جا رہی تھی، اس کے ظہور کا وقت آن پہنچا ہے۔

وَ لَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ صَدَقَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ ۫ وَ مَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِيْمَانًا وَّ تَسْلِيْمًا ﴿۲۲﴾ (الاحزاب:۲۲)

جب اہل ایمان نے لشکر دیکھے تو کہا کہ یہ تو وہ چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا تھا۔ اس نے ان کے ایمان اور (جذبۂ) تسلیم و رضا ہی میں اضافہ کیا۔

ایمان و یقین اور خودسپردگی کے اس جذبہ کے تحت ان میں سے بہت سوں نے اپنی جان کے نذرانے پیش کردیے اور بہت سے سر ہتھیلی پر لیے شہادت کی تمنا میں جی رہے ہیں۔ اللہ سے جو عہدِ وفا باندھا تھا اسے بعض نے پورا کر دکھایا اور بعض بے تاب ہیں کہ کب وقت ملے اور کب اس کا ثبوت فراہم کیا جائے۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَ مَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾

(الاحزاب:۲۳)

ایمان والوں میں سے کتنے ہی ہیں جنھوں نے اس عہد کو سچ کر دکھایا جو انھوں نے اللہ اور اس کے رسول سے کیا تھا۔ ان میں سے بعض نے اپنا ذمہ پورا کر دیا (جان دے دی) اور بعض اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ اللہ سے جو عہد انھوں نے کیا تھا اس میں ذرہ برابر انھوں نے تبدیلی نہیں کی۔

ایمان سے سیرت و کردار میں ایک خوب صورت انقلاب رونما ہوتا ہے اور اعلیٰ

اور پاکیزہ اوصاف نشو ونما پاتے ہیں، اس کے برعکس نفاق سے دوسری ہی قسم کی صفات وجود میں آتی ہیں۔ یہ خود غرضی، مفاد پرستی اور ناقابلِ اعتماد کردار کو جنم دیتا ہے، قرآن مجید نے مختلف مقامات پر بہت تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے۔ یہاں جنگ اور خاص طور پر جنگِ احزاب کے موقع پر اہل ایمان نے جس پختہ کردار کا ثبوت دیا اور منافقین سے سیرت و کردار کی جو پستی اور گراوٹ دیکھنے میں آئی اس کی تصویر کشی کی گئی ہے[1]

دعوتِ دین بھی ایک طرح کی معرکہ آرائی ہے۔ یہ باطل کی جگہ حق کے قیام کی سعی و جہد ہے۔ اس میں کامیابی کے لیے بہت ہی قوی ایمان چاہیے۔ اس راہ میں ایسے نازک مراحل آسکتے ہیں اور آتے رہے ہیں کہ نفاق اور کم زور ایمان کے ساتھ آدمی کے قدم جم ہی نہیں سکتے۔

اللہ سے تعلق اور محبت روحِ ایمان ہے

اللہ تعالیٰ سے محبت اور قلبی تعلق دین کی روح ہے۔ منکرین خدا کو اپنے غلط عقیدہ وفکر سے، اصنام پرستوں کو اصنام سے، عوام کو اپنے رہنماؤں اور لیڈروں سے محبت ہوتی ہے۔ بعض اوقات یہ محبت اس طرح ہوتی ہے جیسے وہ ان کے خدا ہیں اور وہ اپنے خدا سے محبت کرتے ہیں، لیکن یہ ساری محبتیں ناپائے دار ہیں۔ اگر آدمی کو یقین ہوجائے کہ اس کا محبوب اس کا ساتھ نہیں دے گا اور مشکل وقت میں اسے بے یار و مددگار چھوڑ دے گا یا وہ اس محبت کے نتیجے میں نقصان میں رہے گا تو یہ محبت ختم ہو جاتی ہے۔ چناں چہ مشرکین کی کشتی بھنور میں پھنستی ہے تو وہ اپنے خود ساختہ معبودوں کو بھول جاتے ہیں اور اللہِ واحد کو پکارنے لگتے ہیں (یونس:۲۲)۔ یہ اس دنیا کا حال ہے، جہاں تک آخرت کا تعلق ہے وہاں سارے جھوٹے خداؤں کی خدائی ختم ہوجائے گی۔ وہ اور ان کے چاہنے والے ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں گے۔

---

[1] جنگ احزاب جن حالات میں ہوئی اس سے واقفیت کے لیے اسلامی تاریخ کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

اللہ کے چاہنے والے اس سے جس طرح محبت کرتے ہیں اس کی شان ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ اللہ سے ان کی محبت جھوٹے خداؤں کے پرستاروں کی محبت سے ہزار ہا گنا زیادہ ہوتی ہے۔ دکھ، سکھ، راحت، تکلیف، خوش حالی، بدحالی، مرض و صحت کسی بھی حال میں ان کا رشتۂ محبت نہیں ٹوٹتا۔ وہ سمجھتے ہیں سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ وہ صبر و شکر کا پیکر ہوتے ہیں اور اسی کے دامنِ عاطفت میں سکون پاتے ہیں۔ نازک سے نازک حالات میں بھی اس کا دامن پکڑے رہتے ہیں۔ کسی اور کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے اور اسی سے خیر کی توقع رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پر یہ توکل اور اعتماد صرف اس کے مخلص ماننے والوں ہی کو حاصل ہوتا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَنۡدَادًا يُّحِبُّوۡنَهُمۡ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ (البقرۃ:۱۶۵)

لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو دوسروں کو اللہ کا شریک اور ہم سر بناتے ہیں ان سے ایسی ہی محبت کرتے ہیں جیسے اللہ سے محبت (ہونی چاہیے) وہ لوگ جو ایمان لائے ان کو اللہ سے اس سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا اہلِ ایمان پر بہت بڑا کرم اور احسان ہوتا ہے کہ وہ ان کے دلوں میں اپنی محبت ڈال دیتا ہے اور کفر اور فسق و فجور سے ان کے اندر نفرت پیدا کر دیتا ہے۔ اس دولت کا ملنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کو رشد و ہدایت سے نوازا گیا اور ضلالت و گم راہی سے بچا لیا گیا ہے۔

وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيۡكُمُ الۡاِيۡمَانَ وَ زَيَّنَهٗ فِىۡ قُلُوۡبِكُمۡ وَ كَرَّهَ اِلَيۡكُمُ الۡكُفۡرَ وَ الۡفُسُوۡقَ وَالۡعِصۡيَانَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوۡنَ ۝ (الحجرات:۷)

...لیکن اللہ نے تمھیں ایمان کی محبت سے نوازا اور تمھارے دلوں کو اس سے آراستہ کر دیا۔ تمھارے لیے کفر و فسق اور نافرمانی کو ناپسند کر دیا۔ یہی لوگ ہدایت پانے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی محبت سے جب دل کی دنیا آباد ہو جاتی ہے تو خود بہ خود کفر، فسق و

فجور اور معصیت سے نفرت اور دوری ہونے لگتی ہے۔ اللہ سے محبت اور کفر و معصیت سے محبت دونوں طرح کی محبتیں ایک دل میں جمع نہیں ہوسکتیں۔

اللہ سے محبت کرنے والے اہلِ ایمان سے محبت کرتے ہیں

اللہ تعالیٰ سے محبت ہوگی تو اس پر ایمان و یقین رکھنے والوں اور اس کے فرماں برداروں سے بھی محبت ہوگی۔ ان سے ذہنی قربت اور قلبی تعلق محسوس ہوگا، ان کی خدمت باعثِ راحت ہوگی اور ان کے ساتھ لطف و محبت کے برتاؤ سے ایک طرح کا سکون محسوس ہوگا اور ان کے دکھ درد میں ہم دردی کے جذبات خود بہ خود ابھریں گے۔ آدمی ان کا احترام و اکرام کرے گا، انھیں حقارت کی نظر سے نہیں دیکھے گا، ان کے مقابلے میں اپنی بڑائی یا تکبر و نخوت کا مظاہرہ نہ کرے گا، بلکہ تواضع و خاک ساری اختیار کرے گا۔ یہی چیز اہلِ ایمان کو ایک مضبوط ملت بنائے رکھتی ہے اور ان کے شیرازہ کو بکھرنے نہیں دیتی۔

اللہ سے محبت کرنے والے اس کے باغیوں کے سامنے نہیں جھکتے

اللہ سے محبت کرنے والے انسان کے کردار کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کے مقابلے میں جو اللہ کے منکر اور باغی ہیں اور اس کے دین کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں، استقامت کا پہاڑ بن کر کھڑا ہوگا۔ وہ اسے جھکا نہ سکیں گے، اس کے اندر لوہے کی سی صلابت ہوگی اور وہ اسے نرم چارہ نہ پائیں گے۔ اللہ کے دین کو اختیار کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے پر اسے کتنا ہی ہدفِ ملامت بنایا جائے اور اس پر لعن طعن کے کتنے ہی تیر برسائے جائیں وہ پسپائی قبول نہ کرے گا اور ہر وار کو اپنے سینے پر لیتے ہوئے آگے بڑھے گا اور بغیر کسی خوف و خطر کے حق کی آواز بلند کرتا رہے گا۔ یہی حقیقت ان آیات میں بیان ہوئی ہے۔

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ　　اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو تم میں سے جو

دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۴﴾

(المائدۃ:۵۴)

کوئی دین سے پھر جائے تو (اسے معلوم ہونا چاہیے کہ) اللہ بہت جلد ایسے لوگوں کو لے آئے گا جن سے وہ محبت کرے گا جو اس سے محبت کریں گے، مسلمانوں کے لیے وہ نرم خو ہوں گے اور کافروں کے مقابلے میں سخت ہوں گے، اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت گر کی ملامت سے خوف نہیں کھائیں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے نوازتا ہے اور اللہ وسعت والا اور علم والا ہے۔[۱]

جو محبت اللہ کی محبت کے تابع ہو وہ جائز ہے

اس دنیا میں انسان، نامعلوم کن کن چیزوں سے محبت کرتا اور انھیں عزیز رکھتا ہے۔ اسے فطری طور پر ماں باپ سے، بیوی بچوں سے، دوست احباب سے، خویش و اقارب سے اور ایسے ہی بہت سے افراد اور اشخاص سے محبت ہوتی ہے۔ وہ اسبابِ حیات

---

۱ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (کافروں کے مقابلے میں سخت) کے الفاظ سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والا انسان منکروں اور باغیوں سے ہر آن برسرِ پیکار رہتا ہے اور ان کے ساتھ قدم قدم پر سخت اور جارحانہ رویہ اختیار کرتا ہے۔ جو بات یہاں کہی گئی ہے اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ سے محبت کرنے والے اپنے دین و ایمان پر سختی سے جمے رہتے ہیں۔ اہلِ کفر انھیں اس سے پھیر نہیں سکتے۔ اس طرح کے ہر موقعے پر ثابت ہوگا کہ وہ کوہِ عزیمت ہیں جنھیں اپنی جگہ سے ہٹانا ممکن نہیں ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ حالتِ جنگ ہو اور اہل ایمان کو باطل قوتوں سے مقابلہ کرنا پڑے تو وہ استقامت اور پامردی کا ثبوت دیتے ہیں۔ بزدلی اور نامردی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ اس لحاظ سے یہ بات ایک خاص پس منظر میں کہی گئی ہے۔ اس کے فوراً بعد يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (وہ اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں) کا جملہ اس کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ عام حالات میں اسلام نے مخالفین کے ساتھ ہم دردی اور حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے اور ان کے ناپسندیدہ بلکہ غلط رویہ پر بھی صبر اور عفو و درگزر کی تعلیم دی ہے۔ اس کی تفصیل راقم کی کتاب 'غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

اور سامان زیست سے بھی محبت کرتا ہے۔ یہ محبت غلط نہیں بلکہ اپنے حدود میں جائز اور پسندیدہ ہے۔ لیکن ایمان کی پہچان یہ ہے کہ ان میں سے ہر محبت اللہ اور اس کے رسول کی محبت کے تابع ہو جائے۔ جب کبھی ان دونوں طرح کی محبتوں میں تصادم ہو تو اللہ اور اس کے رسول کی محبت غالب آ جائے۔

اللہ تعالیٰ اپنے وفادار بندوں سے محبت کرتا ہے

بندہ جب اللہ سے محبت کرتا ہے، اس کے ذکر و فکر میں مشغول ہوتا ہے، جب عبادت و اطاعت میں اس کے شب و روز بسر ہونے لگتے ہیں، جب جذبۂ عبودیت سے اس کی روح سرشار ہوتی ہے اور جب اس کی راہ میں وہ زحمت برداشت کرتا ہے تو اللہ کی نظرِ عنایت اس پر ہونے لگتی ہے اور وہ اسے اپنے آغوشِ محبت میں لے لیتا ہے۔ یہ کتنا بڑا صلہ ہے کہ ایک ناتواں بندہ اپنی حقیر کوشش سے اللہ کی محبت کا مستحق قرار پاتا ہے اور اس کی رحمت کی بارش اس پر ہونے لگتی ہے۔ یہ بات قرآن مجید میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہے۔ یہاں دو ایک حوالے دیے جا رہے ہیں۔

۱- اللہ تعالیٰ کو وہ لوگ محبوب ہیں جو اس سے کیے گئے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اس سے ڈر کر زندگی گزارتے ہیں۔ یہ عہد فی الواقع بندگی کا عہد ہے، اس کے احکام کی اطاعت کا عہد ہے، دین پر قائم رہنے، اسے دوسروں تک پہنچانے اور اسے سربلند کرنے کا عہد ہے۔ اس عہد پر قائم رہنا ہی عین تقویٰ اور خدا ترسی ہے۔ اسی سے آدمی کامیابی سے ہم کنار ہوسکتا ہے۔ پچھلی قومیں اس عہد کو توڑنے سے ناکام و نامراد ہوگئیں۔ اب اس سے بچنے کی ہدایت ہے:

بَلٰی مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰی فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۷۶﴾ (آل عمران:۷۶)	ہاں! جس نے اپنا عہد پورا کیا اور تقویٰ کی زندگی اختیار کی (تو وہ کامیاب رہے گا) اس لیے کہ اللہ متقیوں سے محبت کرتا ہے۔

۲- اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اسے تضرع، آہ و زاری، خوف اور امید

کے ساتھ جلوت ہی میں نہیں خلوت میں بھی یاد کرتے ہیں اور جن کا دامن ہر طرح کے ظلم و زیادتی اور فساد فی الارض سے پاک ہوتا ہے۔

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۵۵﴾ وَ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۚ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۶﴾ (الاعراف:۵۵،۵۶)

اپنے رب کو پکارو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے۔ بے شک اللہ ان لوگوں کو ناپسند کرتا ہے جو اس کے قائم کردہ حدود سے آگے نکل جاتے ہیں اور زمین میں اس کی اصلاح کے (فیصلہ کے) بعد فساد نہ مچاؤ اور اسے خوف و امید کے ساتھ پکارو۔ بے شک اللہ کی رحمت قریب ہے احسان کرنے والوں سے۔

۳- بندہ جب اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے جدوجہد کرتا ہے اور اپنے جان و مال کی بازی لگا دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا آغوش محبت اس کے لیے کھل جاتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ﴿۴﴾ (الصف:۴)

بے شک اللہ محبت کرتا ہے ان لوگوں سے جو اس کے راستے میں صف بستہ لڑتے ہیں گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی عمارت ہیں۔

ان آیات میں دین کے مختلف پہلوؤں کا بیان ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اللہ سے محبت کے کیا تقاضے ہیں اور انسان اس کی محبت کا کب حق دار ہوتا ہے، وہ کس قسم کے کردار کو پسند کرتا ہے اور انسان کن بدعملیوں اور غلط کاریوں کی وجہ سے اس کی رحمت و محبت سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ سے محبت

اللہ تعالیٰ سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی کے قلب میں اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کا جذبہ موج زن رہے۔ آپ کی ہدایات پر وہ دل و جان سے عمل کرے اور آپ کے کسی بھی حکم کی خلاف ورزی سے اجتناب کرے۔ اللہ کے رسول کی اطاعت کی یہ اہمیت اس لیے ہے کہ آپؐ کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت اور آپ کا حکم اللہ کا حکم

ہے۔ اس کی تعمیل اللہ کے حکم کی تعمیل ہے۔ قرآن میں صاف الفاظ میں کہا گیا ہے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَ مَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۝۸۰

(النساء: ۸۰)

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے حقیقت میں اللہ کی اطاعت کی اور جو روگردانی اختیار کرے تو (اس کی پاداش وہ بھگتے گا) ہم نے آپ کو ان پر نگراں بنا کر نہیں بھیجا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے محبت کی دلیل ہی یہ ہے کہ اللہ کے رسول کے احکام کی پابندی ہو اور اس سے سرِ مو انحراف نہ کیا جائے۔ اس کے بغیر عملی دنیا میں اس کے کوئی معنی نہ ہوں گے۔ اس لیے فرمایا گیا:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳۱ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۝۳۲

(آل عمران: ۳۱-۳۲)

(اے پیغمبران سے کہو کہ) اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا، اور تمھارے گناہوں کو معاف کردے گا اور اللہ بڑا بخشنے اور رحم کرنے والا ہے۔ ان سے کہو کہ اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اگر وہ روگردانی کریں تو (انھیں معلوم ہونا چاہیے) کہ اللہ ان لوگوں سے محبت نہیں کرتا جو اس کے ساتھ کفر کرتے ہیں۔

ان دو آیتوں میں سے پہلی آیت میں اللہ سے محبت کا ثبوت اتباعِ رسول کی شکل میں طلب کیا گیا ہے۔ دوسری آیت میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا ایک ساتھ حکم دیا گیا ہے۔ یہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اللہ کے رسول کی اطاعت اللہ ہی کی اطاعت ہے۔ یہ دو الگ اطاعتیں نہیں ہیں۔ بلکہ ایک ہی اطاعت ہے۔

انسان جس سے محبت کرتا ہے اس کی اطاعت خود بہ خود کرنے لگتا ہے۔ اگر محبت کا غلبہ ہوجائے اور دل و دماغ پر چھا جائے تو وہ سراپا تسلیم و رضا بن جاتا ہے۔ یہ غیر فطری بات ہے کہ کسی سے محبت بھی ہو اور اس کی اطاعت نہ ہو۔ جوشِ محبت بھی ہو

اور اس کی ہدایت پر عمل بھی نہ ہو۔ یہ دعوائے محبت تو ہوگا حقیقی محبت نہ ہوگی۔

اللہ کے رسول ﷺ سے محبت کے بغیر ایمان کا تصور نہیں کیا جاسکتا ہے۔اس محبت کا تقاضا ہے کہ وہ زبانی اور رسمی نہ ہو، بلکہ دل و جان سے ہو اور آخری حد تک ہو۔ یہ کسی رشتہ اور تعلق کے تابع نہ ہو، بلکہ ہر تعلق پر غالب آجائے۔ یہی حقیقت حضرت انسؓ کی ایک روایت میں بیان ہوئی ہے۔ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهٖ وَ وَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ[1]

تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوگا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے باپ (اور ماں) سے، اس کی اولاد سے اور سارے ہی انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں:

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ[2]

تم میں سے کوئی مومن نہیں ہوگا، یہاں تک کہ اس کی خواہشات اس دین کے تابع نہ ہو جائیں جو میں لایا ہوں۔

ایمان کی لذت

اس دنیا میں بہت سی مادی چیزوں میں لذت پائی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے آدمی ان کی طرف لپکتا اور دوڑتا ہے۔ اسی طرح روحانی اور قلبی کیفیات میں بھی لذت ہوتی ہے۔ یہ لذت اس وقت ملتی ہے جب کہ دل و دماغ پر اللہ اور اس کے رسول کی محبت چھا جائے، ان کی پسند آدمی کی اپنی پسند بن جائے اور جو چیز ان کو ناپسند ہو وہ اس کو ناگوار گزرنے لگے۔

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ آدمی ایمان کا کیف و سرور اور لذت اس وقت محسوس کرتا ہے جب کہ اس کے نزدیک اللہ اور اس کے رسول کی محبت ہر محبت پر غالب

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الأیمان، باب حب الرسول من الأیمان، صحیح مسلم، کتاب الأیمان، باب وجوب محبة رسول الله ﷺ ...الخ

[2] مشکوٰة المصابیح بحواله شرح السنة للبغوی

آجائے۔ اسی کی اساس پر انسانوں سے اس کے تعلقات استوار ہوں اور کفر و معصیت اسے اس طرح ناگوار گزرنے لگے جیسے آگ سے جل کر خاکستر ہونا ناگوار ہوتا ہے، روایت کے الفاظ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ثَلَاثٌ مَّنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ بِهِنَّ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ مَنْ كَانَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا وَ مَنْ اَحَبَّ عَبْدًا لَّا يُحِبُّهٗ اِلَّا لِلّٰهِ وَ مَنْ يَكْرَهُ اَنْ يَّعُوْدَ فِي الْكُفْرِ بَعْدَ اَنْ اَنْقَذَهُ اللّٰهُ مِنْهُ كَمَا يَكْرَهُ اَنْ يُّلْقٰى فِي النَّارِ[1]

جس شخص میں تین باتیں ہوں گی وہ ان کی وجہ سے ایمان کی حلاوت پائے گا۔ جسے اللہ اور اس کا رسول ان تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہو جو ان کے علاوہ ہیں، جو کسی بندے سے محبت کرے تو صرف اللہ کے لیے کرے، جس کے لیے کفر میں پلٹ کر جانا، جب کہ اللہ نے اسے اس سے نکال دیا ہے، اسی طرح ناگوار گزرے جیسے آگ میں ڈال دیا جانا اسے ناگوار ہوتا ہے۔

ایک اور حدیث میں کہا گیا ہے کہ آدمی کا ایمان اس وقت مکمل ہوتا ہے جب کہ اس کی دوستی اور دشمنی اور داد و ستد سب کچھ اللہ کے لیے ہوجائے۔ حضرت ابو امامہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَ أَبْغَضَ لِلّٰهِ وَ أَعْطٰى لِلّٰهِ وَ مَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدْ اِسْتَكْمَلَ الْإِيْمَانَ[2]

جو اللہ کے لیے محبت کرے، اللہ کے لیے نفرت کرے، جس کا دینا اللہ کے لیے اور منع کرنا اللہ کے لیے ہو تو اس نے اپنا ایمان مکمل کرلیا۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ ایمان کا درجۂ کمال یہ ہے کہ آدمی کے تعلقات اللہ تعالیٰ کی محبت کے تابع ہوں، کوئی دنیوی اور مادی غرض ان سے وابستہ نہ ہو، کسی سے محبت اور

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب حلاوۃ الایمان۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان خصال من اتصف بھن وجد حلاوۃ الایمان

[2] سنن ابی داؤد، کتاب السنة

تعلق ہو تو صرف اللہ کی رضا اور خوش نودی کے لیے ہو۔ اسی طرح کسی سے نفرت یا دوری اس بنیاد پر نہ ہو کہ اس سے ذاتی عناد یا خاندانی ناچاقی، قومی اور گروہی تعصب یا اسی نوعیت کا کوئی اور جذبہ کارفرما ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ اللہ کی معصیت اور نافرمانی میں مبتلا ہے یا اس کا باغی اور دشمن ہے۔ بہ حیثیت انسان اس سے تعلقات رکھے جائیں گے اور اس کی مشکلات میں تعاون اور ہم دردی کا رویہ اختیار کیا جائے گا، اس کے ساتھ اصلاحِ حال کی کوشش بھی کی جائے گی۔ اگر وہ اصلاح قبول کرلے اور اطاعت وفرماں برداری کے دائرہ میں آجائے تو اس سے ایمانی رشتہ قائم ہو جائے گا۔ یہ رشتہ ہر رشتہ سے قوی تر ہوگا۔

کمالِ ایمان کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ انسان کا مال اللہ کی مرضی کے مطابق خرچ ہونے لگے۔ وہ وہیں صرف ہو جہاں صرف کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جہاں صرف کرنے سے منع کر دیا گیا وہاں ہرگز صرف نہ ہو۔ وہ اللہ کے بندوں کی جائز ضروریات کی تکمیل میں اور اس کے دین کی خدمت اور سربلندی کے لیے خرچ ہو، اسراف وتبذیر سے آدمی کا دامن پاک ہو، معصیت اور نافرمانی کے کاموں میں نہ خود اپنا مال ضائع کرے اور نہ دوسروں کی اس معاملے میں مدد کرے۔

اللہ کے لیے دینے کا ایک مفہوم یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ آدمی کا کسی معاملہ میں زبان دینا یا عہد و پیمان کرنا یا اپنے امیر کی اطاعت کی بیعت یا اقرار کرنا سب کچھ اللہ کی رضا کے لیے ہو۔ کسی ظالم یا غلط کار کی اطاعت کا عہد کرے اور نہ اس کا ساتھ دے۔

ایمان کا لذت شناس ہونے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کو مان کر پوری طرح مطمئن ہوجائے۔ اس کی روح اس احساس سے لازوال مسرت محسوس کرے کہ اس کا رب اللہ واحد ہے۔ اس کی نظر صرف اللہ کی ذات پر جمی رہے۔ اس کے علاوہ کسی اور چیز میں اس کے لیے کوئی کشش نہ ہو۔ اللہ کا دین اس کا محبوب دین بن جائے اور اللہ کے رسولؐ کو وہ اپنا سچا اور حقیقی قائد تصور کرے۔ حضرت عباس بن عبد المطلبؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ذَاقَ طَعْمَ الْإِیْمَانِ مَنْ رَضِیَ بِاللّٰہِ رَبًّا وَ بِالْإِسْلَامِ دِیْنًا وَ بِمُحَمَّدٍ رَسُوْلًا[1]

اس شخص نے ایمان کا مزا چکھ لیا جو راضی ہوگیا اس بات سے کہ اللہ اس کا رب ہے۔ اسلام اس کا دین ہے اور محمدؐ اس کے ہادی اور اللہ کے رسول ہیں۔

رضا کا یہ اعلیٰ مقام اس وقت ملتا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ پر، اس کے رسول اور اس کے دین پر ایمان عقل و بصیرت کی روشنی میں حاصل ہو اور پورے شعور کے ساتھ دل و دماغ میں اسے جگہ دی گئی ہو۔

دعوتِ دین کے لیے تعلق باللہ کی اہمیت

قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت صحیح معنی میں وہی شخص کرتا اور کرسکتا ہے، جس کا اس سے گہرا تعلق ہو، جو اس کے لیے جینا اور مرنا، جڑنا اور کٹنا، دینا اور لینا جانتا ہو، جو اس سے شدید محبت کرے اور اس سے سب سے زیادہ ڈرے، جو اس کی راہ میں تکلیف اٹھا کر بھی لذت محسوس کرے اور جس کی زبان سخت سے سخت آزمائش میں بھی شکوہ شکایت سے آلودہ نہ ہو، جس کے دل میں اس کی عظمت و ہیبت اس قدر بیٹھی ہو کہ اس کے سوا کسی دوسرے کا خوف اس میں جگہ نہ پاسکے۔ جو اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو، اپنی آسائش و راحت کو، اپنے مال و دولت کو، اپنے عیش و آرام کو، اپنے مفادات اور دلچسپیوں کو اس کے لیے قربان کرنے کے باوجود یہ سمجھے کہ ابھی حق ادا نہیں ہوا ہے، جسے وہ سب کچھ کر گزرنے کے بعد بھی جو اس کے بس میں ہے اپنی غفلت و کوتاہی کا احساس ستائے، جس کے لیے اللہ تعالیٰ کی ذات دنیا کی سب چیزوں سے زیادہ عزیز اور محبوب بن جائے اور جس کی محبت ہر دوسری محبت پر غالب آجائے، جسے اللہ کے دین کا نقصان اپنا شخصی نقصان معلوم ہو اور جو دین کی ترقی پر اپنی ذاتی ترقی سے زیادہ مسرت محسوس کرے، جو دین پر ہونے والے حملہ کو اپنی ذات پر ہونے والے حملہ سے زیادہ سخت سمجھے اور دنیا کا ہر نقصان برداشت کرکے اس کے

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الدلیل علی ان من رضی باللہ ربا ...الخ

دفاع میں لگ جائے۔ جس شخص کا اللہ سے اس طرح تعلق مضبوط نہ ہو اس کے بس میں نہیں ہے کہ وہ دین کی سربلندی کے لیے سعی کرے، کسی وقتی جذبہ کے تحت وہ اسے شروع کر بھی دے تو اسے جاری رکھنا، اس راہ کی مشکلات کو برداشت کرنا اور اس کے لیے قربانیاں دینا اس کے لیے ممکن نہیں ہے۔

ایمان آپ سے سچی وفاداری چاہتا ہے۔ ایمان آپ سے مسلسل قربانی چاہتا ہے، ایمان آپ سے پرعزم جدوجہد چاہتا ہے۔ ایمان آپ سے پرخلوص محبت چاہتا ہے۔ ایمان چاہتا ہے کہ آپ پوری طرح اللہ تعالیٰ کے لیے وقف ہوجائیں اور اس کی رضا کے لیے اپنے آپ کو بیچ دیں۔ جو شخص اس طرح بک جانے کے لیے تیار نہیں ہے اس کا ایمان وہ ایمان نہیں، جس کے نتیجے میں اللہ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں اور اس کے انعامات کی بارش ہوتی ہے۔

ایمان بالآخرۃ

عقیدۂ آخرت کی اہمیت

آخرت کا عقیدہ اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے۔ اسلام کے دائرے میں کوئی بھی شخص اسی وقت داخل ہوتا ہے، جب کہ آخرت پر اس کا ایمان ہو۔ اس کے بغیر اس کے اسلام کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ قرآن مجید کے پہلے پارے کے شروع ہی میں کہا گیا ہے کہ یہ کتاب خدا ترس اور متقی انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے۔ ان کی ایک خاص پہچان یہ بیان ہوئی ہے۔

وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (البقرۃ:۴) وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

ایک اور موقع پر کہا گیا کہ اس کتاب میں نیک سیرت اور پاکیزہ کردار انسانوں کے لیے ہدایت ہے جن کی نمایاں خوبیوں میں سے ایک یہ ہے:

وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (لقمان:۴) وہ آخرت پر پورا یقین رکھتے ہیں۔

آخرت آکر رہے گی

قرآن کہتا ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ اس کی ہر بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ آخرت آئے گی اور ضرور آئے گی۔ یہ زمین وآسمان کے مالک وفرماں روا کا فیصلہ ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت اس کے کسی فیصلے کو بدل نہیں سکتی۔ دیکھیے، کتنے زوردار اور پرشکوہ الفاظ میں کہا گیا ہے:

وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ؕ قُلْ اِیْ وَ رَبِّیْۤ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ؔؕ وَ مَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝ (یونس:۵۳)

وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا عذابِ آخرت کا آنا حق ہے؟ ان سے کہو، ہاں! میرے رب کی قسم، اس کا آنا حق ہے۔ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے۔

یہی بات قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اسی زور اور قوت کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ سورۂ سبا میں ہے:

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ ؕ قُلْ بَلٰى وَ رَبِّیْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ ۙ عٰلِمِ الْغَيْبِ ۚ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِی الْاَرْضِ وَ لَاۤ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَ لَاۤ اَكْبَرُ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝ لِّيَجْزِیَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝ وَ الَّذِيْنَ سَعَوْ فِیْۤ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ۝ (سبا:۳-۵)

جن لوگوں نے کفر کیا وہ کہتے ہیں کہ قیامت ہم پر نہیں آئے گی۔ اے پیغمبر! کہو کہ ہاں میرے رب کی جو عالم الغیب ہے، قسم ہے، وہ تم پر ضرور آ کر رہے گی۔ میرے رب کے علم سے آسمانوں میں اور زمین میں کوئی ذرّہ غائب نہیں ہے۔ ذرہ سے بھی چھوٹی چیز ہو یا بڑی چیز، ہر ایک کتاب مبین میں لکھی ہوئی موجود ہے۔ (قیامت اس لیے آئے گی) تاکہ اللہ جزا دے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے اعمال کیے۔ ان کے لیے مغفرت اور باعزت رزق ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ ہماری آیات کو باطل ثابت کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کرنے میں لگے رہے ان کے لیے سخت دردناک عذاب ہے۔

یہ مضمون ان الفاظ میں بھی بیان ہوا ہے:

زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ؕ قُلْ بَلٰى وَ رَبِّیْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ؕ وَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ (التغابن:۷)

جن لوگوں نے کفر کیا وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ہرگز اٹھائے نہیں جائیں گے۔ ان سے کہو ہاں! میرے رب کی قسم، تم ضرور اٹھائے جاؤ گے اور جو عمل تم نے کیے ہیں وہ تمھیں ضرور بتائے جائیں گے۔ یہ اللہ کے لیے آسان ہے۔

جو لوگ آخرت کا شدت سے انکار کرتے ہیں، ان کی تردید بھی اتنے ہی زور اور قوت سے کی گئی ہے:

وَ اَقۡسَمُوۡا بِاللّٰہِ جَہۡدَ اَیۡمَانِہِمۡ ۙ لَا یَبۡعَثُ اللّٰہُ مَنۡ یَّمُوۡتُ ؕ بَلٰی وَعۡدًا عَلَیۡہِ حَقًّا وَّ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۸﴾ لِیُبَیِّنَ لَہُمُ الَّذِیۡ یَخۡتَلِفُوۡنَ فِیۡہِ وَ لِیَعۡلَمَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنَّہُمۡ کَانُوۡا کٰذِبِیۡنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّمَا قَوۡلُنَا لِشَیۡءٍ اِذَاۤ اَرَدۡنٰہُ اَنۡ نَّقُوۡلَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ﴿۴۰﴾ (النحل:۳۸-۴۰)

وہ قسم کھاتے ہیں اللہ کی، سخت قسم کہ اللہ ان لوگوں کو نہیں اٹھائے گا جو مرچکے ہیں۔ ہاں (وہ ضرور اٹھائے گا) یہ اللہ کا وعدہ ہے، پکا وعدہ! لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (وہ اس لیے اٹھائے گا) تاکہ ظاہر کردے ان پر وہ امور جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں اور جن لوگوں نے انکار کیا انھیں معلوم ہوجائے کہ وہ جھوٹے تھے۔ ہمارا قول جب ہم کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو بس یہ ہوتا ہے کہ ہم اس سے کہتے ہیں 'ہوجا' اور وہ ہو جاتی ہے۔

آخرت کے حق میں بطور دلیل انسان کی تخلیق، اس کے وجود اور بارش کے ساتھ زمین پر نمودار ہونے والی روئیدگی کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہے۔

ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ ہُوَ الۡحَقُّ وَ اَنَّہٗ یُحۡیِ الۡمَوۡتٰی وَ اَنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ۙ﴿۶﴾ وَّ اَنَّ السَّاعَۃَ اٰتِیَۃٌ لَّا رَیۡبَ فِیۡہَا ۙ وَ اَنَّ اللّٰہَ یَبۡعَثُ مَنۡ فِی الۡقُبُوۡرِ ﴿۷﴾ (الحج:۶-۷)

یہ (قدرت کے مظاہرے) اس وجہ سے ہیں کہ اللہ ہی حق ہے اور وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ بے شک قیامت آئے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے اور جو لوگ قبروں میں ہیں اللہ انھیں اٹھائے گا۔

ان آیات میں وہ ایمان و یقین بول رہا ہے جو آسمانی کتابوں کی خصوصیت ہے اور جو قرآن مجید میں پوری طرح نمایاں ہے۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ان میں اس امر کا محض دعویٰ کیا گیا ہے کہ قیامت ضرور آئے گی، اس کی کوئی دلیل نہیں دی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قیامت کب آئے گی؟ کیوں آئے گی؟ کیا اس کا کوئی امکان بھی ہے؟ اور وہ آئے گی تو کس شکل میں آئے گی؟ اس نوع کے تمام سوالات کا جواب خود ان آیات میں موجود ہے۔ قرآن مجید کے دوسرے مقامات پر اس کی تفصیل موجود ہے۔

آگے قرآن مجید کی دوسری آیات کی مدد سے ان کی وضاحت کی کوشش کی جائے گی۔

جب آخرت آئے گی

جب آخرت آئے گی تو یہ دنیا اپنے تمام ساز و سامان کے ساتھ ختم ہوجائے گی۔ زمین و آسمان درہم برہم ہو جائیں گے اور ایک نیا نظامِ عالم وجود میں آئے گا۔ اسی کو 'یوم القیامہ' بھی کہا گیا ہے۔ یعنی وہ دن جب مردے زندہ ہوکر اٹھ کھڑے ہوں گے اور خدا کے سامنے حاضر ہوں گے۔

فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴿۱۳﴾ وَّ حُمِلَتِ الْأَرْضُ وَ الْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ﴿۱۴﴾ فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴿۱۵﴾
(الحاقة:۱۳-۱۵)

پھر جب صور میں ایک بار پھونک مار دی جائے گی اور زمین اور پہاڑ اٹھا لیے جائیں گے اور وہ ایک ہی دفعہ میں ریزہ ریزہ کردیے جائیں گے۔ اس روز واقع ہونے والی (قیامت) واقع ہوجائے گی۔

ایک اور منظر ملاحظہ ہو:

إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴿۱﴾ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ﴿۲﴾ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ﴿۳﴾ إِذَا رُجَّتِ الْأَرْضُ رَجًّا ﴿۴﴾ وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ﴿۵﴾ فَكَانَتْ هَبَاءً مُّنْبَثًّا ﴿۶﴾
(الواقعہ:۱-۶)

جب واقع ہونے والی (قیامت) واقع ہوجائے گی۔ اس کے واقع ہونے پر کوئی جھٹلانے والا نہ ہوگا۔ وہ (کسی کو) پست کرنے والی اور (کسی کو) بلند کرنے والی ہے۔ جب زمین بری طرح ہلادی جائے گی اور پہاڑ ریزہ ریزہ کردیے جائیں گے۔ اور وہ اڑتا ہوا غبار ہوجائیں گے۔

اس وقت یہ زمین و آسمان بدل دیے جائیں گے، ستارے اور سیارے اور ہمارا یہ نظامِ شمسی بکھر جائے گا، انسان دوبارہ زندہ کیے جائیں گے، ہر ایک کا صحیفۂ اعمال اس کے ہاتھ میں ہوگا۔ نعمت بھری جنت اور دہکتی ہوئی دوزخ سامنے ہوگی۔ انسان نے اس زندگی میں جو کچھ کیا ہے، اسے آنکھوں سے دیکھ رہا ہوگا:

إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝١ وَ إِذَا النُّجُومُ انكَدَرَتْ ۝٢ وَ إِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝٣ وَ إِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝٤ وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ ۝٥ وَ إِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝٦ وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ ۝٧ وَ إِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ ۝٨ بِأَيِّ ذَنبٍ قُتِلَتْ ۝٩ وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ۝١٠ وَإِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ ۝١١ وَ إِذَا الْجَحِيمُ سُعِّرَتْ ۝١٢ وَ إِذَا الْجَنَّةُ أُزْلِفَتْ ۝١٣ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا أَحْضَرَتْ ۝١٤

(التکویر ۱-۱۴)

جب سورج بے نور ہوجائے گا، جب ستارے ٹوٹ کر گر پڑیں گے، جب پہاڑ چلا دیے جائیں گے، جب دس ماہ کی گابھن اونٹنیاں چھوڑ دی جائیں گی، جب جنگل کے جانور سمیٹ کر اکٹھا کر دیے جائیں گے، جب سمندر بھڑکا دیے جائیں گے، جب نفوس باہم مناسبت سے جوڑ دیے جائیں گے، جب اس لڑکی سے جسے زندہ درگور کیا گیا تھا، پوچھا جائے گا کہ کس گناہ میں اسے مارا گیا؟ جب اعمال نامے پھیلا دیے جائیں گے، جب آسمان کھول دیا جائے گا، جب جہنم بھڑکا دی جائے گی اور جب جنت قریب کردی جائے گی، ہر شخص جان لے گا کہ وہ کیا لے کر حاضر ہوا ہے۔

ایک اور منظر دیکھیے، کتنا ہولناک اور دل ہلا دینے والا منظر ہے:

إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝١ وَ أَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا ۝٢ وَ قَالَ الْإِنسَانُ مَا لَهَا ۝٣ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ۝٤ بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا ۝٥ يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ ۝٦ فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝٧ وَ مَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۝٨

(الزلزال:۱-۸)

جب زمین زلزلے سے ہلا دی جائے گی اور وہ اپنے بوجھ باہر نکال پھینکے گی اور انسان کہے گا کہ اسے کیا ہوگیا ہے! اس دن وہ اپنی تمام خبریں بیان کردے گی، اس لیے کہ اس کے رب کا اسے یہی حکم ہوگا۔ اس دن لوگ منتشر اور پراگندہ ہوکر لوٹیں گے، تاکہ ان کو ان کے اعمال دکھا دیے جائیں۔ پس جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا اسے وہ دیکھ لے گا اور جو شخص ذرہ برابر بدی کرے گا اسے (بھی) دیکھ لے گا۔

آخرت کس لیے آئے گی؟

اب اس سوال پر غور کیجیے کہ آخرت کس لیے آئے گی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آخرت اس لیے آئے گی تاکہ نیک و بد کا حقیقی فیصلہ ہو اور ہر ایک اپنے انجام کو پہنچے۔ اللہ تعالیٰ کے نیک اور صالح بندے، وہ بندے جن کی زندگیاں اس کی اطاعت و فرماں برداری میں گزریں اور جن کے دامن، معصیت کی آلودگی سے پاک رہے انعام و اکرام سے نوازے جائیں اور اللہ تعالیٰ کے نافرمان اور باغی جنھوں نے سرکشی اور بغاوت کی راہ اختیار کی اور معصیت میں لت پت رہے، وہ اپنی آنکھوں سے اس کا قہر دیکھ لیں اور اس کے درد ناک عذاب سے دوچار ہوں۔

اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۞ (یونس:۴)	اسی کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے۔ یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے۔ بے شک وہ پہلی بار تخلیق کرتا ہے پھر وہ اسے لوٹائے گا۔ تاکہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنھوں نے صالح اعمال کیے انصاف کے ساتھ جزا دے اور جنھوں نے کفر کیا ان کے پینے کے لیے گرم پانی اور درد ناک عذاب ہوگا اس لیے کہ وہ کفر کرتے تھے۔

کیا قیامت آسکتی ہے؟

کیا اس بات کا کوئی امکان ہے کہ یہ دنیا ختم ہوجائے اور اس کی جگہ ایک دوسری دنیا وجود میں آئے، جہاں انسان کو اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے اعمالِ حیات کا جواب دینا پڑے اور وہ جنت یا جہنم کا مستحق قرار پائے؟

اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کائنات کا خالق و مالک ہے۔ اسے ہر چیز کی قدرت حاصل ہے۔ اس کی قدرت سے یہ بعید نہیں ہے کہ ایک نئی دنیا وجود میں لائے اور نکوکاروں کو جزا اور بدکاروں کو سزا دے۔ کوئی چیز اس کے لیے ناممکن نہیں

ہے۔ یہی بات اس آیت میں ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔

وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۙ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَ يَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ﴿۳۱﴾ (النجم:۳۱)

اور اللہ ہی کی سب چیزیں ہیں جو آسمانوں میں اور جو زمین میں ہیں تاکہ جن لوگوں نے غلط کام کیے انھیں ان کے عمل کا بدلہ دے اور جنھوں نے نیک کام کیے انھیں اس کا بہترین صلہ عطا کرے۔

جو شخص آخرت کو ناممکن خیال کرتا ہے وہ خدا کو خدا نہیں سمجھتا، وہ اسے مالکِ ارض و سماء کی حیثیت سے نہیں دیکھتا، بلکہ ایک حقیر اور محدود قوت والی ہستی خیال کرتا ہے۔ اس کی قدرتِ بے پایاں اور قوتِ کاملہ کے تصور سے اس کا ذہن خالی ہے۔ اسے پہلے اپنے ذہن کی اصلاح کرنی چاہیے۔

وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ السَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۷﴾ (الزمر:۶۷)

انھوں نے اللہ کو نہیں سمجھا جیسا کہ اسے سمجھنا چاہیے۔ (اس کی عظمت کا حال یہ ہے کہ) زمین ساری کی ساری قیامت کے روز اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوں گے۔ وہ پاک اور برتر ہے شرک سے جو وہ کر رہے ہیں۔

خالقِ کون و مکاں کے لیے کوئی چیز ناممکن نہیں ہے۔ وہ جو چاہے اور جب چاہے وجود میں آجائے گا۔ اس کی قدرت لامتناہی اور لامحدود ہے۔ اس کے دائرۂ اختیار سے کوئی چیز باہر نہیں ہے۔

اَوَ لَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ؕ بَلٰى ۚ وَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۱﴾ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۸۲﴾

کیا وہ ہستی جس نے آسمان اور زمین پیدا کی، اس بات پر قادر نہیں ہے کہ ان جیسوں کو پیدا کردے؟ ہاں! وہ تو بڑا پیدا کرنے والا اور خوب جاننے والا ہے۔ اس کا معاملہ تو یہ ہے کہ وہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے

فَسُبۡحٰنَ الَّذِیۡ بِیَدِہٖ مَلَکُوۡتُ کُلِّ شَیۡءٍ وَّ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۸۳﴾ (یٰس:۸۱-۸۳)

تو اس سے کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔ پس پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہت ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

آخرت کا آنا مطابقِ عقل ہے

عقل کہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جو اس دنیا کا مالک ہے وہ اپنے نافرمانوں اور اطاعت گزاروں کے ساتھ یکساں معاملہ نہیں کرے گا۔ یہ اس کے عدل و انصاف اور اس کی حکمت کے خلاف ہے کہ اس کے مطیع و باغی سب مرمٹ کر برابر ہوجائیں اور کسی انجام سے دوچار نہ ہوں۔ صالح اور بدکار، نیک سیرت اور فاسق و فاجر کسی کو اس کے کیے کی جزا یا سزا نہ ملے۔ آخرت بتادے گی کہ فی الواقع ان دو طرح کے انسانوں کا انجام ایک نہیں ہے۔ آخرت کا آنا عقل کے عین مطابق ہے اور اس کا انکار عقل کے صریح تقاضے کا انکار ہے۔

وَ مَا یَسۡتَوِی الۡاَعۡمٰی وَ الۡبَصِیۡرُ ۙ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ لَا الۡمُسِیۡٓءُ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تَتَذَکَّرُوۡنَ ﴿۵۸﴾ اِنَّ السَّاعَۃَ لَاٰتِیَۃٌ لَّا رَیۡبَ فِیۡہَا وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۵۹﴾ (المومن:۵۸،۵۹)

برابر نہیں ہوں گے اندھا اور آنکھوں والا۔ وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے اور بدکار۔ کم ہی تم نصیحت حاصل کرتے ہو۔ بے شک قیامت آئے گی، اس میں کوئی شک نہیں ہے لیکن اکثر لوگ اس پر ایمان نہیں رکھتے۔

عقل کے اس صریح تقاضے کو جب فراموش کر دیا جاتا ہے تو قرآن تعجب کے ساتھ سوال کرتا ہے:

مَثَلُ الۡفَرِیۡقَیۡنِ کَالۡاَعۡمٰی وَ الۡاَصَمِّ وَ الۡبَصِیۡرِ وَ السَّمِیۡعِ ؕ ہَلۡ یَسۡتَوِیٰنِ مَثَلًا ؕ اَفَلَا تَذَکَّرُوۡنَ ﴿۲۴﴾ (ھود:۲۴)

دونوں فریقوں کی مثال اندھے اور بہرے اور دیکھنے والے اور سننے والے کی ہے۔ کیا دونوں کی کیفیت ایک ہے؟ پھر تم کیوں نصیحت نہیں حاصل کرتے؟

اس بدیہی حقیقت کو متعدد مواقع پر اجاگر کیا گیا ہے۔ ایک جگہ یہ الفاظ ملتے ہیں:

اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ؕ لَا يَسْتَوٗنَ ۝۱۸ اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰى ۫ نُزُلًۢا بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۹ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَاۤ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَقِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۝۲۰

(السجدة:۱۸-۲۰)

کیا وہ شخص جو مومن ہے، اس شخص کی طرح ہوجائے گا جو فاسق ہے (حقیقت یہ ہے کہ) وہ برابر نہیں ہوں گے۔ وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کیے ان کے رہنے کے لیے جنتیں ہوں گی۔ یہ میزبانی ہوگی ان اعمال کے عوض جو وہ کر رہے تھے۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے فسق کی روش اختیار کی ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ جب کبھی وہ اس سے نکلنے کا ارادہ کریں گے اسی میں لوٹا دیے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا چکھو جہنم کا عذاب جسے تم جھٹلاتے رہے۔

ایک اور وضاحت ملاحظہ ہو۔ پورے زور اور قوت کے ساتھ کہا جارہا ہے کہ برے اور بھلے، نیک و بد، صالح اور غیر صالح سب کا انجام ایک ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کارخانۂ قدرت کا کوئی مالک اور کوئی فرماں روا نہیں ہے، کوئی محاسب اور مجازی نہیں ہے، اس کی کوئی غرض و غایت نہیں ہے۔ یہ کارخانہ یوں ہی وجود میں آیا ہے اور یوں ہی ختم ہو جائے گا؟ حالاں کہ کائنات کی ایک ایک چیز گواہی دے رہی ہے کہ وہ کھیل کود اور تفریح کے طور پر وجود میں نہیں آئی ہے، بلکہ وہ ایک حکیم اور دانا و بینا ہستی کی تخلیق ہے۔ اس نے ایک اعلیٰ مقصد کے لیے اسے وجود دیا ہے، اور اسی کے تحت وہ چل رہی ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ عدل و انصاف کی ترازو قائم ہو، اس میں تول کر ہر عمل کا فیصلہ ہو۔ کسی کی حق تلفی اور کسی کے ساتھ ظلم نہ ہونے پائے، سب کے سب انصاف سے بہرہ ور ہوں۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ

کیا ان لوگوں نے جنھوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا ہے، یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم ان کو ان

سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَ مَمَاتُهُمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ۝۲۱ وَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۝۲۲

(الجاثیۃ:۲۱-۲۲)

لوگوں کی طرح کر دیں گے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے؟ ان کا جینا اور مرنا برابر ہوجائے گا؟ برا ہے جو وہ فیصلہ کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا تاکہ ہر نفس کو جو اس نے کمایا ہے، اس کا بدلہ دیا جائے اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔

آخرت میں کیا ہوگا؟

آخرت میں تمام انسان از اوّل تا آخر اللہ تعالیٰ کی جناب میں حاضر ہوں گے، کسی کے چھپنے کی کوئی جگہ نہ ہوگی۔ انسان کی پوری زندگی عریاں اور بے حجاب ہوگی۔ ہر شخص کا نامۂ اعمال اس کے ہاتھ میں ہوگا۔ اس کے مطابق ابدی جزا وسزا کا فیصلہ ہوگا۔ یا تو دائمی جنت ہوگی یا ہمیشہ کی جہنم۔ اس وقت انسان کا جو حال ہوگا اسے قرآن کے الفاظ میں پڑھیے۔

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚ وَّ مَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًۢا بَعِيْدًا ؕ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ۝۳۰

(آل عمران:۳۰)

اس دن ہر شخص جو کچھ بھی اس نے (یہاں) بھلائی اور برائی کی ہے، اسے (اپنے سامنے) حاضر پائے گا اور تمنا کرے گا کاش (یہ دن نہ آتا اور) اس کے اور اس دن کے درمیان ایک لمبی مدت حائل ہوتی۔ اللہ تم کو اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور اللہ (اپنے) بندوں پر بڑا مہربان (بھی) ہے۔

اس دن وہ تمام تعلقات جن کو قابلِ اعتماد سمجھا جاتا ہے اور جن کی محبت میں انسان اللہ تعالیٰ کو بھول جاتا ہے، ایک ایک کر کے ٹوٹ جائیں گے۔ ماں باپ، بیوی بچوں اور قریب ترین عزیزوں میں سے کوئی کسی کے کام نہ آئے گا۔ ہر شخص پر نفسی نفسی کا عالم طاری ہوگا۔ ہر کسی کو اپنی جان بچانے کی فکر ہوگی۔ یہ وہ دن ہوگا جب اللہ کے

عذاب کو دیکھ کر اس کے نافرمان تمنا کریں گے کہ کاش ان کے پاس پوری دنیا اور اس کا مال و متاع ہوتا اور وہ اسے دے کر اس سے نجات پا جاتے۔ لیکن اس تمنا کے پورا ہونے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔

يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ۝۸ وَ تَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ۝۹ وَ لَا يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ۝۱۰ يُّبَصَّرُوْنَهُمْ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِىِٕذٍۭ بِبَنِيْهِ ۝۱۱ وَصَاحِبَتِهٖ وَ اَخِيْهِ ۝۱۲ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـْٔوِيْهِ ۝۱۳ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ يُنْجِيْهِ ۝۱۴ كَلَّا اِنَّهَا لَظٰى ۝۱۵ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ۝۱۶

(المعارج:۸-۱۶)

جس دن آسمان پگھلے ہوئے تانبہ کی طرح ہوجائے گا اور پہاڑ رنگین اون کی طرح ہوجائیں گے (اور اڑتے پھریں گے) کوئی دوست کسی دوست کو نہیں پوچھے گا حالاں کہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے (ہر ایک دوسرے کی پریشانی سے واقف ہوگا) مجرم چاہے گا کہ اس دن کے عذاب سے بچنے کے لیے اپنے بیٹے کو، اپنی بیوی کو، اپنے بھائی کو اور اس خاندان کو جس نے اسے پناہ دے رکھی تھی اور زمین کے سارے انسانوں کو فدیہ میں دے دے اور پھر اس عذاب سے بچ جائے، لیکن ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ وہ تو دہکتی ہوئی آگ ہوگی جو کھال کو بری طرح نکال کر پھینک دے گی۔

قیامت ایک خوف ناک دھماکے کے ساتھ آئے گی۔ جب یہ دھماکہ ہوگا تو انسان رشتوں، ناطوں اور تعلقات کو فراموش کر بیٹھے گا، کوئی کسی کے کام نہ آئے گا اور انسان تنہا اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے فیصلے کو سن کر کچھ لوگ شاداں و فرحاں ہوں گے۔ ان کے چہرے مسرت سے دمک اٹھیں گے اور کچھ لوگ غم و اندوہ کے سمندر میں ڈوب جائیں گے۔

فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ۝۳۳ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۝۳۴ وَاُمِّهٖ وَ اَبِيْهِ ۝۳۵ وَصَاحِبَتِهٖ وَ بَنِيْهِ ۝۳۶ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَىِٕذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ۝۳۷ وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ مُّسْفِرَةٌ ۝۳۸ ضَاحِكَةٌ

پھر جب کان کے پردے پھاڑ دینے والی آواز ہوگی۔ اس دن انسان بھاگے گا اپنے بھائی سے، اپنی ماں اور اپنے باپ سے، اپنی بیوی اور اپنے بیٹوں سے۔ ہر آدمی اپنی اپنی فکر میں اس طرح گم ہوگا کہ دوسری طرف توجہ نہ کرسکے گا۔

مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿٣٩﴾ وَ وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿٤٠﴾ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿٤١﴾ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿٤٢﴾

(عبس: ۳۸-۴۲)

اس دن کچھ چہرے روشن ہوں گے، مسکرا رہے ہوں گے، شاداں و فرحاں ہوں گے اور کچھ چہرے اس دن وہ ہوں گے جو گرد آلود ہوں گے، ان پر سیاہی چڑھی ہوگی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو منکر اور بدکار ہیں۔

آخرت مذاق کا موضوع نہیں ہے

وہ لوگ کتنے نادان ہیں جو آخرت پر یقین نہیں کرتے، بلکہ اس کا انکار کرتے اور اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ اپنے انجام سے غافل اور بے فکر ہیں حالاں کہ ان کا انجام ان کے پیچھے پیچھے چلا آرہا ہے۔ آخرت جب آئے گی اور انسان کھلی آنکھوں سے اپنے اعمالِ حیات اور ان کے نتائج دیکھے گا تو اس کے ہوش اڑ جائیں گے اور وہ کہیں راہِ فرار نہیں پائے گا۔ قرآن کہتا ہے کہ آنے والے اس دن کو مذاق کا موضوع نہ بنایا جائے بلکہ سنجیدگی اور یکسوئی کے ساتھ اپنے انجام کی فکر کی جائے۔

يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ﴿٦﴾ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ﴿٧﴾ وَ خَسَفَ الْقَمَرُ ﴿٨﴾ وَ جُمِعَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ ﴿٩﴾ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَىِٕذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ﴿١٠﴾ كَلَّا لَا وَزَرَ ﴿١١﴾ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَىِٕذِ الْمُسْتَقَرُّ ﴿١٢﴾ يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَىِٕذٍۭ بِمَا قَدَّمَ وَ اَخَّرَ ﴿١٣﴾

(القیامۃ: ۶-۱۳)

انسان پوچھتا ہے کہ روزِ قیامت کب ہے؟ (بتاؤ، قیامت جب آئے گی) تو نگاہیں پتھرا جائیں گی، چاند ماند پڑ جائے گا، سورج اور چاند (فاصلہ ختم کرکے) ملا دیے جائیں گے۔ اس روز انسان کہے گا کہ بھاگ کر کہاں جاؤں؟ ہرگز نہیں۔ کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔ آج تمھارے رب کے پاس ہی ٹھکانا ہے۔ اس دن انسان کو بتا دیا جائے گا جو اس نے آگے بھیجا اور جو پیچھے چھوڑا ہے۔

آخرت کی فکر کی جائے

اس کائنات میں سب سے بڑا واقعہ جو پیش آنے والا ہے، وہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے عذاب یا ثواب سے دوچار ہوگا۔ اس کے عذاب سے زیادہ خوف ناک چیز کوئی نہیں

ہے، جس سے بچنے کی فکر کی جائے، اور اس کے ثواب سے بڑی نعمت اور کوئی نہیں ہے کہ انسان اس کی طلب کرے۔ قرآن مجید بار بار اسی انجام سے انسان کو آگاہ کرتا ہے:

رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ ۚ يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ﴿۱۵﴾ يَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ ۚ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ؕ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ؕ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۱۶﴾ اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ ؕ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۷﴾ وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْاٰزِفَةِ اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كٰظِمِيْنَ ؕ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ ﴿۱۸﴾

(المومن: ۱۵-۱۸)

وہ بلند درجات والا اور عرش کا مالک ہے۔ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنے حکم سے وحی نازل کرتا ہے۔ تاکہ ملاقات کے دن (قیامت) سے ڈرائے۔ جس دن وہ اللہ کے سامنے ہوں گے، ان کی کوئی چیز اللہ سے پوشیدہ نہیں رہے گی۔ (سوال ہوگا) آج اقتدار اور حکومت کس کی ہے؟ (ہر طرف سے جواب آئے گا) اللہ کی حکومت ہے، جو اکیلا اور غالب ہے۔ آج ہر نفس کو جو اس نے کمایا ہے، اس کا بدلہ دیا جائے گا۔ آج کسی پر ظلم نہیں ہوگا۔ بے شک اللہ جلد حساب لینے والا ہے اور انھیں ڈرا دو اس دن سے جو قریب آلگا ہے جب کہ کلیجے منہ کو آرہے ہوں گے۔ غم سے گھٹ رہے ہوں گے۔ ظالموں کا کوئی دوست ہوگا اور نہ سفارش کرنے والا جس کی بات مانی جائے۔

سورۂ لقمان میں اس انجام سے ان الفاظ میں آگاہ کیا گیا ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ ۫ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ٙ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴿۳۳﴾ (لقمان: ۳۳)

اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو اور اس دن سے ڈرو جب کہ کوئی باپ اپنے بیٹے کے کام نہیں آئے گا اور نہ کوئی اولاد اپنے باپ کے کچھ کام آسکے گی۔ بے شک اللہ کا وعدہ برحق ہے۔ پس نہ فریب دے تم کو دنیا کی زندگی اور نہ فریب دے تم کو اللہ کے بارے میں یہ دھوکہ باز (شیطان)۔

سورۂ نبا میں ارشاد ہے:

ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا ۝ اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا ۚۖ يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ وَ يَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِىْ كُنْتُ تُرٰبًا ۝ (النبا:۳۹،۴۰)

اس دن کا آنا حق ہے۔ پس جو شخص چاہے اپنے رب کے پاس ٹھکانا بنالے۔ ہم نے تمھیں اس عذاب سے ڈرا دیا ہے جو قریب آچکا ہے۔ جس دن انسان وہ سب کچھ دیکھ لے گا جو اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے اور کافر کہے گا: اے کاش کہ میں مٹی ہو جاتا۔

دنیا فانی اور آخرت ابدی ہے

یہ دنیا فانی ہے، یہاں کسی شیٔ کو دوام اور بقا نہیں ہے، جو چیز بھی وجود میں آتی ہے، حیاتِ مستعار لے کر آتی ہے اور ایک روز فنا کی چادر اوڑھ لیتی ہے۔ یہاں حیات و شباب، راحت اور تکلیف، خوشی اور غم سب عارضی ہیں، لیکن ایک ایسی دنیا بھی ہے جو لافانی ہے، جو ابد الآباد تک رہے گی اور کبھی ختم نہ ہو گی۔ جہاں انسان کو بقائے دوام حاصل ہوگا، جہاں موت سے نا آشنا حیات ہوگی، جہاں کی نعمتیں اور راحتیں اور آلام و مصائب دونوں ہی ابدی ہوں گی۔ جہاں انسان کو کچھ پانے کے بعد اس کے چھن جانے کا خطرہ نہ ہوگا اور کسی چیز سے محروم ہونے کے بعد اس کے پانے کی توقع نہ ہوگی۔ جہاں سکون اور چین اور راحت و آسائش بھی ہمیشہ کے لیے ہوگی اور عقوبت و اذیت اور دکھ درد اور رنج و محن بھی کبھی ختم نہ ہوگا۔ اسی کا نام آخرت ہے۔ آخرت میں انسان کے لیے جنت ہے یا جہنم۔ جنت ابدی نعمتوں کا گھر اور جہنم دائمی عقوبت اور سزا کا مرکز ہے۔ جنت اللہ تعالیٰ کے نیک اور فرماں بردار بندوں کو ملے گی اور جہنم اس کے نافرمانوں اور باغیوں کا ٹھکانا ہوگی۔ انسان کی فطرت میں جنت کی طلب پائی جاتی ہے۔ وہ ایک ایسی دنیا چاہتا ہے جو دکھ درد اور رنج و الم سے پاک ہو اور جس کی نعمتیں لازوال ہوں۔ جہاں وہ ہمیشہ عیش و عشرت کی زندگی گزار سکے لیکن افسوس کہ وہ اس دنیا کی رعنائیوں میں گم ہوکر فطرت کی اس طلب کو فراموش کر بیٹھتا ہے۔ وہ اِس طرح زندگی

گزارنے لگتا ہے جیسے آخرت نہیں آئے گی، حساب کتاب نہیں ہوگا اور وہ جنت یا جہنم سے دوچار نہ ہوگا۔ آخرت کی طرف اسے متوجہ کیا بھی جاتا ہے اور اس کے حق میں دلائل دیے بھی جاتے ہیں تو اس کا انکار اقرار میں اور اس کی بے یقینی یقین میں تبدیل نہیں ہو پاتی۔

وَإِذَا قِيلَ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيهَا قُلْتُم مَّا نَدْرِي مَا السَّاعَةُ إِن نَّظُنُّ إِلَّا ظَنًّا وَمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِينَ ﴿٣٢﴾ (الجاثیہ:۳۲)

جب کہا گیا کہ اللہ کا وعدہ حق ہے اور قیامت میں کوئی شک نہیں تو تم نے جواب دیا کہ ہم نہیں جانتے کہ قیامت کیا ہے اور ہم اس کے بارے میں بس ایک گمان سا رکھتے ہیں اور ہم اس پر یقین نہیں کرتے۔

آخرت پر یقین سے محروم لوگ اس اطمینان کے ساتھ دنیا کی آلودگیوں میں لت پت پڑے رہتے ہیں کہ یہاں کا عیش ہی اصل عیش ہے۔ دنیا ہی اول و آخر ہے۔ اس کے بعد پھر کوئی زندگی نہیں ہے، جس کی فکر کی جائے۔ وہ اس تصور کے ساتھ جیتے ہیں کہ ع

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

اسی ذہنی کیفیت کا اظہار اس آیت میں ہوا ہے:

وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَلَئِن رُّدِدتُّ إِلَىٰ رَبِّي لَأَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنقَلَبًا ﴿٣٦﴾ (الکہف:۳۶)

میں نہیں سمجھتا کہ قیامت آئے گی، اگر میں اپنے رب کی طرف لوٹا دیا بھی جاؤں تو مجھے ضرور اس سے بہتر جگہ ملے گی۔

جب دنیا ذہن پر چھا جاتی ہے

جب دنیا ذہن و فکر پر چھا جاتی ہے اور انسان اس کی رنگینیوں میں کھو جاتا ہے تو آخرت سے غفلت طاری ہونے لگتی ہے۔ بالآخر انسان بندۂ دنیا بن کر آخرت کو تباہ کر بیٹھتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ زَیَّنَّا لَہُمۡ اَعۡمَالَہُمۡ فَہُمۡ یَعۡمَہُوۡنَ ؕ﴿۴﴾ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ لَہُمۡ سُوۡٓءُ الۡعَذَابِ وَ ہُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ ہُمُ الۡاَخۡسَرُوۡنَ ﴿۵﴾ (النمل:۴،۵)

بے شک وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم نے ان کے لیے ان کے اعمال کو آراستہ کر دیا ہے۔ پس وہ بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ یہی لوگ ہیں، جن کے لیے برا عذاب ہے اور وہ آخرت میں بڑا نقصان اٹھانے والے ہیں۔

جن لوگوں کے لیے دنیا مقصود بن جائے، وہ اس سے آگے نہ سوچتے ہیں اور نہ سوچنا چاہتے ہیں۔ وہ دنیا کے لیے جیتے ہیں اور دنیا کے لیے مرتے ہیں۔ ان کے لیے خدا اور آخرت کوئی ایسا موضوع نہیں ہوتا، جس پر وہ وقت صرف کریں اور اس کی بنیاد پر زندگی کی تعمیر کے بارے میں سوچیں۔

آخرت فراموش انسان کے سامنے اللہ کا دین آتا بھی ہے تو وہ اس کی طرف سے آنکھیں بند کر کے اس طرح گزر جاتا ہے، جیسے اس سے اس کا کوئی خطاب نہیں ہے۔ وہ اس کے دلائل کے ساتھ اس بے اعتنائی کا مظاہرہ کرتا ہے جیسے وہ اس کی توجہ کے قابل ہی نہیں ہیں۔ وہ اللہ کے دین کو رد ہی نہیں کرتا بلکہ اس کی راہ میں سنگِ گراں بن جاتا ہے۔

وَ وَیۡلٌ لِّلۡکٰفِرِیۡنَ مِنۡ عَذَابٍ شَدِیۡدِۣ ۙ﴿۲﴾ الَّذِیۡنَ یَسۡتَحِبُّوۡنَ الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا عَلَی الۡاٰخِرَۃِ وَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ یَبۡغُوۡنَہَا عِوَجًا ؕ اُولٰٓئِکَ فِیۡ ضَلٰلٍۭ بَعِیۡدٍ ﴿۳﴾ (ابراہیم:۲،۳)

اور انکار کرنے والوں کے لیے سخت تباہ کن عذاب ہے جو کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی کو پسند کرتے ہیں اور اللہ کے راستے سے دوسروں کو روکتے ہیں اور اس میں کجی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ گم راہی میں بہت دور نکل چکے ہیں۔

دنیا کی زندگی میں جو لوگ مگن ہوں اور دین کو مذاق سمجھ رہے ہوں، حکم ہے کہ ان سے صرفِ نظر کیا جائے، البتہ یہ حقیقت بار بار واضح کی جاتی رہے کہ قیامت بہرحال اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ آنے والی ہے۔ دنیا کے فریب میں پڑے ہوئے

انسانوں کے لیے وہ بڑا برا وقت ہوگا۔ ان کی نجات کی کوئی صورت نہ ہوگی:

وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّ لَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَ ذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ۖ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّ لَا شَفِيْعٌ ۚ وَ اِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۧ (الانعام: ۷۰)

اور چھوڑ دو ان لوگوں کو جنھوں نے اپنے دین کو لہو و لعب بنا رکھا ہے اور جنھیں دنیا کی زندگی نے دھوکہ میں ڈال دیا ہے اور اس قرآن کے ذریعے نصیحت کرتے رہو کہ کوئی نفس اپنے اعمال کے نتیجہ میں ہلاکت میں نہ پھینک دیا جائے کہ اللہ کے سوا نہ اس کا کوئی حامی و مددگار ہو اور نہ سفارش کرنے والا۔ اگر وہ پورا پورا فدیہ بھی دے تو اس سے نہ لیا جائے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اعمال کی وجہ سے ہلاکت میں پھینک دیے گئے۔ ان کے پینے کے لیے گرم پانی ہوگا اور انھیں درد ناک عذاب ہوگا اس کفر کی وجہ سے جو وہ کر رہے تھے۔

ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کا تعلق

ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ میں گہرا تعلق ہے۔ ایمان باللہ سے ایمان بالآخرۃ ابھرتا ہے اور ایمان بالآخرۃ ایمان باللہ کی طرف لے جاتا ہے۔ قرآن مجید میں یہ حقیقت بہت تفصیل سے سمجھائی گئی ہے کہ آخرت پر ایمان نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ پر اور اس کے دین پر ایمان کے لیے دل نہیں کھلے گا اور آدمی استکبار اور نخوت کا رویہ اختیار کرے گا۔ ارشادِ باری ہے:

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّ هُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۲۲﴾ لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ ۗ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ

تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے، جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل اس کے منکر ہیں اور وہ تکبر میں مبتلا ہیں۔ یہ قطعی بات ہے کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ چھپا رہے ہیں اور جس کا اظہار کر رہے ہیں۔ بے شک وہ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ﴿٢٣﴾ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۙ قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٢٤﴾ لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ وَ مِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا يَزِرُوْنَ ﴿٢٥﴾ (النحل:۲۲-۲۵)	جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ تمھارے رب نے کیا نازل کیا تو جواب دیتے ہیں کہ اگلے لوگوں کی کہانیاں ہیں، تاکہ اس کے نتیجے میں اپنے گناہوں کے پورے بوجھ اٹھائیں اور ان لوگوں کے بوجھ کا بھی ایک حصہ اٹھائیں جن کو علم کے بغیر یہ گم راہ کر رہے ہیں۔ بہت برا بوجھ ہے جو یہ اٹھا رہے ہیں۔

قرآن مجید سے فکر و عمل کی ظلمتیں کافور ہوتی ہیں، لیکن آخرت پر ایمان نہ ہو تو آئینہ قلب میں جلا نہ پیدا ہوگی اور قرآن مجید کا عکس اس پر نہیں پڑے گا۔ دیکھئے اس کیفیت کا کتنے موثر الفاظ میں بیان ہوا ہے:

وَ اِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَ بَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ﴿٤٥﴾ وَّ جَعَلْنَا عَلٰي قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓي اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ﴿٤٦﴾ (بنی اسرائیل:۴۵، ۴۶)	جب آپ قرآن پڑھتے ہیں تو ہم آپ کے اور ان لوگوں کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ایک مخفی حجاب حائل کر دیتے ہیں۔ ہم ان کے دلوں پر پردے ڈال دیتے ہیں کہ وہ اسے سمجھ نہ سکیں اور ان کے کانوں میں گرانی ڈال دیتے ہیں اور جب آپ قرآن میں اپنے رب کا، جو اکیلا ہے ذکر کرتے ہیں تو یہ نفرت کے ساتھ پیٹھ پھیر کر چلے جاتے ہیں۔

یہی مضمون ایک دوسرے مقام پر اس طرح آیا ہے:

وَ اِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٧٣﴾ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ ﴿٧٤﴾ (المومنون:۷۳، ۷۴)	بے شک آپ ان کو صراط مستقیم کی طرف بلا رہے ہیں اور جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ سیدھے راستے سے پھرے ہوئے ہیں۔

جس شخص کو یہ احساس ہی نہ ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کا بندہ ہے اور مرنے کے بعد

اسے اللہ کے سامنے جواب دینا ہے وہ اس کے دین کی کوئی ضرورت ہی نہیں محسوس کرے گا، لیکن اگر آدمی اس حقیقت کو مان لے کہ آخرت آئے گی اور اس طرح آئے گی کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے والے اس کے انعام کے حق دار ہوں گے اور اس کے نافرمان بدترین سزا کے مستحق ہوں گے، وہ کبھی یہ جرأت نہیں کرسکتا کہ اللہ کے دین کو رد کردے، کیوں کہ دین کے بغیر وہ ہمیشہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے عذاب کی زد میں محسوس کرے گا۔ اسی وجہ سے قرآن کہتا ہے:

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ .... (الانعام:۹۲)

جو لوگ آخرت پر یقین رکھتے ہیں وہ اس (کتاب) پر ایمان لاتے ہیں۔

ایمان بالآخرۃ ہی سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا اور اس کی معصیت اور نافرمانی سے اجتناب کا جذبہ ابھرتا ہے۔ شاہ راہِ حیات میں کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ کل قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں مجھ سے ضرور سوال کرے گا۔ اگر میں غلط رخ پر بڑھا تو اس کی گرفت سے مجھے کوئی چیز بچا نہ سکے گی۔ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے قیامت میں جب نعمت بھری جنتوں میں ہوں گے اور اپنے حسنِ عمل کی جزا پا رہے ہوں گے اس وقت وہ سوچیں گے اور آپس میں کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ عنایتیں ہم پر اس لیے ہیں کہ ہمیں دنیا میں اس دن کا خوف لگا رہا اور ہم اللہ کی نافرمانی سے بچتے رہے:

وَ اَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۲۵﴾ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ﴿۲۶﴾ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَ وَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ ﴿۲۸﴾

(الطور:۲۵-۲۸)

وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوکر پوچھیں گے۔ کہیں گے کہ بے شک ہم اس سے قبل (دنیا میں) اپنے اہل وعیال میں (آخرت کے عذاب سے) ڈرتے رہتے تھے۔ پس اللہ نے ہم پر احسان کیا اور ہمیں (جہنم کی) تپش کے عذاب سے بچا لیا۔ ہم اس سے پہلے (دنیا میں) اسے پکارتے تھے۔ بے شک وہ بڑا احسان کرنے والا اور بہت رحم فرمانے والا ہے۔

اہل جنت کی ایک اور گفتگو سنئے اور ذرا ان کی مسرت کا حال دیکھئے:

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ ۙ فَیَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِیَهْ ۚ﴿۱۹﴾ اِنِّیْ ظَنَنْتُ اَنِّیْ مُلٰقٍ حِسَابِیَهْ ۚ﴿۲۰﴾ فَهُوَ فِیْ عِیْشَةٍ رَّاضِیَةٍ ۙ﴿۲۱﴾ فِیْ جَنَّةٍ عَالِیَةٍ ۙ﴿۲۲﴾ قُطُوْفُهَا دَانِیَةٌ ﴿۲۳﴾ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِیْٓـًٔۢا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِی الْاَیَّامِ الْخَالِیَةِ ﴿۲۴﴾ (الحاقۃ:۱۹-۲۴)

جس شخص کو اس کا نامۂ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ کہے گا، لو پڑھو میرا نامۂ اعمال۔ مجھے یقین تھا کہ مجھے اپنے حساب کا سامنا کرنا ہوگا، وہ پسندیدہ عیش میں ہوگا، اونچی بہشت میں ہوگا۔ اس کے میوے قریب ہوں گے۔ (کہا جائے گا) کھاؤ، پیو مزے کے ساتھ ان اعمال کے نتیجے میں جو تم نے پچھلے دنوں میں کیے تھے۔

زندگی پر عقیدۂ آخرت کے اثرات

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی سیرت کے تاب ناک پہلو جہاں بیان کرتا ہے، وہاں بالعموم ان کے خوفِ آخرت کا بھی ذکر کرتا ہے کہ آخرت کی جواب دہی کا تصور ان پر چھایا رہتا ہے اور وہ ہر وقت اس سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں ان کی زندگی میں جو دینی اور اخلاقی انقلاب آتا ہے اور سیرت و کردار میں جو نکھار پیدا ہوتا ہے اسے بھی سامنے لاتا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ هُمْ مِّنْ خَشْیَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۙ﴿۵۷﴾ وَ الَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ یُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿۵۸﴾ وَ الَّذِیْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا یُشْرِكُوْنَ ۙ﴿۵۹﴾ وَ الَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَاۤ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ۙ﴿۶۰﴾ اُولٰٓئِكَ یُسٰرِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ وَ هُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ﴿۶۱﴾ (المومنون:۵۷-۶۱)

بے شک وہ لوگ جو اپنے رب کی خشیت سے ڈرتے ہیں، جو اپنے رب کی آیات پر ایمان رکھتے ہیں اور جو اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے اور جو دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں لیکن ان کے دل کانپتے رہتے ہیں کہ انھیں اپنے رب کی طرف واپس جانا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو نیکیوں (کی راہ) میں دوڑتے ہیں اور ان تک سب سے پہلے پہنچتے ہیں۔

ایک اور جگہ ارشادِ باری ہے:

وَالَّذِیۡنَ یُصَدِّقُوۡنَ بِیَوۡمِ الدِّیۡنِ ﴿۲۶﴾ وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ مِّنۡ عَذَابِ رَبِّہِمۡ مُّشۡفِقُوۡنَ ﴿۲۷﴾ اِنَّ عَذَابَ رَبِّہِمۡ غَیۡرُ مَاۡمُوۡنٍ ﴿۲۸﴾
(المعارج:۲۶-۲۸)

وہ لوگ جو آخرت کے دن پر یقین رکھتے ہیں اور وہ جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ بے شک ان کے رب کے عذاب سے کسی کو بے خوف نہیں ہونا چاہیے۔

اسی مضمون کی ایک اور آیت ملاحظہ ہو:

...رِجَالٌ ۙ لَّا تُلۡہِیۡہِمۡ تِجَارَۃٌ وَّ لَا بَیۡعٌ عَنۡ ذِکۡرِ اللّٰہِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَ اِیۡتَآءِ الزَّکٰوۃِ ۪ۙ یَخَافُوۡنَ یَوۡمًا تَتَقَلَّبُ فِیۡہِ الۡقُلُوۡبُ وَ الۡاَبۡصَارُ ﴿۳۷﴾
(النور:۳۷)

...(اللہ کے گھروں میں) ایسے لوگ ہیں کہ انھیں کوئی تجارت یا لین دین اللہ کے ذکر سے، نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے غافل نہیں کرتی۔ وہ ڈرتے رہتے ہیں اس دن سے جس میں دل اور نگاہیں الٹ جائیں گے۔

دنیا مقصود نہ بن جائے

اسلام نے ترکِ دنیا کی تعلیم نہیں دی ہے۔ وہ رہبانیت کے خلاف ہے۔ (الحدید:۲۷)۔ البتہ وہ اس سے منع کرتا ہے کہ دنیا مقصود بن جائے، زندگی اس کے لیے وقف ہوجائے اور آخرت فراموش کردی جائے۔ وہ چاہتا ہے کہ حیاتِ دنیا کو فلاحِ آخرت کا ذریعہ بنایا جائے۔ یہ سوچ کر زندگی گزاری جائے کہ دنیا کی ہر چیز فنا پذیر ہے۔ اس کے لیے آخرت، جو ابدی اور دائمی ہے، چھوڑی نہیں جاسکتی ورنہ یہ بڑے خسارے کا سودا ہوگا۔ فرمایا:

وَمَاۤ اُوۡتِیۡتُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ فَمَتَاعُ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ زِیۡنَتُہَا ۚ وَمَا عِنۡدَ اللّٰہِ خَیۡرٌ وَّ اَبۡقٰی ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۶۰﴾
(القصص:۶۰)

جو کچھ تم کو دیا گیا ہے وہ دنیا کی زندگی کا سامان اور اس کی زینت و آرائش ہے اور جو اللہ کے پاس ہے وہ اس سے بہت بہتر اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ تو کیا تم سمجھ سے کام نہیں لیتے ہو؟

ترجیحِ آخرت کی جگہ ترجیحِ دنیا انسان کو تباہی کی طرف لے جا رہی ہے۔ کاش

اسے وہ محسوس کرے۔

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ وَ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ۝ (الاعلیٰ:۱۶-۱۷)

تم تو دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو، حالاں کہ آخرت اس سے بدرجہا بہتر اور ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا:

وَ مَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ ؕ وَ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ (العنکبوت:۶۴)

یہ دنیا کی زندگی تو محض لہو و لعب ہے اور بے شک دارِ آخرت ہی اصل زندگی ہے، کاش وہ اسے جانتے۔

دنیا ناپائے دار ہے

اس دنیا کو، اس کی چمک دمک اور رنگ و روغن کو کوئی ثبات نہیں اور اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ یہ آج ہے، کل نہیں ہے۔ لیکن افسوس کہ انسان اس کے حسنِ ناپائے دار کا فریفتہ ہے، اس کے پیچھے اپنے آخری انجام سے بے خبر دوڑتا پھرتا ہے، کبھی نہیں سوچتا کہ یہ شادابی و تازگی وقتی ہے، گرم ہوا کے ایک تھپیڑے سے پژمردہ ہوجائے گی اور وہ دستِ حسرت و ندامت ملتا رہ جائے گا۔ دیکھئے سورۂ حدید میں کس عمدگی سے یہ بات سمجھائی گئی ہے:

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّ زِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ؕ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ؕ وَ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٌ ؕ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝ (الحدید:۲۰)

جان لو، دنیا کی زندگی تو بس لہو و لعب اور زینت، ایک دوسرے پر فخر و مباہات کرنا اور مال و اولاد میں ایک دوسرے سے زیادہ دکھانا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے بارش سے جو نباتات نکلتی ہے وہ کسانوں کو اچھی لگتی ہے۔ پھر وہ خشک ہوتی ہے اور تم اسے زرد دیکھتے ہو پھر (کسی ناگہانی آفت سے) وہ چورا چورا ہوکر رہ جاتی ہے۔ (یہ دنیا کا حال ہے) اور آخرت میں شدید عذاب ہے اور اللہ کی مغفرت اور رضا مندی ہے اور دنیا کی زندگی تو بس دھوکے کا سامان ہے۔

دنیا کی زندگی کو کھیل کود اس لیے کہا گیا ہے کہ کھیل تماشا اچھا تو لگتا ہے لیکن اہم امور سے غافل کر دیتا ہے۔ زیب و زینت ایک ظاہری چیز ہے۔ یہ انسان کی عظمت و برتری کا ثبوت نہیں ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی سرطان کا مریض یا اخلاق باختہ شخص زربفت کا لباس پہن لے۔ اس سے وہ صحت مند اور بااخلاق نہیں ہوجائے گا۔ یہی حال دنیا کا ہے۔ اس کا ملنا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ انسان خدا اور خلق کی نگاہ میں قدر و قیمت اور عظمت کا حامل ہے۔ پھر دنیا کا ملنا بھی کیا ملنا ہے۔ ع

مل مل جائے چھن چھن جائے

اس دنیائے ناپائے دار پر ریجھنا اور جان دینا بڑی نادانی ہے۔ آدمی تمنا اور آرزو کرے تو آخرت کی کرے، لپکے اور دوڑے تو آخرت کی طرف لپکے، طلب کرے تو جنت طلب کرے، فکر کرے تو جنت کی فکر کرے، جو ابدی راحت کا گھر ہے، جس کی نعمتیں لازوال ہیں اور جس کے پانے کے بعد محرومی کا کبھی احساس نہ ہوگا۔ چناں چہ سورۂ حدید کی جو آیت ابھی گزری ہے اس کے فوراً بعد اسی طرف متوجہ کیا گیا ہے:

سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۱﴾ (الحدید:۲۱)	دوڑو اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان اور زمین کی وسعت کی طرح ہے۔ یہ ان لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

وہ انسان کتنا بدنصیب ہے جو اپنی کوشش اور محنت سے دنیا تو بنا لے اور آخرت برباد کر بیٹھے۔ اس کے برعکس وہ شخص کس قدر قابل رشک ہے جو اپنے ایمان اور حسنِ عمل کے نتیجہ میں ہمیشہ کے لیے جنت کا مستحق قرار پائے اور وہاں کی ضیافت اور میزبانی کا

مستحق قرار پائے۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ﴿١٠٣﴾ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ هُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ﴿١٠٤﴾ أُولٰٓئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَ لِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ﴿١٠٥﴾ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوا وَاتَّخَذُوٓا اٰيٰتِيْ وَ رُسُلِيْ هُزُوًا ﴿١٠٦﴾ إِنَّ الَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴿١٠٧﴾ خٰلِدِينَ فِيهَا لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا ﴿١٠٨﴾

(الکہف:۱۰۳-۱۰۸)

کہو، کیا میں تمھیں بتاؤں وہ کون لوگ ہیں جو اعمال کے لحاظ سے سب سے زیادہ خسارے میں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی سعی و جہد دنیا کی زندگی میں ضائع گئی اور وہ اس خیال میں رہے کہ وہ بڑا اچھا کام کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی آیات اور اس سے ملاقات کا انکار کیا۔ پس ان کے اعمال رائیگاں گئے۔ ہم قیامت کے دن انھیں کوئی وزن نہیں دیں گے۔ یہ ان کی جزا جہنم اس وجہ سے ہے کہ انھوں نے کفر کیا اور میری آیات اور میرے رسولوں کو مذاق بنا لیا۔ (اس کے برخلاف) بے شک جو لوگ ایمان لائے اور اچھے اعمال کیے ان کی مہمانی کے لیے فردوس کے باغ ہوں گے۔ اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور اسے چھوڑنا نہیں چاہیں گے۔

مومن اور کافر کے درمیان ایک بڑا فرق یہی ہے کہ مومن ہر معاملہ میں آخرت کے نفع و نقصان کو دیکھتا ہے اور کافر کے سامنے صرف دنیا اور اس کا مفاد ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ جو شخص دنیا حاصل کرنا چاہے اسے اللہ تعالیٰ کے قاعدے، ضابطے اور مرضی کے تحت دنیا ملتی ہے اور جو آخرت طلب کرے وہ اللہ کی عنایت سے آخرت پاتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝۱۸ وَ مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَ سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ۝۱۹ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَ هٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ وَ مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۝۲۰ اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ وَ لَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّ اَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ۝۲۱

(بنی اسرائیل:۱۸-۲۱)

جو شخص دنیا کا فائدہ چاہے گا تو ہم جلد ہی اسے جتنا چاہیں گے اور جس کے لیے چاہیں گے دے دیں گے۔ پھر ہم اس کے لیے جہنم مقرر کر دیں گے جس میں وہ ملامت زدہ اور راندۂ دربار ہو کر داخل ہوگا۔ لیکن جو آخرت چاہے گا اور اس کے لیے اس طرح کوشش کرے گا جیسے کرنی چاہیے اور وہ مومن بھی ہوگا تو اس طرح کے سب لوگوں کی کوشش کی قدر ہوگی۔ ہم تمھارے رب کی عطا ہی سے (اس دنیا میں) اُن کو بھی دیتے ہیں اور ان کو بھی دیتے ہیں۔ تمھارے رب کی بخشش پر کوئی بندش نہیں ہے۔ دیکھو ہم نے (دنیا میں) کس طرح ان میں سے بعض کو بعض پر برتری دی ہے اور آخرت میں تو (اس کے مقابلہ میں) بڑے درجات ہیں اور بڑی فضیلت ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ۝۲۰

(الشوریٰ:۲۰)

جو شخص آخرت کی کھیتی طلب کرے تو ہم اس کی کھیتی میں اس کے لیے اضافہ کر دیتے ہیں اور جو دنیا کی کھیتی چاہے تو ہم اس میں سے کچھ اسے دے دیتے ہیں اور آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہ ہوگا۔

اسی مفہوم کی ایک اور آیت ہے:

... وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ

... جو شخص ثوابِ دنیا چاہے تو ہم اس میں سے کچھ اسے دے دیتے ہیں اور جو ثوابِ آخرت کا طالب ہو تو اسے اس میں سے

وَسَنَجْزِی الشّٰکِرِیْنَ (آل عمران:۱۴۵) دے دیتے ہیں اور شکر گزار بندوں کو جلد ہی جزا عطا کریں گے۔

اللہ تعالیٰ کے اس ضابطہ کے تحت جو دنیا کے طالب ہیں ان سے کہا گیا:

مَنْ کَانَ یُرِیْدُ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا وَ زِیْنَتَھَا نُوَفِّ اِلَیْھِمْ اَعْمَالَھُمْ فِیْھَا وَ ھُمْ فِیْھَا لَا یُبْخَسُوْنَ ﴿۱۵﴾ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ لَیْسَ لَھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ اِلَّا النَّارُ وَ حَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِیْھَا وَ بٰطِلٌ مَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾ (ھود:۱۵،۱۶)

جو لوگ حیاتِ دنیا اور اس کی زیب و زینت طلب کریں تو ہم ان کے اعمال کا پورا پورا صلہ اسی دنیا میں دے دیتے ہیں اور ان کے لیے اس دنیا میں کمی نہیں ہوتی۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں سوائے جہنم کی آگ کے کچھ نہیں ہوگا۔ جو کچھ دنیا میں انھوں نے کیا وہ ضائع جائے گا اور جو عمل کر رہے ہیں وہ بے فائدہ ٹھہرے گا۔

آخرت کی کامیابی حقیقی کامیابی ہے

وہ لوگ جن کا اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں ہے، وہ دنیا کے لیے سرگرداں رہتے ہیں لیکن اہلِ ایمان کی نظر آخرت کی کامیابی پر ہوتی ہے۔ وہ اسی کے لیے جیتے ہیں اور اسی کے لیے تگ و دو کرتے ہیں۔ یہ کامیابی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے ملتی ہے۔ قرآن مجید کے نزدیک یہی اصل کامیابی ہے۔ یہی فوزِ عظیم ہے۔

وَ مَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ یُدْخِلْہُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا وَ ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿۱۳﴾ (النساء:۱۳)

جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اسے وہ ایسی جنتوں میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے۔

ایک جگہ فرمایا: تم لوگ اس دنیا میں اللہ اور رسول پر ایمان اور اس کی راہ میں جدوجہد اور قربانی کا ثبوت پیش کرو۔ پھر اللہ کی عنایات کو دیکھو:

يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَ يُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۲﴾
(الصف:۱۲)

اللہ تمھارے گناہوں کو معاف کردے گا اور تمھیں ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی اور پاکیزہ مکانات دے گا جو ہمیشہ رہنے والی جنتوں میں ہوں گے، یہ بڑی کامیابی ہے۔

ایمان اور عمل صالح سے انسان آخرت میں جنت کا مستحق ہوگا۔ یہ اس کے لیے فوزِ کبیر (بڑی کامیابی) ہے۔ اس سے بڑی اور کوئی کامیابی نہیں ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ۬ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ ﴿۱۱﴾
(البروج:۱۱)

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے اعمال صالحہ اختیار کیے ان کے لیے ایسی جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ یہ بڑی کامیابی ہے۔

یہی اللہ کا سب سے بڑا فضل ہے جو اس کے ان نیک بندوں پر ہوگا جو ایمان وعملِ صالح کی دولت لے کر اس کے دربار میں پہنچیں گے۔

تَرَى الظّٰلِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا كَسَبُوْا وَهُوَ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِیْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ ۚ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ﴿۲۲﴾
(الشوریٰ:۲۲)

ظالموں کو تم دیکھوگے کہ جو انھوں نے کمایا ہے اس کی وجہ سے ڈر رہے ہوں گے لیکن عذاب ان پر واقع ہوکر رہے گا اور جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے اچھے عمل کیے ان کے لیے جنتوں کے باغات ہیں۔ ان کے لیے ان کے رب کے پاس وہ سب کچھ ہے جو وہ چاہیں گے۔ یہ بڑا فضل ہے۔

خوش نصیب ہے وہ انسان اور قابلِ صد رشک، جس کے حصے میں آخرت کی کامیابی آئے اور وہ جنت کا مستحق قرار پائے۔

اسلام کی دعوت اور فکرِ آخرت

اسلام کی دعوت آخرت سے غافل انسانوں کا کام نہیں ہے بلکہ اس کے لیے

ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو دنیا پر آخرت کو ترجیح دیں اور جو اس تصور سے کانپتے ہوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوں گے اور ان سے پوچھا جائے گا کہ انھوں نے اس کے دین کی کوئی خدمت کی یا نہیں؟

اسلام کی دعوت کوئی معمولی کام نہیں ہے بلکہ بہت بڑا جہاد ہے۔ یہ ایک لمبی جنگ ہے جو متعدد محاذوں پر لڑی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴿۵۲﴾ (الفرقان:۵۲) اور تم ان سے اس قرآن کے ذریعے بڑا جہاد کرو۔

خدا نے جس جہاد کا حکم دیا ہے اسے الفاظ میں بیان کرنا تو آسان ہے لیکن اس میں شریک ہونا اور اپنا حصہ ادا کرنا آسان نہیں ہے۔ اس میں اُن بے شمار لوگوں کی مخالفت کا سامنا کرنا ہوتا ہے جو اللہ کے دین سے اختلاف کرتے اور اسے ناپسند کرتے ہیں، بلکہ اسے مٹا دینا چاہتے ہیں۔ یہ وہ جہاد ہے جس میں بعض اوقات اپنے بہترین تعلقات توڑنے پڑتے ہیں، خونی رشتوں کو ختم کرنا ہوتا ہے، عزیزوں تک کو آدمی چھوڑنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اتنا بڑا جہاد کوئی ایسا شخص نہیں کرسکتا جو دین کی خاطر کسی کی ناراضی مول نہ لینا چاہے، جو کسی تعلق کا ٹوٹنا گوارا نہ کرے اور جو کسی دوست کی جدائی برداشت نہ کرسکے۔ اس کو وہی شخص شروع بھی کرسکتا ہے اور شروع کرنے کے بعد جاری بھی رکھ سکتا ہے جس کو دنیا کی ہر چیز سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے دین سے محبت ہو، جو اپنے رب کو ناخوش کر کے کسی کو خوش کرنے کے لیے تیار نہ ہو، جس کو آخرت پر یقین ہو اور جو یہ جانتا ہو کہ وہاں اس دنیا کا کوئی بھی تعلق اس کے کام نہیں آئے گا۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَ اَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ؕ

جو لوگ اللہ اور آخرت کے دن پر یقین رکھتے ہیں ان کو تم ان لوگوں سے مودّت کا تعلق رکھتے ہوئے نہیں پاؤ گے جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں۔ خواہ وہ ان کے باپ یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کے کنبے ہی کے لوگ کیوں نہ ہوں۔ یہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان

وَ يُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۲۲﴾

(المجادلۃ:۲۲)

ثبت کر دیا ہے اور ان کو اپنے فیضِ خاص سے قوت دی ہے۔ ان کو اللہ تعالیٰ ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، جن میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوگا اور وہ اس سے راضی ہوں گے۔ یہ اللہ کا گروہ ہے اور سن لو اللہ کا گروہ ہی کامیاب ہونے والا ہے۔

اسلام کی دعوت دینا اپنے آپ کو امتحان میں ڈالنا ہے۔ اس کام کو اختیار کرنے کے بعد آسائش و راحت کی تلاش بے سود ہے۔ جو شخص اس راہ میں آگے بڑھتا ہے بسااوقات اسے آزمایا جاتا ہے اور ہر طرح آزمایا جاتا ہے۔ اس کو ذہنی اور جسمانی اذیتیں پہنچتی ہیں، ڈرایا اور دھمکایا جاتا ہے، اس کے مال و دولت کو نقصان پہنچتا ہے، اس کے لیے طوق وسلاسل آراستہ کیے جاتے ہیں اور اسے قید و بند سے گزارا جاتا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ اس میں ایسے مواقع بھی آسکتے ہیں جب کہ آدمی کو اپنا سر دے کر اسلام کی خدمت کرنی پڑے۔ اتنا بڑا اقدام وہی شخص کرسکتا ہے جس کو آخرت پر ایمان ہو، جس کو جسم و جان کی راحت سے زیادہ آخرت کی کامیابی کی فکر ہو، جس کو یہاں کے مصائب و شدائد سے زیادہ وہاں کے عذاب کا خوف ہو۔ لیکن اگر آخرت پر ایمان نہ ہوتو آدمی موت سے فرار کی راہیں ڈھونڈتا پھرے گا تاکہ کسی طرح جان بچی رہے، اس لیے کہ وہ جو کچھ پانا چاہتا ہے اسی دنیا میں پانا چاہتا ہے، اس کے لیے کوئی اور دنیا نہیں ہوتی جس میں کچھ حاصل کرنے کی وہ توقع کرسکے۔ اسی وجہ سے قرآن کہتا ہے:

لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۴﴾ اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ ارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ

(اے پیغمبر!) جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ تم سے اس بات کی اجازت نہیں چاہتے کہ ان کو اپنی جان و مال کے ساتھ جہاد سے الگ رہنے دیا جائے اور اللہ جانتا ہے ان لوگوں کو جن کے اندر تقویٰ ہے۔ یہ اجازت تو تم سے وہ لوگ مانگتے ہیں جو اللہ اور آخرت کے

رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ﴿٤٥﴾

دن پر ایمان نہیں رکھتے، جن کے دلوں میں شک ہے اور جو اپنے شک کی حالت میں حیران ہیں کہ کیا کریں، کیا نہ کریں۔

(التوبہ: ۴۴-۴۵)

اسلام کی دعوت سہل نہیں ہے۔ یہ اپنے آپ کو مشکلات او رمصائب کا ہدف بنانا ہے۔ اس میں بڑے نازک مراحل آتے رہے ہیں اور آسکتے ہیں۔ وہ وقت بھی آسکتا ہے جب کہ اسلام کے ذکر پر زبان گدی سے کھینچ لی جائے، اللہ کی راہ پر چلنا انگاروں پر چلنے سے زیادہ مشکل ہوجائے اور دین کی حمایت میں جو ہاتھ اٹھے قلم کر دیا جائے۔ دنیا یہ مناظر دیکھ چکی ہے۔ اس کے باوجود ہم نے اور آپ نے ارادہ کیا ہے کہ دنیا کو اسلام کی دعوت دیں گے اور اسے سربلند کرنے کی جدوجہد کریں گے۔ہم اپنے اس ارادے پرعمل کے قابل اسی وقت ہوسکتے ہیں جب کہ ہمارے سامنے صرف آخرت اور اس کا مفاد ہو اور یہ حقیقت ہماری رگ وپے میں اتر جائے کہ دنیا فانی ہے اور آخرت باقی رہنے والی ہے:

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ۗ وَ لَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٩٦﴾

جو کچھ تمھارے پاس ہے وہ فنا ہوجائے گا اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے اور جنھوں نے صبر کیا (اور ثابت قدم رہے) ہم ان بہتر اعمال پر جو وہ کر رہے تھے ان کا اجر انھیں ضرور دیں گے۔

(النحل: ۹۶)

ہمارے ایک طرف اللہ تعالیٰ کی تیار کردہ جنت ہے، غم وحزن سے پاک زندگی ہے اور وہ سب کچھ ہے، جسے نہ تو کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی بشر نے اس کا تصور کیا۔ دوسری طرف دنیا کا عیش وآرام ہے، بے قید زندگی ہے اور حلال و حرام کے فرق کے بغیر ترقی کے مواقع اور امکانات ہیں۔ ان دونوں میں سے کسی ایک چیز کو ہمیں اختیار کرنا ہے۔ کیوں کہ یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ حاصل نہیں ہوسکتیں۔ دنیا میں جو شخص گرفتار ہوگا یقیناً آخرت اس کے حصے میں نہیں آئے گی اور جو اپنے لیے آخرت چاہے گا لازماً اس کی دنیا کو نقصان پہنچے گا۔ اللہ کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ

وسلم نے صاف صاف فرما دیا ہے۔

مَنْ اَحَبَّ دُنْيَاهُ اَضَرَّ بِاٰخِرَتِهٖ وَ مَنْ اَحَبَّ اٰخِرَتَهٗ اَضَرَّ بِدُنْيَاهُ فَاٰثِرُوْا مَا يَبْقٰى عَلٰى مَا يَفْنٰى[1]

جو شخص اپنی دنیا سے محبت کرے گا وہ اپنی آخرت کو نقصان پہنچائے گا اور جو اپنی آخرت سے محبت کرے گا وہ اپنی دنیا کو نقصان پہنچائے گا، تو تم باقی رہنے والی (آخرت) کو فنا ہونے والی (دنیا) پر ترجیح دو۔

یہ حدیث ہمیں حکم دیتی ہے کہ ہم دنیا کے مقابلے میں آخرت کو ترجیح دیں۔ اگر اس حکم کو ہم مانتے ہیں اور آخرت کے فائدے کی خاطر دنیا کا نقصان برداشت کرنے کے لیے تیار ہیں تو دین کی خدمت کی راہیں ہم پر کھل سکتی ہیں، ورنہ اس کے دروازے ہم پر بند ہوں گے۔

دعوت کی راہ میں مصائب ہی سے آزمایا نہیں جاتا بلکہ راحتوں سے بھی آزمایا جاتا ہے۔ دعوت کو ختم کرنے کے لیے یہاں قید خانوں کے دروازے ہی نہیں کھلتے بلکہ تخت و تاج بھی پیش کیے جاتے ہیں۔ ظلم و تشدد کے باوجود دعوت اگر پھیلتی جائے تو اس کے آگے دولت کے بندھ باندھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ امتحان بڑا سخت ہوتا ہے۔ جو لوگ لوہے کی زنجیروں کو توڑ پھینکتے ہیں وہ سونے کی زنجیر میں بہ خوشی قید ہو جاتے ہیں۔ اس امتحان میں وہی شخص کامیاب ہوسکتا ہے جو یہاں کی بڑی سے بڑی مسرت کو ہیچ سمجھے، جو آخرت کی نعمتوں کو پانے کی خوشی میں یہاں کی راحتوں کو بھول جائے، جس کے لیے وہاں کے عذاب کا تصور یہاں کی ہر تکلیف کو آسان کردے، جو آخرت کی کامیابی ہی کو حقیقی کامیابی اور آخرت کی ناکامی ہی کو اصل ناکامی سمجھے، جس کا ایمان ہو۔

فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾ (آل عمران: ۱۸۵)

جو شخص دوزخ کی آگ سے دور ہٹا دیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا وہی کامیاب ہوا، اور یہ دنیا تو محض دھوکے کا سامان ہے۔

اللہ کے دین کا داعی جب دنیا کو بتاتا ہے کہ قیامت آئے گی اور کوئی چیز انسان کو اپنے انجام تک پہنچنے سے روک نہیں سکے گی تو عقل کہتی ہے کہ اس کو ایک لمحہ کے

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الرقاق، بحوالہ مسند احمد، بیہقی

لیے بھی اپنے انجام سے بے فکر نہیں ہونا چاہیے۔ کیوں کہ جس شخص کو قیامت کے آنے کی خبر نہیں ہے وہ تو اس سے غافل ہوسکتا ہے، لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ جو شخص شب و روز اس کے آنے کی اطلاع دے رہا ہو اس پر غفلت کی نیند طاری ہوجائے۔ اس لیے آخرت سے ڈرانے والے کی زندگی اگر اس کے خوف سے خالی ہو تو اس کے معنی یہی سمجھے جائیں گے کہ وہ ایک جھوٹی خبر کے ذریعے دنیا والوں کو دھوکا دے رہا ہے اور ان کے عیش کو مکدر کرنا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں انسان کو اس بات کا حکم دیا ہے کہ وہ دوسروں کو آخرت کے عذاب سے بچائے، وہیں اسے یہ بھی ہدایت دی ہے کہ وہ اپنی ذات کو بھی اس سے بچانے کی کوشش کرے۔ کیوں کہ دنیا کا کوئی بھی شخص نجات کا جتنا حاجت مند ہوسکتا ہے، اتنا ہی وہ خود بھی اس کا محتاج ہے۔ اس سے بڑی خودکشی اور کوئی نہیں ہوگی کہ آدمی دوسروں کو تو جہنم سے بچائے اور خود اس کی آگ میں کود پڑے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں انسان کے ایک ایک عمل کا حساب ہوگا اور وہ جو کچھ اس دنیا میں کر رہا ہے اس کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔ وہاں نجات اسی شخص کی ہوگی جو پورے خلوص کے ساتھ اس کے دین کو قبول کرے اور دل و جان سے اس کی اتباع کے لیے تیار ہوجائے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جس شخص کے سامنے یہ خوف ناک دن ہوگا وہ اپنے انجام کا ہمیشہ فکر مند ہوگا۔ اس کے بارے میں یہ سوچنا بھی شاید صحیح نہ ہو کہ وہ دوسروں کو تو آخرت کے عذاب سے ڈراتا رہے گا اور اپنے آپ کو اس کے سامنے پیش کردے گا۔ اتنی بڑی جرأت کا اسی وقت اس سے امکان ہے جب کہ وہ آخرت کا بار بار نام لینے کے باوجود اس کو فی الواقع بھول چکا ہو اور وہاں کے عذاب و ثواب کو ایک مذاق سمجھ رہا ہو۔

قرآن مجید- اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب

قرآن کا تعارف

قرآن مجید اس زمین پر اللہ کی آخری کتاب ہے۔ یہ هُدًى لِّلنَّاسِ (البقرة:۱۸۵) ہے۔ یہ قیامت تک تمام انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے نازل ہوئی ہے۔ اس سے وہ دنیا میں کامیاب اور سرخ رو اور آخرت میں ابدی فوز و فلاح سے ہم کنار ہو سکتے ہیں۔ یہ زندگی کی 'صراط مستقیم' ہے۔ اس دنیا میں انسان کے سامنے مختلف راہیں کھلی ہیں۔ یہ کتاب وہ سیدھا اور سچا راستہ دکھاتی ہے، جس پر چلنے والا کبھی بے راہ روی کا شکار نہ ہوگا اور جو اسے چھوڑ کر کوئی دوسری راہ اختیار کرے منزل تک اس کی رسائی ممکن نہیں ہے۔

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۶﴾

(المائدة:۱۵، ۱۶)

بے شک تمھارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشنی اور واضح کتاب آ گئی ہے۔ اللہ اس کے ذریعے اس شخص کو سلامتی کی راہ دکھاتا ہے جو اس کی مرضیات کی اتباع کرنا چاہے۔ انھیں وہ ظلمتوں سے نکال کر روشنی میں اپنے اذن سے پہنچاتا ہے اور صراطِ مستقیم کی طرف ان کی ہدایت کرتا ہے۔

قرآن مجید پیغامِ بشارت بھی ہے اور انذار و تنبیہ بھی۔ جو لوگ اس کی بتائی ہوئی راہ پر چلیں انھیں وہ خوش خبری دیتا ہے اور جو اس راہ سے منحرف ہوں انھیں وہ آگاہ

کرتا ہے کہ وہ ابدی ناکامی سے دوچار ہوں گے۔

اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ یَھْدِیْ لِلَّتِیْ ھِیَ اَقْوَمُ وَ یُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَھُمْ اَجْرًا کَبِیْرًا۝ وَّاَنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ اَعْتَدْنَا لَھُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا۝ (بنی اسرائیل:۹،۱۰)

بے شک یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو سیدھی ہے اور خوش خبری دیتا ہے ایمان والوں کو جو نیک اعمال کرتے ہیں کہ ان کے لیے بڑا اجر ہے اور جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے لیے ہم نے درد ناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

قرآن مجید انسان کی فطرت کی آواز ہے۔ اس آواز پر اسے دوڑ پڑنا چاہیے، لیکن بالعموم انسان اپنی فطرت کی اس پکار کو نہیں سنتا اور سنتا ہے تو جواب نہیں دیتا۔ اس کے بہت سے خارجی اور داخلی اسباب ہیں۔ قرآن انسان کو اس کی فطرت کا بھولا ہوا سبق یاد دلاتا اور قبولِ حق کی دعوت دیتا ہے۔ اسی وجہ سے اسے 'ذکر' کہا گیا ہے۔ حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ کو توریت دی گئی تھی۔ یہ حق و باطل کا فرق واضح کرتی تھی، اس میں ہدایت اور روشنی تھی، یہ اللہ اور آخرت سے ڈرنے والوں کے لیے 'ذکر' تھی۔ اس میں اللہ کے احکام تھے اور شریعت تھی، لیکن رفتارِ زمانہ کے ساتھ خود اس کے ماننے والوں کے ہاتھوں اس میں تحریف ہوتی چلی گئی۔ اس کے بعد یہ قرآن نازل ہوا۔ فرمایا:

وَ ھٰذَا ذِکْرٌ مُّبٰرَکٌ اَنْزَلْنٰہُ اَفَاَنْتُمْ لَہٗ مُنْکِرُوْنَ۝ (الانبیاء:۵۰)

یہ ایک مبارک ذکر ہے جو ہم نے نازل کیا ہے تو کیا تم اس کا انکار کرتے ہو۔

انسان جب قرآن کا انکار کرتا ہے تو وہ حیرت کے ساتھ کہتا ہے:

بَلْ اَتَیْنٰھُمْ بِذِکْرِھِمْ فَھُمْ عَنْ ذِکْرِھِمْ مُّعْرِضُوْنَ۝ (المومنون:۷۱)

بلکہ ہم تو ان کے پاس ان کے لیے ذکر لائے ہیں لیکن وہ ہیں کہ اپنے اس ذکر سے اعراض کر رہے ہیں۔

'ذکر' کے معنی یاد دہانی کے ہیں۔ اس میں شرف و منزلت اور عظمت کا تصور بھی ہے، اس لیے کہ قرآن نوعِ انسانی کے لیے باعثِ شرف ہے۔ وہ اسے عظمت و سربلندی عطا کرتا ہے۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۱۰

ہم نے تمھاری طرف کتاب نازل کی ہے اس میں تمھارا ذکر ہے کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔ (الانبیاء:۱۰)

جو شخص اس 'ذکر' کو رد کردے وہ خود آپ اپنا دشمن ہے۔ وہ اپنا بھلا نہیں چاہ رہا ہے۔ اس غفلت اور بے پروائی پر اللہ تعالیٰ کے یہاں ضرور باز پرس ہوگی۔

وَ اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۚ وَ سَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ ۝۴۴

اور بے شک یہ ذکر ہے تمھارے لیے بھی اور تمھاری قوم کے لیے بھی اور بہت جلد تم سے پوچھا جائے گا۔ (الزخرف:۴۴)

یہ کتاب سراسر حق ہے اس میں ذرہ برابر باطل کی آمیزش ہے اور نہ ہوسکتی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۝۴۱ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ لَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ۝۴۲

بے شک جن لوگوں نے (اس) ذکر (قرآن) سے اس کے آنے کے بعد انکار کیا (وہ اس کے انجام سے لازماً دوچار ہوں گے) بلاشبہ یہ وہ کتاب ہے جو سب پر غالب ہے۔ باطل جس کے آگے سے آسکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے۔ نازل ہوئی ہے اللہ کی طرف سے جو حکمت والا اور ستودہ صفات ہے۔ (حٰمٓ السجدۃ:۴۱،۴۲)

اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝۹

بے شک ہم ہی نے اس ذکر (قرآن) کو نازل کیا ہے اور بے شک ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ (الحجر:۹)

اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ پورا ہوا۔ آسمانی کتابوں میں آج صرف قرآن ہی کو

کتابِ محفوظ کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ اسی طرح پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے، جس طرح یہ محمد ﷺ پر نازل ہوا اور زبانِ مبارک سے سنا گیا۔ اسے ہر دور میں ہزاروں انسانوں نے حفظ کیا اور وہ ان کی زبانوں پر جاری ہوگیا۔ یہی نہیں بلکہ اس کی حیثیت ایک مقدس نوشتہ کی ہے۔ یہ روزِ اول سے ضبطِ تحریر میں لایا گیا اور دنیا کے گوشے گوشے میں اس کی اشاعت ہوئی اور مسلسل ہو رہی ہے۔ اس میں آج تک ایک حرف کی بلکہ ایک شوشہ کی تبدیلی ہوئی ہے اور نہ ہونے کا کوئی امکان ہے۔

یہ 'کتابِ مبین' ہے (یوسف:۱)، جو 'عربی مبین' میں نازل ہوئی ہے (النحل:۱۰۳)، اس کا مقصدِ نزول اور اس کا منشا اور مدعا بالکل واضح ہے۔ اس کے مضامین ہر طرح کی لفظی اور معنوی پیچیدگیوں سے پاک ہیں:

وَ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ (الزخرف:۲،۳)	قسم ہے اس کتاب کی جو واضح ہے۔ ہم نے اس کو قرآنِ عربی بنایا ہے تاکہ تم سمجھو۔

اس کتاب کے پڑھنے، سمجھنے اور اس کی ہدایات سے واقف ہونے میں کوئی دشواری نہیں ہے۔ اس نے زندگی کے نازک ترین مسائل سے بھی اس طرح بحث کی ہے کہ ایک عام آدمی اپنی فہم کے لحاظ سے انھیں بہ آسانی سمجھ سکتا ہے۔ کسی مسئلہ میں اس کا موقف جاننے میں اسے زحمت نہیں پیش آئے گی۔ اسی وجہ سے دنیا کا ہر فرد اس کا مخاطب ہے اور اسی وجہ سے وہ کہتا ہے:

وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝ (القمر:۱۷)	ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کردیا ہے۔ پس ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا۔

قرآن کا مطالبہ یہ ہے کہ اس کی باتیں خامشی اور توجہ سے سنی جائیں۔ اس سے اس کی حقانیت واضح ہوگی۔

هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ	یہ دلائل ہیں تمھارے رب کی طرف سے اور ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں اور جب قرآن پڑھا جائے

فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۲۰۴﴾ (الاعراف: ۲۰۳، ۲۰۴)

تو اسے پوری توجہ سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر (اللہ کی) رحمت ہو۔

قرآن اپنی آیات پر غور وفکر کی بار بار دعوت دیتا ہے۔ اسے اطمینان ہے کہ اصحابِ بصیرت اسے رد نہیں کریں گے، بلکہ اس سے نصیحت حاصل کریں گے۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۹﴾ (ص: ۲۹)

یہ ایک کتابِ مبارک ہے جو ہم نے (اے پیغمبرؐ) آپ پر اتاری ہے تاکہ یہ لوگ اس کی آیات پر تدبر کریں اور عقل والے اس سے نصیحت حاصل کریں۔

مخالفین کا رویہ

اللہ تعالیٰ کی اس کتاب کے ساتھ اس کے مخالفین نے حیرت انگیز رویہ اختیار کیا۔ وہ اس کی حقّانیت اور صداقت کے دلائل وشواہد خود اس کتاب میں تلاش کرنے کی جگہ معجزات کا مطالبہ کرنے لگے۔ حالاں کہ یہ کتاب اپنے منفرد زبان و بیان اور بے نظیر تعلیمات میں بذاتِ خود دنیا کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔ اس کے بعد کسی دوسرے معجزے کی کوئی حاجت ہی نہیں ہے۔ اسی وجہ سے وہ کہتا ہے:

قَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۵۰﴾ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾ (العنکبوت: ۵۰، ۵۱)

وہ کہتے ہیں کہ محمد (ﷺ) پر ان کے رب کی طرف سے کچھ نشانیاں (معجزات) کیوں نہیں نازل ہوئیں۔ ان سے کہو کہ نشانیاں اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں۔ میں تو بس صاف صاف ڈرانے والا ہوں۔ کیا ان کے لیے یہ (نشانی) کافی نہیں ہے کہ ہم نے آپ پر کتاب اتاری ہے جو ان کو پڑھ کر سنائی جارہی ہے۔ بے شک اس میں رحمت اور نصیحت ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں۔

قرآن مجید سورتوں میں منقسم ہے۔ اس کی سب سے چھوٹی سورت (سورۂ کوثر)

صرف تین آیات پر مشتمل ہے۔ اس کی سب سے بڑی سورت سورۂ بقرہ ہے۔ اس میں دوسو چھیاسی آیات ہیں۔ لیکن اس کی ہر چھوٹی بڑی سورت معجزہ ہے۔ قرآن نے مخالفین کو چیلنج کیا کہ تم ایسی کوئی ایک ہی سورت پیش کردو۔ اس کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ یہ صاف دلیل ہے اس بات کی کہ قرآن اللہ کا کلام ہے، انسان کا کلام نہیں ہے:

وَ اِنۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ رَیۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰی عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَۃٍ مِّنۡ مِّثۡلِہٖ ۪ وَادۡعُوۡا شُہَدَآءَکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۲۳﴾ (البقرۃ:۲۳)	اور اگر تم کو شک ہے اس کتاب کے متعلق جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے تو اس جیسی ایک سورت تم لے آؤ اور اللہ کے سوا جو تمھارے معبود ہیں ان کو بلالو۔ اگر تم سچے ہو (اس دعوے میں کہ یہ اللہ کی طرف سے نازل نہیں ہوئی ہے)۔

قرآنِ مجید غور وفکر کی دعوت دے رہا تھا، لیکن مخالفین کو قومی، نسلی اور قبائلی تعصبات اس سے باز رکھ رہے تھے۔ کسی بات کو دلیل سے سمجھنے کی جگہ انھیں اپنی قدیم روایات اور فرسودہ خیالات پر اصرار تھا۔ وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھے کہ یہ روایات غلط ہوسکتی ہیں۔ وہ ماضی کے اندھے پرستار تھے۔ ان کے نزدیک ان کے بزرگ علم وفضل اور دانش وبینش میں سب سے برتر اور فائق تر تھے۔ ان سے آگے کسی کی رسائی نہیں ہوسکتی۔ انھوں نے جو کچھ کہا یا کیا سب صحیح اور درست ہے۔ ان پر تنقید کا کسی کو حق نہیں ہے۔ وہ اس بات کے قائل تھے ؎

خطائے بزرگاں گرفتن خطا است

یہ ایک غیر عملی اور نامعقول رویہ تھا۔ قرآن نے کہا کہ اگر حق کی تلاش ہے تو اس رویہ کو ترک کرنا ہوگا۔

وَ اِذَا قِیۡلَ لَہُمُ اتَّبِعُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ قَالُوۡا بَلۡ نَتَّبِعُ مَاۤ اَلۡفَیۡنَا عَلَیۡہِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوۡ کَانَ اٰبَآؤُہُمۡ لَا یَعۡقِلُوۡنَ شَیۡئًا وَّ لَا	ان سے جب کہا جاتا ہے کہ اس (کتاب) کی اتباع کرو جو اللہ نے نازل کی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو اس طریقہ کی اتباع کریں گے جس پر اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا یہ

يَهْتَدُوْنَ﴿۱۷۰﴾ (البقرة:۱۷۰)

اپنے باپ دادا کی پیروی اس صورت میں بھی کریں گے جب کہ وہ نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ راہِ راست پر ہوں۔

قرآن مجید کی تعلیمات یکے بعد دیگرے دلائل کے ساتھ سامنے آرہی تھیں۔ وہ مخالفین کے باطل خیالات اور مزعومات پر مہذب اور شائستہ طریقہ سے تنقید اور دنیا و آخرت میں اس کے انجام سے آگاہ کر رہا تھا۔ اس کے مقابلے میں ان کی طرف سے جذباتیت کا مظاہرہ ہو رہا تھا اور وہ شور وشغب اور ہنگاموں کے ذریعے قرآن کی آواز کو دبانے کی کوشش کر رہے تھے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ﴿۲۶﴾ (حٰمٓ السجدة:۲۶)

وہ لوگ جنھوں نے کفر کی راہ اختیار کی، کہتے ہیں کہ اس قرآن کو نہ سنو اور جب پڑھا جائے تو بے ہودہ باتوں کا شور مچاؤ اس طرح امید ہے تم غالب آجاؤ گے۔

انھوں نے کھیل تماشوں اور کلچرل پروگراموں کا انتظام کیا تاکہ جذباتی اور تفریحی ماحول پیدا ہو اور قرآن کی سنجیدہ تعلیمات کی طرف کسی کی توجہ نہ ہو، یہ حرکتیں صاف بتا رہی تھیں کہ وہ علم وفہم اور عقل کے میدان میں شکست کھا چکے ہیں، لیکن طاقت اور اقتدار کے زعم میں وہ اسے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے اور یہ ظاہر کر رہے تھے کہ قرآن کی دعوت ہی ناقابلِ التفات ہے، اس پر توجہ دینا ان کے شایانِ شان نہیں ہے۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ۭ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ﴿۶﴾ وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِيْٓ اُذُنَيْهِ

لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو ان باتوں کو خریدتے ہیں جو اللہ سے غافل کرنے والی ہیں تاکہ بے جانے بوجھے اللہ کے راستے سے لوگوں کو بھٹکائیں اور اس کی ہنسی اڑا دیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے رسوا کن عذاب ہے، جب ان میں سے کسی کو ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو تکبر سے پیٹھ پھیر لیتا ہے

وَقۡرًا ۚ فَبَشِّرۡهُ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ ۝۷
(لقمان:۶،۷)

جیسے اس نے سنا ہی نہیں۔ تم اسے درد ناک عذاب کی خوش خبری دے دو۔

اس طرح کا نامعقول رویہ حق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اسے اختیار کرکے آدمی حق کو نہیں پاسکتا۔ چناں چہ قرآن جس سے باطل کے پردے چاک ہوجانے چاہئیں، وہ اس کے مخالفین کے لیے حجاب بن گیا۔

وَ اِذَا قَرَاۡتَ الۡقُرۡاٰنَ جَعَلۡنَا بَیۡنَکَ وَ بَیۡنَ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ حِجَابًا مَّسۡتُوۡرًا ۝۴۵ وَّ جَعَلۡنَا عَلٰی قُلُوۡبِهِمۡ اَکِنَّۃً اَنۡ یَّفۡقَهُوۡهُ وَ فِیۡۤ اٰذَانِهِمۡ وَقۡرًا ؕ وَ اِذَا ذَکَرۡتَ رَبَّکَ فِی الۡقُرۡاٰنِ وَحۡدَهٗ وَلَّوۡا عَلٰۤی اَدۡبَارِهِمۡ نُفُوۡرًا ۝۴۶
(بنی اسرائیل:۴۵،۴۶)

جب تم قرآن پڑھتے ہو تو ہم تمھارے اور ان لوگوں کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ایک چھپا ہوا حجاب ڈال دیتے ہیں اور ان کے دلوں پر پردہ کر دیتے ہیں تاکہ وہ اسے نہ سمجھ سکیں اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کردیتے ہیں اور جب تم قرآن میں اپنے واحد رب کا ذکر کرتے ہو تو نفرت سے پیٹھ پھیر کر بھاگنے لگتے ہیں۔

جو لوگ آج قرآن کے ساتھ یہ رویہ اختیار کریں گے وہ کل دستِ افسوس ملیں گے اور کہیں گے کہ ہمیں ہمارے راہ نماؤں نے تباہ کیا۔ کاش ہم ان کے پیچھے نہ چلتے اور یوں نہ تباہ ہوتے۔ اس وقت اللہ کے رسول ﷺ بھی عرض کریں گے۔

وَقَالَ الرَّسُوۡلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوۡمِی اتَّخَذُوۡا هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ مَهۡجُوۡرًا ۝۳۰
(الفرقان:۳۰)

اور رسول نے کہا کہ اے میرے رب میری قوم نے اس قرآن کو متروک کر رکھا ہے۔

اہلِ ایمان سے قرآن کے مطالبات

جو لوگ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب ہے اور اسے کتابِ ہدایت اور ذریعۂ نجات تصور کرتے ہیں، ان سے قرآن مجید

کے بعض مطالبات ہیں۔ یہ مطالبات اس پر ایمان کے عین تقاضے ہیں۔ ان سے کوئی بھی ایسا شخص جو قرآن کو اللہ کی کتاب مانتا ہے، انکار نہیں کرسکتا۔

قرآن کو مضبوطی سے پکڑے رہیں

اللہ کی کتاب کا اوّلین تقاضا یہ ہے کہ آدمی اسے مضبوطی سے پکڑے رہے اور اس سے اس کی قلبی اور عملی وابستگی قائم رہے۔ زندگی کے نازک سے نازک وقت میں اور کسی بھی مرحلہ میں اس کا دامن نہ چھوٹنے پائے اور اس کی ہدایت کا ٹھیک پابند رہے۔ حضرت یحیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا۔

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ (مریم:۱۲) — اے یحیٰ کتاب کو مضبوطی سے پکڑلو۔

رسول اللہ ﷺ سے خطاب ہے:

فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِيْٓ اُوْحِيَ اِلَيْكَ ۚ اِنَّكَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۴۳﴾ (الزخرف:۴۳) — پس تم اس وحی کو مضبوطی سے پکڑے رہو جو تم پر کی جا رہی ہے۔ بے شک تم صراطِ مستقیم پر ہو۔

یعنی جو کتاب بذریعہ وحی نازل ہو رہی ہے اسے مضبوطی سے تھامے رہیے اور یقین رکھیے کہ جب یہ روشنی آپ کے پاس ہے تو صراطِ مستقیم آپ پر واضح ہے اور آپ اس پر گام زن ہیں۔ اس میں ایک بڑی حقیقت بیان ہوئی ہے وہ یہ کہ جو شخص اس کتاب کی بتائی ہوئی راہ پر چلے اسے اطمینان ہونا چاہیے کہ وہ صحیح راہ پر چل رہا ہے اور منزلِ مقصود پر لازماً پہنچے گا۔ آدمی کا یہ یقین و اطمینان کہ وہ حق پر ہے اور راہِ راست پر چل رہا ہے اس کے اندر عزم و حوصلہ پیدا کرتا اور مشکلاتِ راہ کو اس کے لیے آسان کردیتا ہے۔ اسی کو 'تمسّک بالکتاب' کہا گیا ہے۔ اس سے یہی نہیں کہ آدمی راہِ راست پر قائم ہوگا بلکہ وہ دنیا کا رہبر اور مصلحِ عالم بن کر ابھرے گا۔ اس کے ذریعے دنیا کو صلاح و فلاح کا راستہ ملے گا۔ قرآن مجید نے مصلحین کی ایک خاص پہچان یہی 'تمسّک بالکتاب' بتائی ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ﴿۱۷۰﴾ (الاعراف:۱۷۰)

جو لوگ کتاب کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں (وہی مصلح ہیں) بے شک ہم مصلحین کا اجر ضائع نہیں کرتے۔

یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ جو لوگ اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے تھام لیں اور نماز قائم کریں، ان ہی کے ذریعے اصلاحِ عالم کا فرض انجام پا سکتا ہے۔ اللہ کے ہاں ان کی سعی و جہد مقبول ہوگی اور وہ اجرِ عظیم کے مستحق ہوں گے۔ اللہ ان کا اجر کبھی ضائع نہیں کرے گا۔ کتاب اللہ کی راہ نمائی اور اقامتِ صلٰوۃ کے بغیر اصلاحِ عالم کا فرض کبھی انجام پایا ہے اور نہ آئندہ اس کی توقع کی جاسکتی ہے۔

قرآن کی تلاوت

رسول اللہ ﷺ کو ہدایت کی گئی:

وَ اتْلُ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَ لَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۷﴾ (الکہف:۲۷)

تمھارے رب کی کتاب میں سے جو وحی تم پر کی جا رہی ہے اس کی تلاوت کرو۔ کوئی اس کی باتوں کو بدلنے والا نہیں ہے اور تم اس کے سوا کوئی پناہ گاہ نہیں پاؤ گے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

اُتْلُ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ (العنکبوت:۴۵)

کتاب میں سے جو وحی تم پر کی گئی ہے اس کی تلاوت کرو اور نماز قائم کرو۔

تلاوت کا جو حکم رسول اللہ ﷺ کو دیا گیا وہ آپ کی امت کے لیے بھی ہے۔ قرآن مجید کی تلاوت میں صرف اس کا پڑھنا ہی نہیں، اس کا سمجھنا اور اس پر غور وفکر کرنا بھی داخل ہے۔ تلاوت رسمی نہیں حقیقی ہونی چاہیے۔ تلاوت ہو تو قلب و جسم پر اس کے اثرات نمایاں ہوں۔ دل کانپنے لگے اور اعضا و جوارح پر خوف وخشیت کی کیفیت چھا جائے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ کتاب اللہ سے انسان فیض یاب ہو رہا ہے اور راہِ

ہدایت اس کو مل گئی ہے۔

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحۡسَنَ الۡحَدِيۡثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۖ تَقۡشَعِرُّ مِنۡهُ جُلُوۡدُ الَّذِيۡنَ يَخۡشَوۡنَ رَبَّهُمۡ ۚ ثُمَّ تَلِيۡنُ جُلُوۡدُهُمۡ وَقُلُوۡبُهُمۡ اِلٰى ذِكۡرِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهۡدِىۡ بِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَمَنۡ يُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنۡ هَادٍ ﴿۲۳﴾

(الزمر:۲۳)

اللہ نے بہتر بات اتاری ہے۔ یعنی ایسی کتاب جو آپس میں ملتی جلتی ہے، جو جوڑوں کی شکل میں ہے، جس سے ان لوگوں کے جسم کانپنے لگتے ہیں جن کو اپنے رب کا خوف ہے پھر ان کے جسم اور ان کے دل اللہ کے ذکر کے لیے نرم پڑ جاتے ہیں۔ یہ ہے اللہ کی ہدایت، وہ جسے چاہتا ہے اس کے ذریعے ہدایت دیتا ہے اور جسے اللہ راستے سے بھٹکادے اسے کوئی راستہ دکھانے والا نہیں ہے۔

قرآن مجید کی تلاوت سے ایک صاحبِ ایمان جن پاک جذبات اور قلبی کیفیات سے دو چار ہوتا ہے، قرآن مجید کے سننے سے بھی یہی جذبات و کیفیات اس پر طاری ہوتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات سن کر لرز اٹھتا ہے، اس کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ اللہ پر توکل اور اعتماد کے جذبات سے سرشار ہو جاتا ہے۔ اس کی اس کیفیت کا بیان ان الفاظ میں ہوا ہے:

اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِيۡنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ وَاِذَا تُلِيَتۡ عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتُهٗ زَادَتۡهُمۡ اِيۡمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمۡ يَتَوَكَّلُوۡنَ ۖ ﴿۲﴾

(الانفال:۲)

ایمان والے تو بس وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل دہلنے لگتے ہیں اور جب انھیں اس کی آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ ان کے ایمان میں اضافہ کرتی ہیں اور وہ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔

قرآن مجید کو اس کے مخالفین 'اساطیر الاولین' الانعام:۲۵ (اگلوں کی کہانیاں) کہا کرتے تھے۔ ان کے نزدیک اس کی حیثیت محض ایک کہانی یا افسانے کی تھی۔ اس کی تعلیمات کو سننے کے لیے بھی تیار نہ ہوتے تھے۔ لیکن اہل ایمان کا رویہ بالکل دوسرا تھا۔ وہ اسے کھلی آنکھوں سے دیکھتے اور گوشِ ہوش سے سنتے تھے۔ اس کی تعلیمات ان کے

لیے درسِ عبرت و نصیحت تھیں۔ قرآن سننے پر ان کی کیفیت منکرین اور معاندین کی کیفیت سے سراسر مختلف ہوتی تھی۔

وَالَّذِیۡنَ اِذَا ذُکِّرُوۡا بِاٰیٰتِ رَبِّہِمۡ لَمۡ یَخِرُّوۡا عَلَیۡہَا صُمًّا وَّ عُمۡیَانًا ﴿۷۳﴾ (الفرقان: ۷۳)

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان کو ان کے رب کی آیات کے ذریعے نصیحت کی جاتی ہے تو وہ ان پر بہرے اور اندھے بن کر نہیں گر پڑتے۔

یہود شدید قومی و نسلی تعصب میں مبتلا تھے۔ ان کا نسلی تعلق حضرت یعقوبؑ سے تھا۔ وہ حضرت ابراہیمؑ کے صاحب زادے حضرت اسحاقؑ کی اولاد تھے۔ یہود کسی ایسے شخص کو اللہ کا رسول ماننے کے لیے تیار نہ تھے جو حضرت اسحٰقؑ کی نسل سے نہ ہو۔ چناں چہ انھوں نے حضرت محمد ﷺ کو اللہ کا رسول اور قرآن مجید کو اللہ کی کتاب ماننے سے صاف انکار کر دیا اور آپ کی شدید مخالفت شروع کردی۔ اس لیے کہ آپ کا تعلق حضرت ابراہیمؑ کے بڑے صاحب زادے حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل سے تھا۔ لیکن ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو اس تعصب سے بلند ہوکر صاف ذہن سے توریت کا مطالعہ کر رہے تھے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے۔ انھوں نے اس کی تصدیق کی اور اس پر ایمان لائے۔ ان حق پرست اصحاب کا ذکر ہے:

اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ یَتۡلُوۡنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ ؕ اُولٰٓئِکَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِہٖ ؕ وَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۱۲۱﴾ (البقرۃ: ۱۲۱)

وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب (توریت دی) وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جیسے اس کی تلاوت کا حق ہے، وہی اس (قرآن) پر ایمان لاتے ہیں۔ جو اس سے انکار کرے گا تو ایسے ہی لوگ خسارہ اٹھانے والے ہیں۔

یہاں مجرد تلاوت کا نہیں، حقِ تلاوت کا ذکر ہے۔ یہود میں سے جن لوگوں نے توریت کو اس طرح پڑھا جس طرح اسے پڑھنے کا حق ہے۔ انھیں قرآن پر ایمان نصیب ہوا۔ جنھوں نے توریت کو پڑھا نہیں، یا پڑھا تو اس کا حق ادا نہیں کیا وہ ایمان کی دولت سے محروم رہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کی تلاوت کا جب

حق ادا ہوتا ہے تو ایمان کی دولت ملتی ہے، جو لوگ اس طرح تلاوتِ کتاب کا حق ادا کررہے تھے اور جو قرآن پر ایمان سے سرفراز ہوئے انھیں 'راسخین فی العلم' کہا گیا ہے۔

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ... (النساء:۱۶۲)

لیکن ان میں جو لوگ علم دین میں رسوخ رکھتے ہیں اور ایمان والے ہیں وہ اس کتاب پر بھی ایمان لاتے ہیں جو آپ پر نازل کی گئی ہے اور اس پر بھی ایمان لاتے ہیں جو آپ سے پہلے نازل ہوئی ہے۔

اللہ کی کتاب کی تلاوت سے ان پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے وہی کیفیت اس کی آیات سننے سے بھی ان پر چھا جاتی ہے۔ قرآن کی گواہی ہے کہ ''جن لوگوں کو اس سے پہلے کتاب کا علم دیا گیا ان کو جب قرآن کی آیات سنائی جاتی ہیں تو وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں ہمارا رب ہر کم زوری سے پاک ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے رب کا وعدہ پورا ہوکر رہے گا اور وہ روتے ہوئے ٹھوڑیوں کے بل گر پڑتے ہیں اور قرآن ان کے خشوع وخضوع میں اضافہ کر دیتا ہے۔ (بنی اسرائیل:۱۰۷-۱۰۹)

ایک اور جگہ ارشاد ہے: ''جب ان کو رحمٰن کی آیتیں سنائی جاتی ہیں تو وہ باچشم تر سجدہ میں گر پڑتے ہیں۔'' (مریم:۵۸)

نصاریٰ کے حق پرست علما اور راہبوں اور زاہدوں سے متعلق بھی ایک موقع پر یہی بات فرمائی گئی ہے۔

وَ اِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَ مَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ وَ نَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا

جب وہ اس کتاب کو سنتے ہیں جو رسول (ﷺ) پر اتاری گئی ہے تو تم دیکھو گے کہ حق کو جاننے کی وجہ سے ان کی آنکھوں سے آنسو ابل رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب! ہم ایمان لے آئے، تو ہمیں بھی ان لوگوں کے

رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۸۴﴾
(المائدۃ: ۸۳، ۸۴)

ساتھ لکھ لے جو تیرے دین کے حق ہونے کی گواہی دے رہے ہیں۔ ہم کیوں نہ ایمان لائیں اللہ پر اور اس حق پر جو ہمارے پاس آیا ہے، ہمیں توقع ہے کہ ہمارا رب ہمیں صالح لوگوں میں داخل فرمائے گا۔

یہ ہے اللہ تعالیٰ کو مطلوب تلاوت۔ اس طرح قرآن پڑھنے اور سننے سے دل کا زنگ دور ہوتا ہے۔ آدمی کو اس آئینہ میں اپنی تصویر نظر آتی ہے، اصلاحِ حال کی طرف توجہ ہوتی ہے، تعلق باللہ اور خشوع و خضوع پیدا ہوتا ہے، قرآن کے حقائق و معارف کھلتے ہیں، لذتِ ایمان، توفیقِ عمل، جرأت و ہمت اور استقامت نصیب ہوتی ہے۔

قرآن سے راہ نمائی

قرآن ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ قرآن ہی سے انسان وہ زندگی دریافت کرسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔ قرآن اس دنیا کے پیچ وخم میں انسان کو ٹھیک اس راہ کی نشان دہی کرتا ہے، جس پر چل کر وہ اللہ تعالیٰ کے انعام کا حق دار ہوسکتا ہے۔ جو شخص قرآن کو تھام لے وہ اندھوں کی طرح دائیں بائیں بھٹکتا نہیں پھرے گا، بلکہ دن کے اجالے میں اپنا سفرِ حیات طے کرے گا۔ قرآن حق و باطل میں تمیز کا ذریعہ ہے۔ جو شخص اس ذریعے سے محروم ہے وہ جان ہی نہیں سکتا کہ حق کیا ہے اور باطل کیا؟ قرآن ایک نور ہے جو انسان پر اللہ کی مرضیات کو روشن کرتا ہے۔ جو شخص اپنے آپ کو قرآن سے بے نیاز سمجھتا ہے وہ اللہ کی مرضی کو پا نہیں سکتا۔ اس تک اس کی رسائی ممکن نہیں ہے۔

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ
(المائدۃ: ۱۵، ۱۶)

بے شک تمھارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشنی اور کتاب مبین پہنچ گئی۔ اللہ اس کے ذریعے اس شخص کو سلامتی کی راہ دکھاتا ہے جو اس کی مرضیات کی اتباع کرنا چاہے۔

ہر انسان فطرتاً بعض چیزوں کو پسند کرتا ہے اور بعض چیزوں کو ناپسند کرتا ہے۔

اسی طرح ایک شخص کا رجحان دوسرے شخص کے رجحان سے مختلف ہوتا ہے۔ جو عادتیں اور رجحانات آپ کے مزاج کا جزو بن چکے ہیں اور جن کے خلاف آپ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے، ہوسکتا ہے کہ وہ میرے لیے قطعاً ناقابلِ قبول ہوں۔ انسان خدا ترس اور متقی اسی وقت بن سکتا ہے، جب کہ وہ اپنے رجحانات کو خدا کے حکم کے تابع کر دے۔ وہ کوئی کام اس لیے نہ کرے کہ اس کی طبیعت کا جھکاؤ اس طرف ہے، اور نہ کسی کام کو اس لیے چھوڑ دے کہ وہ اپنے اندر اس کا میلان نہیں پاتا، بلکہ ہر اس عمل کو انجام دینے کے لیے تیار ہو جائے جس کا حکم اس کے مولا اور مالک کی طرف سے اس کو ملا ہے، خواہ وہ اس کے رجحانِ طبع اور ذوق کے موافق ہو یا مخالف۔ اللہ کا حکم ہو تو وہ ان چیزوں کو بھی بلا تامل پھینک دے اور دامن جھاڑ لے، جن کو وہ اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہے اور جن کے بغیر وہ زندگی کا تصور تک نہیں کر پا رہا ہے۔ جو شخص اس طرح اپنے نظریات کو، اپنے رجحانات اور اپنی عادتوں کو اللہ کے حکم کے تابع نہ کر سکے وہ متقی اور خدا ترس نہیں ہے۔ ایسا شخص صرف اپنی خواہشات کی پیروی کر رہا ہے، خواہ اپنی دانست میں وہ اللہ کو خوش کرنے ہی کی کوشش کیوں نہ کر رہا ہو۔ جب اس کو قیامت کے روز اللہ کے حضور لایا جائے گا تو وہ دیکھ لے گا کہ اللہ کی اطاعت کے خیال میں وہ اپنے جذبات کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔

اللہ تعالیٰ کی کتاب وہ میزان ہے، جس سے آدمی معلوم کر سکتا ہے کہ وہ واقعتاً اس کی مرضی پر چل رہا ہے یا اپنے نفس کی خواہش پوری کر رہا ہے۔ اللہ کی کتاب کو چھوڑ کر اس کی خوشی اور ناخوشی کو تلاش کرنے والا انسان جنگل کا مسافر ہے۔ وہ زندگی بھر بھٹکتا پھرے گا لیکن کبھی منزل سے ہم کنار نہ ہوگا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا﴿۱۷۴﴾	اے لوگو! بے شک تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے دلیل آ چکی ہے اور ہم نے تمھاری طرف صاف روشنی نازل کی ہے۔
فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ اعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ ۙ وَّ	پس جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور اسے مضبوطی سے پکڑے رہے تو اللہ انھیں اپنی

يَّهۡدِيۡهِمۡ اِلَيۡهِ صِرَاطًا مُّسۡتَقِيۡمًا ۝۱۷۵ (النساء: ۱۷۴، ۱۷۵)

رحمت اور فضل و احسان میں داخل کرے گا اور انھیں اپنی طرف آنے کے لیے صراطِ مستقیم کی ہدایت کرے گا۔

جس شخص کے پاس قرآن مجید ہے اس کے پاس وہ کلید ہے، جس سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے دروازے کھلتے ہیں۔ اس کے ذریعے وہ معلوم کرسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں چاہتا، زندگی کے کون سے اصول و آداب اس کو پسند ہیں اور کن اصول و آداب کو وہ ناپسند کرتا ہے، کن کاموں سے وہ خوش ہوتا ہے اور کون سے کام اس کی ناخوشی کا موجب ہیں؟ خوش نصیب ہے وہ شخص جس کو اللہ کی اس کتاب کی تلاوت نصیب ہو، جو اس پر شب و روز غور کرے، جس کا سینہ اس کی آیات سے بھرا ہوا ہو اور جس کے دل و دماغ پر اس کے احکام و فرامین کی حکومت ہو۔ ایسے شخص پر اس دنیا کے شاہانِ تخت و تاج کو بھی رشک کرنا چاہیے۔ کیوں کہ اِن کو جو کچھ ملا ہے وہ بہت جلد فنا ہونے والا ہے اور اس کی دولت لازوال ہے۔ وہ اپنے سارے سروسامان کے باوجود کل اللہ کے غضب سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکیں گے اور اس پر اللہ کے انعامات کی بارش ہو رہی ہوگی۔

قرآن کی اتباع

قرآن مجید کی راہ نمائی قبول کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ ہر معاملے میں اس کے احکام کی اتباع کی جائے۔ صرف اس کی سیادت و قیادت قبول کی جائے، کسی دوسرے کو راہ بری و راہ نمائی کا مقام نہ دیا جائے۔ اس کا مطالبہ ہی یہ ہے کہ پوری زندگی اس کی ہدایات کی پابند اور ہر دوسری ہدایت سے آزاد ہو:

اِتَّبِعُوۡا مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكُمۡ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَ لَا تَتَّبِعُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اَوۡلِيَآءَ ؕ قَلِيۡلًا مَّا تَذَكَّرُوۡنَ ۝۳ (الاعراف: ۳)

اتباع کرو اس کتاب کی جو تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے آئی ہے اور اسے چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔ لیکن تم بہت کم نصیحت حاصل کرتے ہو۔

دنیا میں بہت سے افکار اور فلسفے پائے جاتے ہیں۔ یہ سب طاغوتی افکار اور

فلسفے ہیں۔ قرآن ان کے مقابلے میں الٰہی فلسفۂ حیات پیش کرتا ہے۔ یہ سب سے برتر اور واحد مبنی برحق فلسفۂ حیات ہے۔ اہل ایمان کی زندگی کی تعمیر اسی پر ہونی چاہیے۔ یہی ہوش مندی اور دانائی کی علامت ہے۔

وَ الَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَاَنَابُوْٓا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى ۚ فَبَشِّرْ عِبَادِ ﴿۱۷﴾ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ۭ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۱۸﴾ (الزمر:۱۷،۱۸)

وہ لوگ جنھوں نے طاغوت کی عبادت سے اجتناب کیا اور اللہ کی طرف رجوع ہوئے ان کے لیے خوش خبری ہے۔ تو تم خوش خبری دے دو میرے ان بندوں کو جو بات سنتے ہیں اور اس میں جو سب سے بہتر (یعنی قرآن) ہے، اس کی اتباع کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت سے نوازا ہے اور یہی عقل والے ہیں۔

قرآن پر عمل

قرآن مجید پر ایمان کی علامت یہ ہے کہ انسان کی پوری زندگی اس کے سانچے میں ڈھل جائے۔ جو شخص زبان سے تو قرآن کو راہ نما مانے اور میدان عمل میں اس کی راہ نمائی نہ قبول کرے وہ قرآن کے ساتھ مذاق کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

اَهْله الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ بِهٖ فِي الدُّنْيَا[1] قرآن والے وہ ہیں جو اس دنیا میں اس پر عمل کرتے ہیں۔

دنیا نے اللہ والوں کی بہت سی علامتیں مقرر کر رکھی ہیں، حالاں کہ ان کی علامت صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ قرآن کا جلوہ ان میں دکھائی دیتا ہے۔ قرآن سے بے نیاز ہوکر کوئی شخص آسمان پر بھی پہنچ جائے تو اللہ کو اور اس کی رحمت وعنایت کو پا نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ اس شخص کو ملتا ہے اور اس کے لطف وکرم کا وہ مستحق ہوتا ہے جو اس کی کتاب کے پیچھے چلے اور جو اسے دیکھنے کے بعد ہر طرف سے نظر پھیر لے۔ اہل اللہ کی

---

[1] صحیح مسلم، کتاب صلوٰۃ المسافرین، باب فضل قرأۃ القرآن۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ماجاء فی سورۃ آل عمران

پہچان نہ تو کوئی خاص لباس ہے اور نہ کوئی مخصوص غذا، بلکہ ان کی پہچان یہ ہے کہ وہ اللہ کی کتاب کو اپنے تمام معاملات میں حکم بناتے ہیں۔ ان کا ہر عمل کتاب اللہ کی روشنی میں انجام پاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو قرآن کے نقشے میں اس طرح فٹ کر لیتے ہیں کہ ان کی زندگی پر ہر طرف سے قرآن کی حکومت قائم ہو جاتی ہے۔ جس شخص پر کتاب اللہ کی حکومت قائم نہیں ہے وہ ابھی خدا سے دور ہے اور خدا اس سے دور ہے۔

قرآن کی طرف دعوت

قرآن ایک دعوت ہے۔ کوئی دعوت انسان کے اندر چپکے سے نہیں داخل ہوتی، بلکہ انقلاب بن کر آتی ہے اور اس کے فکر و عمل میں ہلچل پیدا کر دیتی ہے۔ انسان جب کسی دعوت کو قبول کرتا ہے تو اس کی پوری زندگی شکست و ریخت اور توڑ پھوڑ کے عمل سے دوچار ہوتی ہے۔ اس کو اپنے پرانے نظریات کے قلعوں کو منہدم کرنا پڑتا اور ان کی جگہ نئے نظریات کی تعمیر کرنی ہوتی ہے۔ وہ اپنی بے شمار محبوب چیزوں سے دست کش ہوتا اور بہت سی نئی چیزوں کو اپنی زندگی میں شامل کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ فطری طور پر اس کی خواہش ہوتی ہے کہ جن چیزوں سے وہ محروم ہو رہا ہے، سب اس سے محروم ہو جائیں اور جو دولت اسے ملی ہے ساری دنیا اس سے مالا مال ہو جائے، جن افکار و نظریات کو وہ غلط سمجھتا ہے، ان کو مٹا دے اور جن افکار و نظریات کو حق سمجھ کر اس نے قبول کیا ہے، زمین کے ایک ایک چپہ پر ان کی حکومت قائم ہو جائے۔

اس دنیا میں کامیاب ترین انسان وہ ہے جو قرآن کی اتباع کرے اور دوسروں کو اس کی اتباع کی دعوت دے، کیوں کہ قرآن کی اتباع اللہ تعالیٰ کی اتباع اور قرآن کی طرف دعوت اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت ہے۔ اس دنیا میں یہی ایک کامیاب طریقۂ زندگی ہے اور یہی وہ سب سے بہتر دعوت ہے جو کسی انسان کے کان میں پڑ سکتی ہے۔

قرآن اس دنیا میں عزت و سربلندی کا ذریعہ ہے۔ جو شخص قرآن پر عمل کرے اور دوسروں کو اس پر عمل کی دعوت دے وہ خود بھی کام یابی و کام رانی کی راہ پر چلتا ہے اور

دوسروں کو بھی فوز و فلاح کی دعوت دیتا ہے۔ اس کو کبھی اس بات کا افسوس نہیں ہوگا کہ اس نے اپنی قوت اور صلاحیت کا کوئی حصہ ضائع کیا۔ البتہ قرآن کی بتائی ہوئی راہ سے ہٹ کر جس راہ میں بھی انسان کی قوتیں صرف ہوں گی اس کا نتیجہ سوائے افسوس اور ندامت کے کچھ نہیں نکلے گا۔

پیغمبروں کی تاریخ گواہ ہے کہ اللہ کا کلام اس زمین پر اس کی قوت بن کر آتا ہے۔ جو قوم آگے بڑھ کر اس کو قبول کرتی ہے وہ اگر کم زور ہے تو اس کی کم زوری طاقت میں تبدیل ہوجاتی ہے، وہ پستی میں پڑی ہو تو اس کو بلندی نصیب ہوتی ہے۔ اس پر جن افراد اور قوموں کو بالادستی حاصل ہے، دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس کے قدموں کے نیچے آجاتے ہیں۔ حکومت اور اقتدار اس کے قبضے میں چلا آتا ہے اور قوموں اور جماعتوں کے درمیان فیصلہ کا حق اس کو حاصل ہو جاتا ہے۔

وَنُرِيدُ أَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَ نَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَّ نَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ (القصص:۵)

ہم ان لوگوں پر احسان کرنا چاہتے ہیں جو آج زمین میں کم زور پڑے ہوئے ہیں۔ ہم ان کو امام اور اللہ کی زمین کا وارث بنائیں گے۔

رسول اکرم ﷺ اللہ کی اس کتاب کے بارے میں فرماتے ہیں:

إِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ أَقْوَامًا وَ يَضَعُ بِهٖ اٰخِرِيْنَ[۱]

اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے بعض قوموں کو اوپر اٹھائے گا اور بعض کو پستی میں پھینک دے گا۔

قرآن مجید یہ فیصلہ کرنے آیا ہے کہ یہاں عزت و سربلندی کس کے لیے ہے اور ذلت و رسوائی کس کے حصے میں آنے والی ہے؟ جو قوم اس کتاب کو اپنائے گی دنیا کی قوموں میں اس کا وزن بڑھ جائے گا اور کوئی طاقت اس کو نیچا نہیں دکھا سکے گی، جو بھی اس سے ٹکرائے گا پاش پاش ہوجائے گا۔ قرآن اللہ کی حکومت کا منشور ہے۔ وہ جس کے ہاتھ میں ہوتا ہے اللہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے کہا گیا:

---

[۱] صحیح مسلم، کتاب صلوٰۃ المسافرین، باب فضل من یقوم بالقرآن و یعلمه

وَ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ (الانفال:۱۷)	(اے محمدؐ) جس وقت تم (دشمن پر) تیر چلا رہے تھے تو تم نہیں چلا رہے تھے بلکہ اللہ چلا رہا تھا۔

ایک دوسرے پر موقع پر فرمایا:

فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَ لٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۳۳﴾ (الانعام:۳۳)	(جو لوگ تمھاری تکذیب کرتے ہیں) وہ حقیقت میں تمھاری تکذیب نہیں کرتے بلکہ یہ ظالم اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔

ظاہر ہے جس شخص کو اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل ہو، کسی کا اس پر غالب آنا ممکن نہیں ہے، کیوں کہ اس سے جنگ اللہ سے جنگ کے ہم معنی ہے اور جو اللہ سے پنجہ آزمائی کی جرأت کرے اس کا پنجہ سلامت نہیں رہ سکتا۔

نماز اور دعوتِ دین

اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن مجید کھولیے اور نماز کا ذکر دیکھیے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس کے دین کا سب سے پہلا حکم اور سب سے بڑا فرض نماز ہے۔ دین جن بنیادوں پر قائم ہے ان میں نماز سب سے اہم بنیاد ہے۔ نماز اللہ کو یاد کرنے کا وہ ذریعہ ہے جس سے بہتر اور اعلیٰ و اشرف ذریعہ کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ نماز کی پابندی ہو تو بندہ اللہ تعالیٰ سے غافل نہیں ہوتا۔ نماز سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع نصیب ہوتا ہے، توبہ کی توفیق ملتی ہے اور گناہ معاف ہوتے ہیں۔ نماز سے تزکیہ ہوتا ہے، سیرت و اخلاق میں نکھار پیدا ہوتا ہے، زندگی کے تمام معاملات سنور جاتے ہیں، صراطِ مستقیم واضح ہوتی اور اس پر چلنا آسان ہوتا ہے۔

نماز خدا ترس اور متقی انسان کی سب سے بڑی پہچان ہے۔ نماز اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ پر پختہ یقین رکھتا ہے، وہ اس کی عبادت و اطاعت کے لیے ہر آن تیار ہے اور بغیر کسی پس و پیش کے اس کے ہر حکم کی تعمیل کرسکتا ہے۔

نماز اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی سیرت میں نمایاں اور ان کی تعلیمات میں ہر دوسری تعلیم پر حاوی رہی، وہ ان کی زندگیوں میں رچی بسی اور ان کے اعمال پر چھائی ہوئی تھی، انھوں نے اپنی امتوں کو اس کی بار بار سخت تاکید کی، اس کی پابندی کا عہد لیا، نماز کے ترک کرنے یا اس میں غفلت برتنے سے منع کیا اور اس کے برے نتائج سے آگاہ کیا۔

اللہ کے رسولوں کی تعلیم اور ان کی ہدایات سے جہاں انحراف اور بغاوت ہوگی وہاں ترکِ نماز بھی پائی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کے منکروں اور باغیوں کے بارے میں قرآن صاف کہتا ہے کہ وہ اللہ واحد کے سامنے جھکنے اور سجدہ کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے۔ ان کی زندگی نماز سے خالی اور بے نور ہوتی ہے، اس وجہ سے ان کے فکر و عمل کا رخ ہی غلط ہوجاتا ہے اور وہ دنیا میں ہر طرف بھٹکتے پھرتے ہیں۔ جب آخرت آئے گی تو ناکامی اور نامرادی ان کی آنکھوں کے سامنے ہوگی۔ وہ وہاں کی ناکامی سے کسی طرح بچ نہیں سکیں گے۔

نماز دن میں پانچ بار اوقات کے تعین کے ساتھ فرض کی گئی ہے۔ ان اوقات کی پابندی ضروری ہے۔ فرض نمازوں کو مسجد میں ادا کرنے کا حکم ہے۔ اس کے لیے مساجد کی تعمیر اور ان کی آبادکاری کی ہدایت ہے اور اسے ایمان کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ فرض نماز مسجد میں ادا کرنا واجب ہے۔ اس کی بڑی فضیلت بیان ہوئی ہے، جو نماز گھر پر پڑھی جائے، حدیث میں آتا ہے کہ اس کے مقابلے میں اس نماز کا ثواب پچیس گنا اور ستائیس گنا زیادہ ہے جو مسجد میں ادا کی جاتی ہے۔

فرض نمازوں سے قبل اور بعد میں سنتیں ہیں۔ ان میں سننِ مؤکدہ کی بڑی اہمیت ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے ان کی پابندی ثابت ہے۔ انھیں قصداً چھوڑا نہیں جاسکتا۔ ان کے علاوہ نوافل کی بھی ترغیب دی گئی ہے۔ ایک ایک سجدہ سے آدمی کے گناہ معاف اور درجات بلند ہوتے ہیں۔ نمازِ تہجد اللہ سے قرب کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ پر نماز تہجد لازم قرار دی گئی تھی۔ اللہ کے نیک بندوں کی ایک خاص پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ وہ شب زندہ دار ہوتے ہیں اور اس وقت اللہ کے دربار میں دست بستہ کھڑے رہتے ہیں جب کہ دنیا غفلت میں مدہوش میٹھی نیند کے مزے لے رہی ہوتی ہے۔

نماز کے بارے میں حکم ہے کہ اول وقت میں ادا کی جائے، اس میں ٹال مٹول اور تاخیر نہ کی جائے۔ نماز سکون اور اطمینان کے ساتھ ہونی چاہیے، نماز جلدی جلدی اس

طرح نہ پڑھی جائے جیسے سر سے کوئی بوجھ اتارا جا رہا ہو یا دانوں پر مرغ ٹھونگ مار رہا ہو۔ نماز بے دلی اور بے توجہی کے ساتھ نہیں بلکہ خشوع و خضوع کے ساتھ پڑھی جائے۔ اس میں انابت اور اللہ کی طرف رجوع کی کیفیت پائی جانی چاہیے۔[1]

نماز کی دین میں اتنی زیادہ اہمیت ہے اور اللہ تعالیٰ سے تعلق استوار کرنے اور اسے مضبوط بنانے کا وہ اتنا بڑا ذریعہ ہے کہ بندۂ مومن کبھی اس سے غافل نہیں ہوسکتا۔ وہ اس کی زندگی کا ایک لازمی جزء ہوگی اور اس کی تمام مصروفیات میں ابھری ہوئی اور نمایاں رہے گی۔ جو لوگ دعوت دین کا فرض انجام دے رہے ہیں انھیں سب سے زیادہ نماز کا پابند ہونا چاہیے۔ وہ اس سے کسی حال میں غفلت نہیں برت سکتے۔ دین میں جو عمل سب سے مقدم ہے اسے ہر حال میں مقدم ہی رہنا چاہیے۔ اسے موخر کرکے یا اسے چھوڑ کر دعوتِ دین کا حق ادا کرنا ممکن نہیں ہے۔

دعوت اور نماز کا تعلق

دعوت کے ساتھ نماز کا اس قدر گہرا ربط ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ دعوت کے شروع میں بھی نماز کا حکم ہے اور اس کے آخر میں بھی نماز اور تسبیح کی ہدایت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو کارِ دعوت پر مامور کیا گیا تو ساتھ ہی تہجد کا حکم دیا گیا۔ فرمایا گیا کہ دن میں تو تمھیں بے حد مصروفیت ہے اس لیے رات میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے رہو۔ رات کے بیشتر اوقات میں، آدھی رات یا اس سے کسی قدر کم یا زیادہ حصہ میں نماز پڑھو۔ ارشاد ہے:

يَاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ﴿۱﴾ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ﴿۲﴾ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ﴿۳﴾ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ

اے چادر اوڑھنے والے! کھڑے ہو رات کو مگر تھوڑا سا (آرام بھی کرلو) رات کا نصف یا

---

[1] ان تمام پہلوؤں پر نماز سے متعلق راقم کی زیرِ ترتیب کتاب میں ان شاء اللہ تفصیل سے دلائل کے ساتھ گفتگو ہوگی۔

وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝۴ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۝۵ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ اَقْوَمُ قِيْلًا ۝۶ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ۝۷ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَ تَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۝۸ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَ كِيْلًا ۝۹

(المزمل:۱-۹)

اس سے تھوڑا سا کم کر دو یا اس سے کچھ زیادہ کردو۔ قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر اور صاف پڑھو۔ ہم تم پر ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں۔ بے شک رات کا اٹھنا نفس کو سخت روندتا ہے اور اس کی وجہ سے بات اچھی طرح نکلتی ہے۔ بے شک تمھارے لیے دن میں بڑی مصروفیت ہے۔ اپنے رب کے نام کا ذکر کرتے رہو اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو رہو۔ وہ مشرق و مغرب کا رب ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اسی کو اپنا کارساز بناؤ۔

جو شخص اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے ہر وقت مصروف ہو اور جسے دن بھر کی دعوتی جدوجہد نے نڈھال کر دیا ہو، اسے بہ ظاہر شب میں آرام کا مشورہ دینا چاہیے، لیکن یہاں لمبی نماز کا حکم دیا گیا ہے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دن میں دعوت الیٰ اللہ کی راہ میں جو زبردست تگ و دو کرتا ہے اس کے لیے طاقت رات کی نماز ہی سے حاصل ہوگی۔ پھر جب تیئس برس کی کوشش کے بعد یہ دعوت کامیاب ہوئی، قریش کی طاقت ٹوٹ گئی، مکہ فتح ہوا اور اللہ کا گھر -کعبۃ اللہ- اللہ کے نیک بندوں کی تولیت میں آ گیا تو اس وقت بھی اس کے سامنے سر جھکانے اور اس کی تسبیح وتحمید کا حکم ہوا۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝۱ وَ رَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝۲ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝۳

(النصر:۱-۳)

جب اللہ کی مدد اور فتح آ جائے اور تم دیکھ لو کہ لوگ فوج درفوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو اور اس سے مغفرت کی دعا مانگو بے شک وہ دعا قبول کرنے والا ہے۔

اب آیئے کسی قدر تفصیل سے دیکھیں کہ قرآن مجید نے دعوتِ دین اور نماز کو

کس طرح ایک دوسرے سے جوڑ دیا ہے؟ قرآن میں کہیں دعوت کا حکم ہے تو کہیں اس کے لیے نماز کے اہتمام کی تاکید کی گئی ہے۔ یہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ کارِ دعوت کے لیے جس قوت و توانائی اور صلاحیت کی ضرورت ہے وہ نماز ہی سے پیدا ہوتی ہے۔

تذکیر اور نماز

دعوتِ دین کو قرآن نے 'تذکیر' کہا ہے۔ یعنی انسانوں کے اندر اللہ تعالیٰ کی یاد پیدا کرنا۔ اللہ کی یاد پورے دین کی جان ہے۔ دین کا مقصد ہی یہ ہے کہ انسان اللہ کو نہ بھولے اور ہر وقت اسے یاد رکھے، جو شخص اللہ سے غافل ہے اس کے دل کی دنیا ویران ہے۔ وہ ایسا کھنڈر ہے جس میں ہدایت کا چراغ روشن نہیں ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ اللہ کو ہر دم یاد رکھے، کیوں کہ وہ اس کا خالق، مالک اور معبود ہے۔ لیکن انسان کبھی اپنی غفلت اور نادانی کی وجہ سے، کبھی خواہشات کے غلبے کی وجہ سے اور کبھی غلط تعلیم و تربیت کی وجہ سے اللہ کو بھول جاتا ہے۔ دعوت دین یہ ہے کہ انسان کو اس غفلت سے جگایا جائے، اس کی جہالت دور کی جائے اور اسے اللہ سے قریب کیا جائے۔ رسول اکرمؐ کو حکم ہوا:

فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ۝۹ سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ۝۱۰ | آپ تذکیر کیجیے اگر تذکیر فائدہ دے، جس شخص کے دل میں اللہ کا خوف ہوگا وہ اس سے فائدہ اٹھائے گا۔ (الاعلیٰ: ۹،۱۰)

دوسروں کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کرنے اور ان کے دلوں میں اس کی یاد پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ خود اس کام کا کرنے والا اللہ تعالیٰ کو بھولا ہوا نہ ہو۔ اللہ کی یاد اگر خود اس کے دل میں اتری ہوئی نہ ہو تو کسی دوسرے کے دل میں وہ اس کی یاد کیا پیدا کرے گا؟ جو شخص اللہ کو یاد رکھنا چاہے اس کے لیے ضروری ہے کہ نماز نہ چھوڑے۔ کیوں کہ نماز اللہ کی یاد کا بہترین ذریعہ بلکہ سراپا اس کی یاد ہے۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے۔

وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۝۱۴ (طٰہٰ: ۱۴) نماز قائم کرو میری یاد کے لیے۔

نماز اللہ تعالیٰ کے ذکر کا دوسرا نام ہے اور قرآن کے الفاظ میں 'اللہ کا ذکر بہت بڑی چیز ہے۔' (العنکبوت:۴۵) حقیقت یہ ہے کہ مردہ دلوں کو زندگی اللہ کی یاد سے ملتی ہے اور اللہ کی یاد نماز سے حاصل ہوتی ہے۔ نماز انسان کو اللہ کی طرف متوجہ کرتی اور اسے اس کی یاد سے غافل ہونے نہیں دیتی۔ ظاہر ہے جو شخص اللہ کی یاد سے غافل نہ ہو یہ اسی کا کام ہے کہ دوسروں کو اس کے ذکر کی دعوت دے اور ان میں اس کی یاد کا جذبہ پیدا کرے۔

شہادت علی الناس اور نماز

دعوت دین کو قرآن نے 'شہادت علی الناس' سے بھی تعبیر کیا ہے۔ یعنی انسانوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کے دین کو پیش کرنا اور اس کے حق ہونے کی گواہی دینا۔ یہ فرض وہی شخص انجام دے سکتا ہے، جس کی زندگی دین کے سانچے میں ڈھل چکی ہو۔ جو شخص اپنے عمل سے دین کی گواہی نہ دے سکے، ناممکن ہے کہ وہ 'شہادت علی الناس' کا فرض پورا کردے۔ نماز سے انسان کی زندگی دین کا نمونہ بن جاتی ہے اور انسان اس قابل ہوتا ہے کہ جس دین کو وہ دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہے اپنے عمل سے بھی اس کی شہادت دے۔ یہ حقیقت سورۂ حج کی آخری آیت کے مطالعہ سے سامنے آتی ہے، جس میں شہادت علی الناس کے حکم کے فوراً بعد نماز کی ہدایت کی گئی ہے۔ چناں چہ ارشاد ہے:

لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿۷۸﴾ (الحج:۷۸)	تاکہ رسول گواہ ہو تم پر اور تم گواہ ہو لوگوں پر، پس تم نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ کو مضبوط پکڑو۔ وہ تمھارا سرپرست ہے۔ پس کیا ہی اچھا سرپرست ہے وہ اور کیا ہی اچھا مددگار۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور نماز

دعوتِ دین کے لیے قرآن نے ایک اصطلاح 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کی استعمال کی ہے۔ اس کا مطلب ہے دنیا کو ان بھلائیوں کا حکم دینا جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور ان برائیوں سے روکنا جن سے اس نے منع کیا ہے۔ اس امت کو خیرِ امت کہا گیا ہے کیوں کہ وہ ایک طرف اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتی اور اس کی اطاعت کرتی ہے اور دوسری طرف دنیا کو معروف کا حکم دیتی اور منکر سے منع کرتی ہے۔

'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' اونچی سیرت اور مضبوط کردار کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان خود بھی معروف پر عمل کرے اور منکر سے بچے۔ جو شخص کردار کا کچا ہے اور جس کی سیرت میں کھوٹ ہے اس کے لیے امر بالمعروف و نہی عن المنکر جیسا دشوار عمل انجام دینا آسان نہیں ہے۔ نماز انسان میں معروف پر عمل کرنے اور منکر سے باز رہنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ ؕ (العنکبوت: ۴۵)	نماز قائم کرو۔ یقیناً نماز فحش اور منکر سے روکتی ہے۔

قرآن مجید نے اہلِ کتاب کے عوام، ان کے علماء اور راہبوں پر سخت تنقید کی ہے۔ ان کی دنیا داری، آخرت فراموشی اور اخلاقی بگاڑ کی شدید الفاظ میں مذمت کی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ان کے نیک اور صالح افراد کی ستائش بھی کی۔ فرمایا کہ "سب ایک جیسے نہیں ہیں، ان میں ایک گروہ اللہ کے دین پر قائم ہے، یہ لوگ رات کے اوقات میں اللہ کی آیات کی تلاوت کرتے اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، معروف کا حکم دیتے اور منکر سے روکتے ہیں، نیکی کے کاموں میں سبقت کرتے ہیں۔" (آل عمران: ۱۱۳، ۱۱۴)

اہلِ کتاب کے نیک اور صالح بندوں کی آٹھ صفات یہاں بیان ہوئی ہیں۔ یہ صفات ایک دوسرے کے لازمی تقاضے کے طور پر ابھرتی ہیں۔ جہاں ایک صفت ہوگی

وہاں دوسری بھی پائی جائے گی۔ یہ ایک دوسرے کو تقویت بھی پہنچاتی ہیں۔ 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کا جذبہ اور عزم و حوصلہ آدمی میں اسی وقت پایا جائے گا جب کہ دوسری صفات بھی اس میں موجود ہوں۔ ان میں ایک نمایاں صفت یہ ہے کہ آدمی اللہ کی آیات کی تلاوت کرے، شب زندہ دار ہو، اور اس کے دربار میں سجدہ ریز ہو جائے۔ اس سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے نماز کی اہمیت کو سمجھا جاسکتا ہے۔

نماز اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا حکم اور سب سے بڑی نیکی ہے۔ جو شخص نماز جیسی عبادت کو چھوڑ دے اس کے لیے دوسری نیکیوں کا چھوڑنا بہت آسان ہے۔ قرآن نے ایک جگہ بعض جلیل القدر پیغمبروں کے جانشینوں کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ

پھر ان کے بعد ایسے ناخلف پیدا ہوئے جنھوں نے نماز کو ضائع کیا اور خواہشاتِ نفس کے پیچھے پڑ گئے۔ (مریم:۵۹)

اس سے معلوم ہوا کہ انسان جب نماز کو چھوڑتا ہے تو خواہشات کا غلام بن جاتا ہے۔ ظاہر ہے اس کے بعد وہ بدی کا ایجنٹ تو ہوسکتا ہے، اللہ کے دین کا خادم نہیں بن سکتا۔

اصلاحِ عالم کی سعی اور نماز

دعوتِ دین کو سعیِ اصلاح بھی کہا گیا ہے۔ اس لیے کہ یہ اللہ کی زمین کو فساد سے پاک کرنے کی کوشش ہے۔ قرآن کے نزدیک جو لوگ اللہ کے دین کو نہیں مانتے اور اس کے بتائے ہوئے حدود و قیود کے پابند نہیں ہیں، ان کے پیشِ نظر دنیا کی اصلاح نہیں ہے، وہ فساد فی الارض کا ارتکاب کر رہے ہیں اور اس قابل نہیں ہیں کہ دنیا کی امامت و قیادت کریں۔ وہ دنیا کو اللہ کی نافرمانی کی راہ دکھا رہے ہیں اور اسے تباہی اور بربادی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ ان سے دور رہنے ہی میں نجات ہے۔ قومِ ثمود سے

حضرت صالحؑ فرماتے ہیں:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۵۰﴾ وَ لَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۱۵۱﴾ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَ لَا يُصْلِحُوْنَ ﴿۱۵۲﴾	پس اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو اور حد سے بڑھے ہوئے لوگوں کے حکم پر نہ چلو جو کہ زمین میں فساد مچاتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔ (الشعراء: ۱۵۰-۱۵۲)

حضرت شعیبؑ اپنی کوششوں کے بارے میں کہتے ہیں:

اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَ مَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴿۸۸﴾	میں تو بس اصلاح چاہتا ہوں جہاں تک مجھ سے ہو سکے۔ مجھے اس کی توفیق اللہ ہی سے ہوگی۔ اسی پر میرا بھروسہ ہے اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔ (ہود: ۸۸)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے رسول اصلاحِ عالم کے لیے آتے ہیں۔ اس کارِ عظیم کے لیے دو خوبیوں کا پایا جانا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب سے راہنمائی حاصل کی جائے اور دوسرے یہ کہ نماز کے ذریعے اللہ سے تعلق کو مضبوط کیا جائے۔ ارشاد ہے:

وَ الَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ﴿۱۷۰﴾	وہ لوگ جو اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں تو ہم (ایسے) مصلحین کا اجر ضائع نہیں کریں گے۔ (الاعراف: ۱۷۰)

یہ اس حقیقت کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک قوموں کے مصلحین وہ ہیں جو اس کی کتاب مضبوطی سے تھامے ہوئے ہوں اور جو نماز قائم کریں۔ ان ہی کے ہاتھوں قوموں کی اصلاح کا فرض انجام پائے گا۔ ان کی کوششیں رائیگاں نہیں جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ انھیں بھرپور اجر سے نوازے گا۔

اقامتِ دین اور نماز

دعوتِ دین کا کام حقیقت میں اقامتِ دین کا کام ہے۔ یہ کام اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ انسان پہلے اپنے آپ پر دین قائم کرے۔ جس شخص میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ اپنی ذات پر دین قائم کرے اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی زمین پر اس کے دین کو قائم کرنا ممکن نہیں ہے۔ نماز انسان کو زندگی کے ہر معاملے میں دین کی اتباع کے قابل بناتی ہے۔ اس سے یہ قوت اور صلاحیت پیدا ہوتی ہے کہ وہ دین پر پوری طرح عمل کرسکے۔ چناں چہ حدیث میں ہے:

اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّیْنِ مَنْ اَقَامَھَا فَقَدْ اَقَامَ الدِّیْنَ وَ مَنْ ھَدَمَھَا فَقَدْ ھَدَمَ الدِّیْنَ[1]

نماز دین کا ستون ہے، جس نے نماز قائم کی اس نے دین کو قائم کیا اور جس نے نماز کو ڈھا دیا اس نے دین کو ڈھا دیا۔

حضرت عمرؓ نے اپنے گورنروں کو اوقاتِ نماز کے سلسلے میں بعض ہدایات دی تھیں۔ اس کے ابتدائی الفاظ ہیں:

---

[1] یہ حدیث راقم کو ان الفاظ کے ساتھ یاد ہے لیکن اس کا ماخذ ذہن میں نہیں ہے۔ امام غزالیؒ نے احیاء علوم الدین میں اسے ان الفاظ میں نقل کیا ہے: الصلوۃ عماد الدین فمن ترکھا فقد ھدم الدین (نماز دین کا ستون ہے جس نے اسے ترک کر دیا اس نے دین کو ڈھادیا) یہ الفاظ مختصر ہیں۔ علامہ عراقی اس پر لکھتے ہیں: رواہ البیھقی فی الشعب بسند ضعفه من حدیث عمر، قال الحاکم عکرمة لم یسمع من عمر و رواہ ابن عمر لم یقف علیه ابن الصلاح فقال فی مشکل الوسیط انه غیر معروف (احیاء علوم الدین مع المغنی عن الاسفار: ۱/۱۷۵، دار الکتب العلمیہ بیروت) مطلب یہ ہے کہ اس حدیث کی روایت بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت عمرؓ سے کی ہے اور اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ حاکم کہتے ہیں عکرمہ نے اس کی روایت حضرت عمرؓ سے کی ہے۔ عکرمہ کو حضرت عمرؓ سے حدیث کا سماع حاصل نہیں ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے بھی یہ روایت آئی ہے۔ ابن صلاح نے اس سے اپنی عدمِ واقفیت کا اظہار کیا ہے۔ 'مشکل الوسیط' میں اسے غیر معروف قرار دیا ہے۔

اِنَّ اَهَمَّ اُمُوْرِكُمْ عِنْدِيْ الصَّلٰوةُ مَنْ حَفِظَهَا وَ حَافَظَ عَلَيْهَا حَفِظَ دِيْنَهٗ وَ مَنْ ضَيَّعَهَا فَهُوَ لِمَا سِوَاهَا اَضْيَعُ [1]

تمھارے کاموں میں سب سے اہم کام میرے نزدیک نماز ہے، جس نے اسے ضائع ہونے نہ دیا اور اس کی پابندی کی اس نے اپنے دین کو ضائع ہونے سے بچا لیا۔ جس نے اسے ضائع کردیا وہ اور چیزوں (احکام) کو زیادہ ضائع کرنے والا ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ نماز کے بغیر انسان نہ دین پر قائم رہ سکتا ہے اور نہ اس کی طرف دنیا کو دعوت دے سکتا ہے۔

دعوت کے لیے مطلوبہ اوصاف اور نماز

دعوتِ دین کے لیے جن اوصاف اور خصوصیات کی ضرورت ہے وہ بھی نماز ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں ان میں سے بعض اوصاف کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

صبر اور استقلال

دین کی دعوت کھیل نہیں ہے۔ اس کے لیے بے پناہ صبر اور پہاڑ کی طرح ثابت قدمی اور استقامت چاہیے۔ یہ خوبی انسان کے اندر نماز ہی کے ذریعے پیدا ہوسکتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ﴿۱۹﴾ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ﴿۲۰﴾ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ﴿۲۱﴾ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ﴿۲۲﴾ (المعارج: ۱۹-۲۲)

یقیناً انسان تھڑ دِلا پیدا کیا گیا ہے، جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو گھبرا جاتا ہے اور جب راحت ملتی ہے تو ہاتھ روک لیتا ہے سوائے نمازیوں کے وہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔

کسی کام کو چند دن انجام دینا آسان ہے لیکن استقلال کے ساتھ اسے کرتے رہنا آسان نہیں ہے۔ بعض لوگ پورے جوش اور جذبہ کے ساتھ دعوت کا آغاز تو کرتے ہیں، لیکن بہت جلد ان کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے اور وہ اسے چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ اس کے

---

[1] مؤطا امام مالک، باب الوقوت

صاف معنی یہ ہیں کہ ان کی نگاہ میں اس کام کی کوئی اہمیت نہیں ہے، جس وقت انھوں نے دین کی دعوت شروع کی نہ تو اس وقت ان کو احساس تھا کہ وہ کتنا بڑا کام شروع کر رہے ہیں اور نہ اس وقت جب کہ انھوں نے اسے ترک کیا، ان کو احساس ہوا کہ وہ کتنا اہم کام ترک کر رہے ہیں، حالاں کہ دعوتِ دین کا جذبہ انسان کے اندر اس طرح داخل ہونا چاہیے کہ مرتے دم تک اس کی حرارت ختم نہ ہو۔ نماز آپ کے اندر استقلال اور ثابت قدمی کا وصف پیدا کرتی ہے۔ اس لیے اگر صحیح معنی میں آپ نمازی ہیں تو دین کے کام میں بھی آپ کو ثابت قدمی نصیب ہوگی ورنہ آپ اس سے محروم ہوں گے۔ قرآن نے نمازیوں کی صفت یہ بیان کی ہے:

الَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ جو اپنی نماز میں مداومت کرنے والے ہیں۔ (المعارج: ۲۳)

نماز میں مداومت آپ کو فطری طور پر اتباعِ دین میں مداومت کی عادی بنائے گی، آپ اس کے احکام کے ہمیشہ پابند ہوں گے اور اپنی دعوتی تگ و دو بھی مسلسل جاری رکھ سکیں گے۔

نماز سے صبر پیدا ہوتا ہے

نماز سے استقلال اور پامردی حاصل ہوتی ہے۔ اسے صبر بھی کہا جاسکتا ہے۔ صبر کے بہت سے پہلو ہیں۔ ایک پہلو یہ ہے کہ آدمی ہر طرح کی مشکلات اور آزمائشوں میں دین پر قائم رہے، اس سے سرِ مو انحراف نہ کرے اور کارِ دعوت جاری رکھے۔ اس وصفِ خاص کو پیدا کرنے کا ذریعہ نماز ہے۔ نماز سے ہر طرح کے حالات میں صبر و ثبات کی صلاحیت نصیب ہوتی ہے۔ اس کا ثبوت قرآن مجید کی تعلیمات اور اسلامی تاریخ سے ملتا ہے۔

دعوتِ اسلامی کا مکی دور صبر و ثبات کا دور تھا۔ اس دور میں رسول اللہ ﷺ جیسی

بے نفس، بااخلاق، شریف اور معصوم ہستی کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے، پتھر برسائے گئے، نعوذ باللہ مجنوں کہا گیا، بے دین کہا گیا، قصہ گو کہا گیا، دوسروں کا لکھایا پڑھایا دہرانے والا کہا گیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ آپ ان بے بنیاد الزامات اور اتہامات پر کبھی مشتعل نہیں ہوئے بلکہ صبر وسکون کے ساتھ اپنی دعوت پیش فرماتے رہے۔ مخالفت کرنے والوں کے ضمیر کو جھنجھوڑا، ان کی عقل سے اپیل کی، انھیں غور وفکر پر ابھارا اور اندھی بہری مخالفت کے نتائجِ بد سے آگاہ کیا۔ اس طرح عداوت اور دشمنی کے اس ماحول میں حجت تمام کردی۔

اسی پاکیزہ اسوہ کو صحابہ کرام نے اپنایا اور مخالفتوں کی آندھی میں صبر کا پہاڑ بنے رہے۔ ان کا جہاد بے مثال تھا تو صبر بھی بے مثال تھا۔ پھر یہ کہ یہ بزدلوں اور نامردوں کا صبر نہ تھا بلکہ جواں مردوں اور موت سے کھیل جانے والوں کا صبر تھا۔ یہ اس قوم کے سپوتوں کا صبر تھا جس کے ہاں بات بات پر تلواریں کھنچ جاتی تھیں، جس کے غیظ و غضب کی آگ مخالف سے انتقام لیے بغیر بجھتی نہ تھی، جو اپنے حلیفوں اور حامیوں پر کسی کو دست درازی کی اجازت نہیں دیتی تھی، جس کا ہر فرد چوٹ کھانے کے بعد شیروں کی طرح بپھر جاتا تھا، جس کے نزدیک ظلم کو برداشت کرنا بزدلی کے ہم معنی تھا، جو جہالت اور بربریت کا جواب سخت تر جہالت اور بربریت سے دینا ضروری سمجھتی تھی۔ حیرت ہے اس قوم کے افراد کو جن میں سے بیشتر نوجوان تھے، اسلام نے صبر و ضبط کا اس طرح پابند بنایا کہ مکہ کی پوری تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی افتراء پردازی یا غلط بیانی پر وہ بے قابو ہوگئے ہوں، ظلم و زیادتی کے مقابلے میں جوشِ انتقام ابھر آیا ہو، بدزبانی کے جواب میں بدزبانی اور بدسلوکی کی ہو، خنجر کے مقابلے میں خنجر اٹھایا ہو، تلوار کے مقابلے میں تلوار نکل آئی ہو، صبر کی یہ غیر معمولی طاقت نماز سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے قرآن مجید نے جہاں کہیں صبر کا حکم دیا ہے بالعموم نماز کی تلقین کی ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ الْغُرُوْبِ ﴿۳۹﴾ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَ اَدْبَارَ السُّجُوْدِ ﴿۴۰﴾ (قٓ: ۳۹-۴۰)

جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں اس پر صبر کرو اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہو۔ طلوعِ آفتاب سے پہلے بھی اور غروبِ آفتاب سے پہلے بھی اور رات میں بھی اس کی تسبیح کرو اور سجدہ ریزیوں سے فارغ ہونے کے بعد بھی۔

صبر کی اہمیت

جو لوگ دعوتِ دین کا فریضہ انجام دینے کھڑے ہوں ان کے لیے صبر کی آج بھی اسی طرح ضرورت ہے جس طرح کل ضرورت تھی۔ اس وقت ایک طرف مذہب دشمن اور بے دین لوگ ان کے خلاف محاذ آرا ہیں اور دوسری طرف اللہ اور رسول کا نام لینے والے ان سے برسرِ پیکار ہیں۔ مذہب بے زار طبقہ انھیں قدامت پرست، دقیا نوسی، زمانہ سے بے خبر، ملک کا بدخواہ، قوم دشمن اور فرقہ پرست ثابت کرنے کی پوری کوشش کر رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ انھوں نے دین کے خادموں کو اسی طرح دیکھا ہے اور ان کی جدوجہد کو ایسی ہی پایا ہے بلکہ اس کی حقیقی وجہ یہ ہے کہ وہ ان کو اپنی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتا ہے اور ان کی آڑ میں اللہ کے دین، اس کے عقائد اور اس کے فلسفۂ حیات کو نشانہ بنا رہا ہے۔ جو لوگ دین دار سمجھے جاتے ہیں ان کی طرف سے بھی ان پر جھوٹے الزامات برس رہے ہیں۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں کا عقیدہ خراب ہے۔ یہ خدا کو تو مانتے ہیں لیکن اس کے رسول پر ان کا ایمان نہیں ہے، کبھی کہا جاتا ہے کہ خدا اور رسول کو تو مانتے ہیں لیکن اس طرح نہیں مانتے جس طرح ہم مانتے ہیں، کبھی ارشاد ہوتا ہے کہ ان کا مذہب سیاسی مذہب ہے، یہ اقتدار چاہتے ہیں، تقویٰ اور خدا ترسی ان کا مطلوب و مقصود نہیں ہے۔ کہیں سے آواز آتی ہے کہ یہ صحابہ کرامؓ اور بزرگانِ امت کی توہین کرتے ہیں۔ کبھی ارشاد ہوتا ہے کہ یہ اپنے علاوہ کسی کو مسلمان نہیں سمجھتے۔ کبھی بتایا جاتا ہے کہ ان کے نزدیک سوائے ان کے کسی نے آج تک دین ہی کو نہیں سمجھا ہے۔

آپ جانتے ہیں یہ سب کچھ سراسر جھوٹ ہے، تہمت اور غلط بیانی ہے۔ کذب و افترا کے اس طوفان میں صبر و ثبات کی دولت آپ کو نماز ہی سے مل سکتی ہے۔

نماز سے استقامت ملتی ہے

کسی غیر اسلامی ماحول میں صحیح اسلامی دعوت کا اٹھنا اور اس پر اس کے کارکنوں کا ثابت قدم رہنا سخت دشوار ہے۔ جہاں اسلامی فکر پر غیر اسلامی افکار ہر طرف سے حملہ آور ہوں، جہاں مخالف ماحول اپنا شدید دباؤ ڈال رہا ہو، جہاں حوصلہ شکن حالات میں دعوت کا کام کرنا پڑے، جہاں کسی کارکن کی کسی خوبی کا اعتراف تو نہ ہو البتہ اس کی غلطی اور لغزش کی تحسین اور ہمت افزائی کا ماحول ہو، جہاں کم زوری کو حکمت و مصلحت کہا جائے، جہاں پیش قدمی کی مذمت کی جائے اور پسپائی کو حکمت اور دانش مندی تصور کیا جائے، وہاں استقامت کو کارنامہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ جب کبھی اسلام کو مخالف طاقتیں ابھرتا ہوا دیکھتی ہیں تو وہ بزور اسے کچل دینا چاہتی ہیں لیکن یہ ان کے لیے آسان نہیں ہوتا، کیوں کہ تحریکیں زور اور قوت سے دبائی نہیں جاتیں۔ اس لیے ان کو خواہش ہوتی ہے کہ اس کے علم بردار خود اسے ختم کردیں۔ اس کی کبھی وہ کھلی ہوئی درخواست نہیں کرتیں۔ ان کا مطالبہ صرف اتنا ہوتا ہے کہ اسلام کے ماننے والے اپنے سخت موقف سے ذرا پیچھے ہٹیں۔ وہ دوسروں کے افکار و خیالات کی صحت و صداقت کو تسلیم کریں اور دوسرے ان کے نظریات کی خوبی کا اعتراف کریں۔ کچھ باتوں کو وہ برداشت کریں اور کچھ کو ان کے مخالفین انگیز کریں تاکہ بقائے باہم کی کوئی صورت نکل آئے۔ یہ بڑا نازک مرحلہ ہوتا ہے۔ یہی موقع ہوتا ہے جب کہ اسلام کے لیے کام کرنے والوں کے اندر بھی لچک یا مداہنت آسکتی ہے اور وہ اپنے خیالات پر نظر ثانی کے لیے تیار ہوسکتے ہیں۔ اس طرح کا ہر اقدام تحریک کی بھی موت ہے اور اس کے کارکنوں کی بھی۔ اس لیے کہ بلندی سے جب انسان لڑھکنے لگتا ہے تو درمیان میں رکتا نہیں ہے بلکہ نیچے پہنچ کر ہی دم لیتا ہے۔ جہاں حالات کے سامنے اس کا سر ذرا سا خم

ہوتا ہے تو حالات اس سے سجدہ کرا کے رہتے ہیں، جب وہ اپنی ایک چیز دشمن کے حوالہ کرتا ہے تو دشمن اسے ہر چیز سے محروم کر کے رکھ دیتا ہے۔

باطل طاقتوں کے مقابلہ میں استقامت، اللہ تعالیٰ کی یاد اور نماز سے ملتی ہے۔ دیکھیے قرآن کتنی صراحت کے ساتھ کہتا ہے:

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَ مَنْ تَابَ مَعَكَ وَ لَا تَطْغَوْا ؕ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۲﴾ وَ لَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَ اصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

(ہود: ۱۱۲-۱۱۵)

پس اے نبیؐ تم اور تمھارے وہ ساتھی جو تمھارے ساتھ اللہ کی طرف پلٹ آئے ہیں۔ راہِ راست پر اس طرح قائم رہو جیسا کہ تمھیں حکم دیا گیا ہے اور حد سے نہ بڑھو، بے شک تم جو کچھ کر رہے ہو اسے وہ دیکھ رہا ہے اور ان لوگوں کی طرف ذرا نہ جھکو جنھوں نے ظلم کی روش اختیار کی ہے ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آ جاؤ گے۔ تمھارے لیے اللہ کے سوا کوئی مددگار نہ ہوگا اور کہیں سے تمھاری مدد نہ ہوگی اور نماز قائم کرو دن کے دونوں سروں پر اور رات کے کچھ حصوں میں۔ بے شک نیکیاں برائیوں کو زائل کر دیتی ہیں۔ یہ یاد دہانی ہے ان کے لیے جو اللہ کو یاد رکھتے ہیں بے شک اللہ نکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

استقامت کے حکم کے ساتھ ظالموں اور اللہ کے باغیوں کی طرف ذرا سا بھی جھکنے سے منع کیا گیا۔ اس کے بعد رات اور دن کے مختلف حصوں میں نماز قائم کرنے کی تاکید کی گئی۔ اس طرح یہ بتا دیا گیا کہ نماز ہی کے سہارے آدمی استقامت دکھا سکتا ہے۔ نماز نہ ہو تو اس کے قدم اکھڑ جائیں گے، وہ کم زور پڑ جائے گا اور ظالم اسے اپنی طرف کھینچ لے جائیں گے۔

دین کی صحیح ترجمانی

دعوتِ دین کا ایک تقاضا یہ ہے کہ دین کو بغیر کسی کمی بیشی کے صحیح اور مکمل شکل میں پیش کیا جائے۔ اس کی صلاحیت آپ کے اندر اس وقت پیدا ہوگی جب کہ آپ کی نماز درست ہو اور آپ ٹھیک طریقہ سے اسے ادا کریں اور اس میں کسی قسم کی کوتاہی آپ سے سرزد نہ ہو۔ قرآن نے نمازیوں کے بارے میں کہا ہے:

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿٩﴾ اور جو اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں۔

(المومنون:۹)

جب آپ نماز کے ایک ایک جزء اور ایک ایک تقاضے کو پورا کریں گے تو صحیح معنی میں نماز کے محافظ ہوں گے اور اللہ کے دین کو بھی ٹھیک اس طرح دنیا کے سامنے پیش کر سکیں گے، جس طرح اسے پیش کرنے کا حکم ہے۔

قرآن و حدیث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے زیادہ اہمیت نماز کو دی ہے۔ آپ کی زندگی میں بھی نماز ہی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہونی چاہیے۔ نماز اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ عمل ہے۔ آپ کا پسندیدہ عمل بھی نماز ہی کو ہونا چاہیے۔ حضور اکرمؐ فرماتے ہیں: ''جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ''[1] (نماز میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک رکھ دی گئی ہے) ضروری ہے کہ نماز آپ کی بھی آنکھوں کی ٹھنڈک ہو۔ آپ کو اس سے سرور و راحت ملے اور اس کے ایک ایک عمل میں لطف و کیف حاصل ہو۔ جو نماز ان خصوصیات کی حامل ہوگی وہ آپ کی کامیابی کی ضامن ہے، آپ کے لیے اللہ کی رحمتیں لاتی ہے اور آپ کو اس قابل بناتی ہے کہ سخت سے سخت ماحول میں اور مخالفت کے طوفان کے باوجود اس کے دین کو پیش کرنے کی سعادت حاصل کریں۔ لیکن اگر آپ کی نماز ان خصوصیات کی حامل نہیں ہے تو آپ نماز پڑھنے کے باوجود اللہ تعالیٰ کو بھولے ہوئے ہوں گے۔ جو شخص اللہ کو بھول جائے اللہ بھی اسے فراموش کر دیتا ہے۔ اس کے لیے ممکن نہیں ہے کہ دعوتِ دین جیسا کارِ عظیم انجام دے۔

---

[1] سنن نسائی، کتاب عشرة النساء، باب حب النساء۔ مسند احمد، ۱۲۸/۳

انفاق فی سبیل اللہ[1]

جس شخص کے پاس دولت ہوتی ہے، وہ عیش وعشرت کی زندگی گزارتا ہے، اپنی نفسانی خواہشات پوری کرتا ہے، عالی شان عمارتیں تعمیر کرتا ہے۔ اللہ کے بندوں کو اپنا غلام بناتا اور ان کے درمیان اپنی اونچی حیثیت کا اظہار کرتا ہے، لیکن اسلام نے اسے انفاق فی سبیل اللہ کا حکم دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اپنا مال اللہ کی راہ میں صرف کرنا چاہیے، کیوں کہ اللہ کے بندے کو اللہ ہی کی راہ میں خرچ کرنے کا حق ہے۔ اگر کسی دوسری مد میں وہ اپنا مال صرف کرتا ہے تو اپنی حد سے تجاوز کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے احسانات کا اعتراف

انفاق، اللہ تعالیٰ کے احسانات کا عملی اعتراف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان پر بے شمار احسانات کیے ہیں۔ ان کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے جیسے دوسرے انسانوں کے ساتھ احسان کی روش اختیار کرے۔ اس کی بہترین شکل ان کی مالی مدد ہے۔ جب ایک شخص محنت سے کمائی ہوئی اپنی دولت کسی محتاج پر صرف کرتا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ اسے اللہ کے انعامات کا احساس ہے اور وہ اس کا شکر ادا کرنا چاہتا ہے۔ مومن اور کافر میں یہی فرق ہے۔ مومن اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ ہوتا ہے اور کافر اللہ کو بھولا ہوا

---

[1] 'انفاق فی سبیل اللہ' کے نام سے راقم کی کتاب اس سے پہلے شائع ہو چکی ہے۔ یہ مضمون اسی کتاب کے اقتباسات سے ترتیب دیا گیا ہے۔ (جلال الدین)

اور احسان فراموش۔ سورۂ بلد میں اللہ تعالیٰ نے انسان پر اپنے بعض احسانات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

فَلَا اقۡتَحَمَ الۡعَقَبَةَ ۞ وَ مَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الۡعَقَبَةُ ۞ فَكُّ رَقَبَةٍ ۞ اَوۡ اِطۡعٰمٌ فِیۡ یَوۡمٍ ذِیۡ مَسۡغَبَةٍ ۞ یَّتِیۡمًا ذَا مَقۡرَبَةٍ ۞ اَوۡ مِسۡكِیۡنًا ذَا مَتۡرَبَةٍ ۞

(البلد:۱۱-۱۶)

لیکن وہ گھاٹی میں نہیں داخل ہوا، کیا تمھیں معلوم ہے کہ وہ گھاٹی کیا ہے؟ وہ ہے گردن کو غلامی سے چھڑانا، یا بھوک کے دنوں میں قرابت دار یتیم کو یا عاجز مسکین کو کھانا کھلانا۔

انفاق، خوفِ خدا کی دلیل

اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا اس سے خوف اور خشیت کی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انفاق کو آخرت کے عذاب سے بچنے کا ذریعہ بتایا ہے۔ اس لیے جس شخص کے دل میں آخرت کا خوف ہوگا وہ یقیناً اپنا مال صرف کرکے آخرت کے عذاب سے بچنے کی کوشش کرے گا۔ قرآن کہتا ہے کہ یتیموں اور مسکینوں کو وہی دھکا دے گا جو خدا اور آخرت سے غافل ہے۔ (الماعون:۱-۳)

جن لوگوں کے دل و دماغ پر اللہ کا خوف اور آخرت کی فکر چھائی رہتی ہے، ان سے اس سنگ دلی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ ان کا حال بالکل دوسرا ہوتا ہے۔

وَ یُطۡعِمُوۡنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسۡكِیۡنًا وَّ یَتِیۡمًا وَّ اَسِیۡرًا ۞ اِنَّمَا نُطۡعِمُكُمۡ لِوَجۡهِ اللّٰهِ لَا نُرِیۡدُ مِنۡكُمۡ جَزَآءً وَّ لَا شُكُوۡرًا ۞ اِنَّا نَخَافُ مِنۡ رَّبِّنَا یَوۡمًا عَبُوۡسًا قَمۡطَرِیۡرًا ۞

(الدہر:۸-۱۰)

وہ کھانے کی خواہش اور ضرورت کے باوجود اسے محتاج، یتیم اور قیدی کو کھلا دیتے ہیں (اور اپنی زبان حال سے کہتے ہیں کہ) ہم تو صرف اللہ کی رضا کے لیے کھلا رہے ہیں۔ ہم تم سے اس کا بدلہ اور شکر گزاری نہیں چاہتے۔ ہم کو اس سخت اور ہولناک دن کا ڈر ہے جس کا آنا ہمارے رب کی طرف سے یقینی ہے۔

مال کے ذریعے انسانوں کی خدمت

آدمی کے پاس دولت ہو تو وہ اسے اپنے نفس پر خرچ کرتا ہے، اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں پر صرف کرتا ہے، اس سے آگے بڑھ کر اس کی داد و دہش قوم اور قبیلہ کے لیے بھی ہوسکتی ہے۔ لیکن اسلام اس کے سامنے بہت وسیع نقطۂ نظر پیش کرتا ہے۔ وہ انسان پر بحیثیتِ انسان خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ وہ ایک مسلمان کا یہ فرض قرار دیتا ہے کہ جو شخص بھوکا ہے اسے کھانا کھلائے، جو ننگا ہے اسے کپڑا پہنائے اور جو محتاج اور دست نگر ہے اس کی دست گیری کرے، خواہ وہ اس کا عزیز ہو یا غیر، اجنبی ہو یا شناسا، اس کے دیس کا ہو یا پردیسی، ہم مذہب ہو یا دوسرے مذہب کا۔ جب بھی وہ کسی حاجت مند کی حاجت پوری کرنے کے موقف میں ہو اسے لازماً اس کی مدد کرنی ہوگی۔ ہاں اگر وہ اس فرض کے ادا کرنے سے معذور ہے تو اس کی گرفت نہ ہوگی۔

اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا اس کی رحمت کو دعوت دینا ہے۔ جو شخص محتاج ہے وہ اس بات کا موقع فراہم کرتا ہے کہ اس کی حاجت پوری کرکے آدمی اللہ کی رحمت کا مستحق ہوجائے۔ اسی وجہ سے حدیث میں کہا گیا ہے:

”رحم کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ رحم فرماتا ہے۔ تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم فرمائے گا۔“[1]

انفاق کے معاملے میں اس وسیع نقطۂ نظر کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا ہوگا۔ یہی دین و ایمان کا تقاضا اور اس کا فطری مطالبہ ہے۔

نماز اور انفاق کا ایک ساتھ حکم

نماز دین کا ستون ہے۔ قرآن مجید نے زکوٰۃ، یا انفاق فی سبیل اللہ کو نماز کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ جہاں وہ نماز کا ذکر کرتا ہے بالعموم اس کے پہلو میں انفاق فی سبیل اللہ کا بھی تذکرہ کرتا ہے۔ قرآن مجید کے پہلے پارے کے شروع ہی میں خدا ترس اور

---

[1] جامع ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی رحمة المسلمین

متقی انسانوں کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳﴾ (البقرۃ:۳)

وہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

اس طرح کی اور بہت سی آیات ہیں، جن میں نماز کے ساتھ انفاق یا زکوٰۃ کا ذکر ہے۔ ان دونوں کا مقصد اور روح ایک ہے۔ اسلام کا اپنے ماننے والوں سے مطالبہ یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ اقامتِ صلوٰۃ کا اہتمام کریں اور دوسری طرف اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کریں۔ اسی پر دنیا و آخرت کی فلاح کا دار و مدار ہے۔ اس کے بغیر کامیابی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

نمازِ تہجد اور انفاق

نماز تہجد اللہ کے نیک بندوں کی خاص پہچان ہے۔ قرآن مجید اس کے ساتھ ان کے انفاق کا حوالہ ضرور دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ والے محض شب زندہ دار ہی نہیں ہوتے، بلکہ اللہ نے انھیں مال و دولت سے نوازا ہے تو اس کا ایک حصہ اس کی راہ میں لٹاتے بھی ہیں۔ اللہ کے ہاں ان کی جزا وہم و خیال سے بھی بالاتر ہوگی۔

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ۫ وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۱۶﴾ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۷﴾ (السجدۃ:۱۶-۱۷)

ان کے پہلو ان کی خواب گاہوں سے الگ رہتے ہیں، وہ اپنے رب کو خوف اور امید سے پکارتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے (اللہ کے ہاں) جو پوشیدہ رکھا گیا ہے وہ کسی نفس کو نہیں معلوم ہے۔ یہ جزا ہے ان اعمال کی جو وہ کرتے تھے۔

نماز اور انفاق شریعت کی اساس ہیں

نماز اور انفاق کی یہ اہمیت اس لیے ہے کہ یہ شریعت کے لیے بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ ان سے اس کا ایک مکمل نظام وجود میں آتا ہے۔ نماز اللہ تعالیٰ سے انسان کے تعلق کو استوار کرتی اور اسے اللہ کی اطاعت اور فرماں برداری کے لیے تیار کرتی ہے۔ زکوٰۃ اور انفاق بہ ظاہر مالی تعاون کی ایک صورت ہے، لیکن اس کے ذریعے انسان کے اندر بندوں کے حقوق ادا کرنے اور ان کی مشکلات میں کام کرنے کا جو جذبہ ابھرتا ہے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اس سے خدمت، حسنِ سلوک، ایثار، ہم دردی اور خیر خواہی جیسی اعلیٰ اخلاقیات پرورش پاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت اور اس کے بندوں سے اخلاص اور خیر خواہی کا تعلق یہ دو ایسے عنوانات ہیں، جن کے تحت پوری شریعت آجاتی ہے۔ ان پر ٹھیک ٹھیک عمل، انسان کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ پورے دین پر گام زن ہوسکے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں دین و ایمان کے جو تقاضے بیان ہوئے ہیں ان میں نماز اور انفاق سب سے نمایاں ہیں۔ اہلِ ایمان سے ان کا یکساں مطالبہ ہے۔ ارشاد ہے:

قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ يُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَ لَا خِلٰلٌ ﴿۳۱﴾ (ابراہیم: ۳۱)

کہو میرے ان بندوں سے جو ایمان لائے ہیں کہ نماز قائم کریں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے کھلے اور چھپے طریقہ سے خرچ کریں، قبل اس کے کہ وہ دن آجائے، جس میں نہ تو خرید و فروخت ہوگی اور نہ کوئی دوستی ہوگی۔

جان و مال کی قربانی پر جنت کا وعدہ

مال و دولت کے لیے تاجر تجارت کرتا ہے، دکان دار اپنی دکان سجاتا ہے، سرمایہ دار کارخانے اور فیکٹریاں کھولتا ہے، مزدور اپنا خون پسینہ بہاتا ہے۔ اگر یہ ساری کوششیں جائز حدود میں ہوں تو اسلام اس سے منع نہیں کرتا، البتہ وہ یہ حقیقت ہمارے

سامنے رکھتا ہے کہ محنت سے کمائے ہوئے سرمائے کو اگر انسان اللہ تعالیٰ کے ہاتھ فروخت کردے تو آخرت میں اُسے جنت جیسی دکھوں سے پاک اور دائمی سکھ کی جگہ حاصل ہوگی اور وہ ہمیشہ عیش کی زندگی گزارے گا۔ جو شخص اس جنت کے لیے اپنی جان اور اپنا مال اللہ کے حوالے کردے وہ مومن ہے۔ اللہ کا وعدہ ہے کہ اس کے اس ایثار اور قربانی کا بدلہ اسے جنت کی شکل میں ملے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (التوبۃ:۱۱۱)	یقیناً اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور مال جنت کے عوض خرید لیے ہیں۔

اس سے بڑی کامیابی اور کیا ہوسکتی ہے کہ انسان اپنی حقیر اور بے ثبات جان اور اپنا ناپائے دار اور فانی مال اللہ کی راہ میں دے کر جنت کی لازوال نعمتوں اور عیشِ جاوداں کا مستحق ہوجائے۔

انفاق کی ترغیب

قرآن و حدیث میں بار بار زکوٰۃ کی تاکید اور امورِ خیر میں انفاق کی ترغیب دی گئی ہے اور اس کی فضیلت اور اجر و ثواب بیان ہوا ہے۔ سورۂ مزمل کے آخر میں ارشاد ہے:

وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ؕ وَ مَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَیْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَیْرًا وَّ اَعْظَمَ اَجْرًا ؕ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۲۰﴾	نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ کو قرض دو اچھا قرض اور جو بھی نیک عمل تم اپنے لیے آگے بھیجو گے اسے اللہ کے پاس پاؤ گے کہ وہ بہتر اور ثواب میں بہت بڑا ہوگا اور اللہ سے استغفار کرو۔ بے شک اللہ غفور و رحیم ہے۔ (المزمل:۲۰)

یہ اس بات کی ہدایت ہے کہ نماز کے ساتھ زکوٰۃ پر عمل ہو اور نیکی کے کاموں

میں بہ خوشی دولت لگائی جائے۔ نیکی کی راہ میں جو دولت صرف ہوتی ہے وہ اس سرمایہ سے بہتر ہے جسے انسان اس دنیا میں چھوڑ جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس کا بے پایاں اجر و ثواب اللہ کے ہاں ملنے والا ہے۔

انفاق بڑے نفع کا سودا

اللہ تعالیٰ کی راہ میں انفاق اتنے بڑے نفع کا سودا ہے کہ آدمی آسانی سے اس کا تصور نہیں کرسکتا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کسان ایک دانا بوئے اور سات سو دانے کاٹے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۭ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾ (البقرة:۲۶۱)

ان لوگوں کی مثال جو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، ایسی ہے جیسے ایک دانہ (بویا جائے) اس سے سات بالیں نکلیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں۔ اللہ جسے چاہتا ہے (اس سے بھی زیادہ) اضافہ کرتا ہے۔ اللہ وسعت والا اور علم والا ہے۔

انسان بہت بڑا نادان ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے میں اس کا خسارہ ہے، حالاں کہ یہ نقصان کا نہیں بلکہ سراسر نفع کا سودا ہے۔ وہ آج جو مال خرچ کرے گا کل اس کا بہترین صلہ اسے ملے گا۔ یہاں ایک پیسہ صرف کرے گا تو وہ بڑھ کر دس، بلکہ سات سو پیسے کی شکل میں اس کے سامنے آئے گا۔ یہی نہیں بلکہ فرمایا ”اللہ جسے چاہے گا اس سے بھی بڑا اجر عطا کرے گا اور اللہ وسعت اور علم والا ہے“ یعنی انسان نے اس دنیا میں جو کچھ خرچ کیا ہے اللہ تعالیٰ آخرت میں اس کا اجر سات سو گنا سے بھی زیادہ دے سکتا ہے۔ اس کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ ذرا سوچیے! جو اجر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملے اور فزوں تر ہو کر ملے اس اجر و اضافے کو کن الفاظ میں بیان

کیا جاسکتا ہے؟ جو اللہ کا بندہ اس اجرِ عظیم کا مستحق قرار پائے کون ہے جو اس کی سعادت پر رشک نہ کرے؟

حضرت ابو ذرؓ نے رسول اللہؐ سے دریافت کیا۔ صدقے کا اجر و ثواب کیا ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا: اضعاف مضاعفة و عند الله المزید[1] اس کا ثواب بڑھا چڑھا کر دیا جائے گا اور اللہ کے پاس تو اس سے بھی زیادہ ہے۔

خوش نصیب ہیں وہ جو اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور کھلے دل سے خرچ کرتے ہیں، کیوں کہ ان کا مال بے حساب اضافے کے ساتھ ان کو لوٹایا جائے گا اور اس وقت لوٹایا جائے گا جب کہ وہ خالی ہاتھ اور سرمائے کے محتاج ہوں گے۔

انفاق سے مال میں اضافہ

دنیا کا عام قاعدہ ہے کہ کسی بھی چیز کے صرف کرنے سے اس میں کمی واقع ہوتی ہے، لیکن انفاق فی سبیل اللہ کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یہاں خرچ کرنے سے مال میں خیر و برکت ہوتی اور اس میں اضافہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے راستے میں کوئی چیز دی جائے تو وہ اس کا بہتر بدل عطا فرماتا ہے۔

قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَیَقْدِرُ لَهٗ ؕ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ﴿۳۹﴾

(سبا: ۳۹)

ان سے کہو میرا رب اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے رزق میں کشادگی عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے کم دیتا ہے، جو چیز بھی تم (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو گے اللہ اس کا عوض دے گا اور وہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ "صدقے اور خیرات سے کبھی مال میں کمی واقع نہیں ہوتی، بندہ عفو و درگزر سے کام لے تو اللہ تعالیٰ اس کی عزت میں اضافہ فرماتا ہے اور تواضع اختیار کرے تو اُسے سربلندی عطا فرماتا ہے۔"[2]

---

[1] مسند احمد، ۵/۲۶۵

[2] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب استحباب العفو والتواضع

بخل کی مذمت

دنیا کی نظر میں عزت و ذلت کا معیار مال ہے۔ دولت سے یہاں انسان کا وقار بلند ہوتا ہے، وہ قابلِ احترام سمجھا جاتا اور اس کی عزت کی جاتی ہے، خواہ وہ اللہ تعالیٰ کا مطیع وفرماں بردار ہو، یا اس کا باغی اور سرکش۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا اس عزت و ذلت سے بے خبر ہے، جس کا فیصلہ کل قیامت کے روز ہونے والا ہے، جب کہ وہ سب لوگ ذلیل وخوار ہوں گے جو دولتِ دنیا پاکر اللہ کو بھول گئے۔ وہاں وہ سرمایہ کام نہیں آئے گا جو جمع کیا گیا، بلکہ وہ دولت کام آئے گی جو اللہ کی راہ میں لٹا دی گئی۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے:

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِۨ ۝١ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ ۝٢ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ ۝٣ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۝٤ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ۝٥ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝٦ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ۝٧ اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۝٨ فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۝٩ (الھمزہ:۱-۹)

تباہی ہے ہر عیب چیں اور طعن وتشنیع کرنے والے کے لیے، جو مال جمع کرتا اور گن گن کر رکھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ وہ ضرور پھینکا جائے گا 'حطمہ' (جہنم) میں۔ تم جانتے ہو کہ 'حطمہ' کیا ہے؟ وہ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے، جو دلوں پر چڑھتی ہے۔ وہ ان کو لمبے لمبے ستونوں کے درمیان بند کیے ہوئے ہوگی۔

بخل کا انجامِ بد

انسان سانپ کی طرح مال کی حفاظت کرتا ہے اور اسے ایک مضبوط سہارا سمجھتا ہے۔ ایسا سہارا جو مشکل میں اس کے کام آئے گا۔ حالاں کہ قیامت کے روز جب کہ سب سے زیادہ سہارے کی ضرورت ہوگی، اس کا اندوختہ کچھ بھی اس کے لیے مفید ثابت نہ ہوگا، بلکہ یہ 'محفوظ سرمایہ' اس کے حق میں عذاب بن جائے گا۔

وَ الَّذِیۡنَ یَکۡنِزُوۡنَ الذَّہَبَ وَ الۡفِضَّۃَ وَ لَا یُنۡفِقُوۡنَہَا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ۙ فَبَشِّرۡہُمۡ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ ﴿۳۴﴾ یَّوۡمَ یُحۡمٰی عَلَیۡہَا فِیۡ نَارِ جَہَنَّمَ فَتُکۡوٰی بِہَا جِبَاہُہُمۡ وَ جُنُوۡبُہُمۡ وَ ظُہُوۡرُہُمۡ ؕ ہٰذَا مَا کَنَزۡتُمۡ لِاَنۡفُسِکُمۡ فَذُوۡقُوۡا مَا کُنۡتُمۡ تَکۡنِزُوۡنَ ﴿۳۵﴾

(التوبۃ: ۳۴-۳۵)

جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی خوش خبری دے دو۔ ایک دن آئے گا جب کہ اسی سونے اور چاندی کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا اور اس سے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا اور کہا جائے گا یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا۔ پس مزہ چکھو اس دولت کا جسے تم جمع کر رہے تھے۔

اس آیت کی تشریح حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک روایت سے ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص سونے اور چاندی کا مالک ہے اور وہ اس کا حق ادا نہیں کر رہا ہے، قیامت کے روز اس کے مال کی تختیاں بنائی جائیں گی، ان کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور ان سے اس کے بازوؤں کو، اس کی پیشانی اور اس کی پیٹھ کو داغا جائے گا۔ جب وہ ٹھنڈی ہونے لگیں گی تو جہنم میں پھر گرم کی جائیں گی اور ان سے اسے داغ دیے جاتے رہیں گے“ (یہ ایک طویل سلسلہ ہوگا)۔[1]

کامیابی ان خوش بخت انسانوں کے انتظار میں ہے جو اللہ کا دیا ہوا مال اس کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ افسوس ہے ان بدنصیبوں پر جو مال کی محبت میں کامیابی کے دروازے اپنے اوپر بند کرلیں۔

دعوتِ دین اور انفاق فی سبیل اللہ

انفاق فی سبیل اللہ دین کی ایک اہم بنیاد ہے۔ اس کے بغیر دین کا تصور مشکل ہی سے کیا جاسکتا ہے۔ اس کے ساتھ دین کی دعوت و تبلیغ اور اس کی سربلندی کے لیے بھی اس کی بڑی اہمیت ہے۔ یہاں اس کے بعض خاص پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب اثم مانع الزکوٰۃ

انسانوں کی خدمت اور خیر خواہی

دعوتِ دین انسانوں کے ساتھ خیر خواہی کا عمل ہے۔ اس خیر خواہی کا لازمی تقاضا ہے کہ ہر اس فرد بشر کی مدد کی جائے جو اس کا مستحق ہے اور جس کی مدد عملاً آپ کر سکتے ہیں۔ دعوتِ دین درحقیقت انسانوں کو آخرت کے عذاب سے بچانے کی کوشش ہے۔ جو شخص اتنی عظیم خدمت کے لیے اٹھے وہ نوعِ انسانی کا بہت بڑا خیر خواہ ہے۔ اگر وہ اپنے اس کام میں مخلص ہے تو فطری طور پر اس دنیا میں بھی ان کا غم خوار ہوگا اور ان کے دکھ درد میں کام آئے گا۔ جو آدمی انسانوں کو کل کے عذاب سے بچانے کے لیے بے چین ہے ناممکن ہے کہ وہ آج ان کی تکلیف پر بے چینی اور اضطراب نہ محسوس کرے اور انھیں اس سے نکالنے کی اپنی سی جدوجہد نہ کرے۔ اگر داعیِ دین کے اندر انسانوں کی تکلیف پر جذبۂ رحم نہیں ابھرتا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی دعوت میں مخلص نہیں ہے، اگر وہ دنیا والوں کے سامنے ان کے خیر خواہ کی حیثیت سے آئے گا تو اپنا ایک فرض ادا کرے گا اور اس کی باتوں میں ایک طرح کی مقناطیسیت اور کشش پیدا ہوجائے گی۔ اس کی دعوت کو لوگ توجہ سے سنیں گے اور اس کی طرف مائل ہوں گے۔ اس طرح انفاق کے ذریعے داعی اپنا فرض بھی پورا کرے گا اور اس دعوت کے لیے بھی راہ ہموار کرے گا، جس کا وہ علم بردار ہے۔

ہم سفر رفیقوں کے ساتھ ہم دردی

داعی دین کے لیے ان افراد کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے جو اس کے ساتھ مل کر دعوتی کام میں ایک جماعت بن گئے ہیں۔ ان میں نادار اور مفلس بھی ہوں گے، کم زور اور بے سہارا بھی ہوں گے اور ایسے بھی ہوں گے جو وسائل کے محتاج ہیں۔ جماعت کے استحکام کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اصحابِ ثروت ان لوگوں کا تعاون کریں، جن کو اس کی ضرورت ہے، جو اپنی خستہ حالی کی وجہ سے جماعت کی رفتار کا ساتھ نہیں

دے پا رہے ہیں۔ جماعت کے اندر جو اصحابِ حیثیت ہیں اور جن کو اللہ تعالیٰ نے وسعت اور کشائش عطا کی ہے، انھیں یہ حقیقت نہیں بھولنی چاہیے کہ ان کا تعلق دین کی خدمت کرنے والی جماعت سے ہے۔ اس کے افراد کے درمیان الفت ومحبت کا وہ رشتہ ہونا چاہیے جو بھائیوں کے درمیان ہوتا ہے۔ انھیں اپنے ہم سفر رفقاء کے دکھ درد میں اس طرح شریک ہونا چاہیے، جس طرح خاندان کے افراد ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں۔ جو شخص اس حال میں زندگی گزارے کہ اس کو اپنے ساتھیوں کی تکلیف اور راحت کا خیال نہ ہو تو اس کے بارے میں یہی کہا جائے گا کہ اس کے اندر اجتماعیت کا احساس ابھی نہیں ابھرا ہے۔

داعیانِ دین کا تعاون

اسی طرح ان لوگوں کا معاملہ بھی ہے جو دین کی دعوت اور اس کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کے اوقات اس کے لیے فارغ ہیں۔ اس وجہ سے وہ اپنے معاش کی طرف توجہ نہیں کر پاتے۔ ان کے وسائل و ذرائع ایسے نہیں ہیں جو انھیں معاش سے بے فکر کردیں۔ وہ کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا سکتے کہ یہ ان کی خودداری اور عزتِ نفس کے خلاف ہے۔ کارِ دعوت کو جاری رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اصحابِ ثروت ان کی ضروریات کا خیال کریں، انھیں یکسوئی فراہم کریں۔ جب میدانِ کارزار گرم ہو تو کچھ لوگ میدانِ جنگ میں اپنی جان لڑاتے ہیں، زیادہ تر وہ ہوتے ہیں جو محاذ جنگ پر نہیں ہوتے، لیکن ان کا تعاون جاں بازوں کو حاصل ہوتا ہے، اس سے ان کی ہمت اور حوصلہ بڑھتا ہے اور وہ پورے جوش کے ساتھ پیش قدمی جاری رکھ پاتے ہیں۔ اس کے بغیر فتح و کامرانی سے ہم کنار ہونا مشکل ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے اور ان کا تعاون کرنے والے اجر وثواب میں برابر کے شریک ہوں گے۔

حضرت زید بن خالد رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جس نے کسی مجاہد کو ساز و سامان سے لیس کیا اس نے بھی جہاد کیا، جس

نے کسی مجاہد کی عدم موجودگی میں اس کی بیوی بچوں کی نگہ داشت کی اور ان کی ضروریات پوری کیں تو اس نے بھی جہاد کیا۔"[1]

جہاد کا مفہوم بڑا وسیع ہے۔ اس میں دین کی دعوت و تبلیغ بھی آتی ہے، بلکہ سب سے پہلے آتی ہے۔ اسی سے دین کی سربلندی کی راہیں کھلتی ہیں۔ جو لوگ دین کی دعوت اور اس کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں وہ بہت بڑی مہم سر انجام دے رہے ہیں۔ ان کا تعاون کرنے والے بھی عملاً اس میں شریک ہیں۔ وہ عملاً سامنے نہیں ہیں، لیکن ان کی پشت پناہی اور حمایت داعیانِ دین کو حاصل ہے۔ اس لیے امید ہے کہ اللہ کے یہاں اجر و ثواب میں وہ بھی شریک و سہیم ہوں گے۔

دعوت کی مالی ضروریات کی تکمیل

یہ دنیا اسباب و وسائل کی دنیا ہے۔ بغیر اسباب کے یہاں کوئی مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ جو شخص اللہ کے دین کی دعوت لے کر اٹھے اور اسے کامیاب بھی دیکھنا چاہے اس کے لیے اسے ضروری اسباب و وسائل بھی اختیار کرنے ہوں گے۔ ان میں بہت سے وہ وسائل بھی ہوں گے، جن کا تعلق روپے پیسے سے ہے۔ اس کے بغیر وہ فراہم نہیں ہوسکتے۔ اللہ کا دین دعوت و تبلیغ کے لیے اسباب کا طالب ہو اور آپ یہ اسباب فراہم کرنے کی حیثیت میں ہونے کے باوجود مہیا نہ کریں تو یہ آپ کے دین و ایمان کے منافی عمل ہوگا۔

اسلام کی دعوت و تبلیغ اور اس کی سربلندی کی جدوجہد جن مادی وسائل کا تقاضا کرتی ہے وہ اگر فراہم نہ ہوں تو وہ جماعت اور تنظیم کم زور ہوگی جو اس مقصد کے لیے کام کر رہی ہے۔ وہ اپنی قوت و توانائی کھوتی چلی جائے گی اور حریف طاقتیں اپنے وسائل کے استعمال سے مضبوط سے مضبوط تر ہوتی اور طاقت پکڑتی رہیں گی۔ یہ کسی فردِ واحد کا نہیں، بلکہ ایک جماعت کا نقصان ہے۔ اسے ایک اور پہلو سے بھی دیکھا

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب فضل من جهز غازیا او خلفه بخیر۔ صحیح مسلم، کتاب الجهاد

جاسکتا ہے۔ وہ یہ کہ کارِ دعوت پوری امت کی ذمے داری ہے۔ اگر یہ انجام نہ پائے تو پوری امت سخت خسارے سے دوچار ہوگی۔ یہ اپنے ہاتھوں اپنی ہلاکت کا سامان کرنا ہے۔ اسی سیاق میں قرآن مجید نے کہا ہے:

وَ اَنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ لَا تُلۡقُوۡا بِاَیۡدِیۡکُمۡ اِلَی التَّہۡلُکَۃِ ۚۖۛ وَ اَحۡسِنُوۡا ۚۛ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۱۹۵﴾ (البقرۃ:۱۹۵)

اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور خود کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں مت ڈالو اور احسان کرو۔ بے شک اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

آج دنیا مادی لحاظ سے بہت ترقی کرچکی ہے۔ اس کے پاس کسی بھی نظریے کے پھیلانے اور اسے غالب و سربلند کرنے کے اتنے وسیع اور طاقت ور ذرائع موجود ہیں جو اس سے پہلے کبھی نہیں تھے۔ ان ذرائع کو اللہ کے دین کی تبلیغ و اشاعت اور اس کے غلبہ و برتری کی راہ میں صرف ہونا چاہیے، لیکن افسوس کہ وہ کفر و الحاد اور بدی کے پھیلانے اور نیکی کے مٹانے میں استعمال ہورہے ہیں۔ آج کسی بھی خادمِ دین میں یہ طاقت نہیں ہے کہ وسائل و ذرائع کا رخ موڑ دے اور ان کو دعوتِ دین کی راہ میں لگادے۔ ہاں! وہ یہ کرسکتا ہے کہ اس کے پاس جو بھی وسائل ہیں، ان کو اللہ کے دین کے لیے وقف کردے۔ بلاشبہ یہ وسائل بہت ہی کم ہوں گے، لیکن اللہ تعالیٰ نے چاہا تو اس کا دین ان محدود وسائل و ذرائع کے باوجود کامیاب اور باطل طاقتیں اپنے وسیع وسائل کے باوجود ناکام ہوں گی۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَہُمۡ لِیَصُدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ فَسَیُنۡفِقُوۡنَہَا ثُمَّ تَکُوۡنُ عَلَیۡہِمۡ حَسۡرَۃً ثُمَّ یُغۡلَبُوۡنَ ۬ؕ (الانفال:۳۶)

جن لوگوں نے اللہ کا انکار کیا وہ اپنا مال اللہ کے راستے سے روکنے کے لیے صرف کررہے ہیں۔ پس وہ اسے خرچ کریں گے، مگر یہ ان کے لیے پچھتاوے کا سبب ہوگا، پھر وہ مغلوب ہوں گے۔

ایک اور موقعے پر فرمایا کہ اللہ کے منکر اور باغی نام و نمود، ستائش اور مفاخرت

کے جذبہ سے یا اللہ کے دین کو نقصان پہنچانے کے لیے جو کچھ خرچ کر رہے ہیں، وہ ایسے رائیگاں جائے گا جیسے کھیتی کو پالا مار جائے۔ یہ اپنی غلط حرکتوں سے تباہ ہوں گے اور اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ ارشاد ہے۔

مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿١١٧﴾ (آل عمران: ۱۱۷)

جو لوگ اس دنیا کی زندگی میں خرچ کرتے ہیں، اس کی مثال ایسی ہے جیسے ہوا میں سخت سردی ہو اور وہ ایسی قوم کی کھیتی کو لگ جائے جس نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور اسے ختم کر کے رکھ دے۔ اللہ نے ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی، وہ خود ہی اپنے اوپر زیادتی کر رہے تھے۔

شدید ضرورت پر انفاق کی فضیلت

اللہ کا دین اس وقت بڑے نازک دور سے گزر رہا ہے۔ انسانوں پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی ہے۔ باطل تحریکیں اور فاسد نظریات ہر طرف پھیل رہے ہیں۔ خدا بے زاری اور آخرت فراموشی سارے عالم پر چھائی ہوئی ہے اور اللہ کے دین کو اس کے ماننے والوں تک نے اپنی زندگیوں سے بے دخل کر رکھا ہے۔ اس حالت میں کسی کا اپنے پیسے سے دین کو تقویت پہنچانا بڑی ہی قدر و قیمت رکھتا ہے۔ عام حالات میں بھی اگر کوئی شخص اللہ کے دین کے لیے کچھ خرچ کرتا ہے تو اس کا بڑا اجر ہے، لیکن اس سے کہیں زیادہ اجر و ثواب کا وہ اس وقت مستحق ہوگا جب کہ دین بے حد مظلوم ہو اور حمایت و نصرت کے لیے اسے آواز دے رہا ہو۔ قرآن مجید نے صاف الفاظ میں کہا ہے کہ جس طبقے نے فتحِ مکہ سے پہلے اللہ کی راہ میں انفاق کیا اور جس نے فتح مکہ کے بعد خرچ کیا دونوں برابر نہیں ہوسکتے۔ پہلے طبقہ نے اس وقت اپنا تعاون پیش کیا، جب کہ اللہ کے دین کو اس کی بے حد ضرورت تھی اور دوسرے گروہ کا تعاون اس وقت حاصل ہوا جب کہ اسلامی ریاست کا پرچم پورے حجاز پر لہرا رہا تھا۔ ارشاد ہے:

لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ قٰتَلُوْا ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۰﴾ (الحدید:۱۰)

تم میں سے جن لوگوں نے فتح مکہ سے پہلے اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور اس کے دشمنوں سے لڑے، وہ ان لوگوں کے برابر نہیں ہیں جنھوں نے فتح مکہ کے بعد خرچ کیا اور دشمنوں سے لڑے (بلکہ پہلے گروہ کا) اجر دوسرے گروہ کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے اور ہر ایک سے اللہ نے بھلائی کا وعدہ کیا ہے اور اللہ جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے باخبر ہے۔

فتحِ مکہ کے بعد جو اصحاب ایمان لائے اور قربانیاں دیں ایک موقع پر رسولؐ نے ان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ''میرے ساتھیوں (فتح مکہ سے پہلے ایمان لانے والوں) کی شان میں کوئی نامناسب بات نہ کہو۔ تم میں سے کوئی احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کردے تو بھی انھوں نے ایک مُدّ (دو رطل) یا آدھا مُد جو خرچ کیا اس کے برابر نہیں ہوسکتا۔''[1]

تھوڑا مال خرچ کرنے کا حکم

قرآن و حدیث میں کہیں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ مال کا حاصل کرنا اور رکھنا گناہ ہے اور نہ یہ ہدایت کی گئی ہے کہ انسان اپنا پورا مال اللہ کی راہ میں خرچ کر دے بلکہ اپنے مال کا ایک حصہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم ہے۔

اہل ایمان کی یہ خوبی قرآن مجید کے متعدد مقامات پر بیان ہوئی ہے۔

وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳﴾ (البقرۃ:۳)

اور جو کچھ ہم نے دیا ہے اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں۔

اس میں سب سے پہلے تو زکوٰۃ آتی ہے۔ صدقاتِ واجبہ کا بھی یہی حکم ہے۔ جب کوئی صدقہ ازروئے شرع واجب ہوجائے تو اس کا ادا کرنا لازم ہے۔ اسی طرح

---

[1] صحیح بخاری، کتاب اصحاب النبی، صحیح مسلم۔ کتاب فضائل الصحابۃ، باب تحریم سبّ الصحابۃ

بیوی بچوں اور متعلقین کا نان نفقہ بھی اس میں شامل ہے۔ ان کی مادّی ضروریات کا پورا کرنا اور ان کے مالی حقوق کا ادا کرنا ضروری ہے۔

اللہ کی راہ میں دولت لٹانے والے

انسان جب اللہ کے حکم سے اپنا مال ان مدات میں خرچ کرتا ہے جو فرض اور واجب ہیں تو اس کے اندر ان مدات پر بھی خرچ کرنے کا جذبہ ابھرتا ہے جو فرض نہیں ہیں۔ وہ فرض کے ادا کردینے ہی پر قانع نہیں ہوتا، بلکہ نفل کی سعادت سے بھی بہرہ مند ہونا چاہتا ہے۔ وہ انفاق کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتا، بلکہ ہر اس موقعے پر اپنی دولت خرچ کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے، جب اللہ کا دین اس سے خرچ کرنے کا تقاضا کرے۔ اس طرح آدمی اپنی تھوڑی سی دولت دے کر اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ اس کی پوری دولت اللہ کی ہے اور جب بھی اس کے دین کو ضرورت ہوگی وہ بے دریغ اس کے لیے صرف ہوگی۔ اگر یہ جذبہ کسی کے اندر ابھر آئے تو اس کے لیے ناممکن نہیں ہے کہ اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں لٹا دے اور خالی ہاتھ گھر چلا آئے۔ اس کی مثالیں ہماری تاریخ میں موجود ہیں۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں (غزوۂ تبوک کی تیاری جاری تھی) رسول اللہ ﷺ نے ہم لوگوں کو انفاق کا حکم دیا۔ اس وقت اتفاق سے میرے پاس کافی مال موجود تھا، میں نے خیال کیا کہ آج، بس! ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بازی لے جانے کا موقع ہے۔ چناں چہ میں اپنا آدھا مال لے کر رسول ﷺ کی خدمت میں پہنچ گیا۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ گھر والوں کے لیے کیا چھوڑا ہے؟ میں نے عرض کیا اتنا ہی ان کے لیے بھی چھوڑ آیا ہوں۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ اپنا پورا ہی مال لے کر حاضر ہوگئے، آپ نے ان سے بھی یہی دریافت فرمایا کہ گھر والوں کے لیے کیا چھوڑا ہے؟ انھوں نے عرض کیا ان کے لیے اللہ اور رسول کو چھوڑ آیا ہوں۔ اس پر میں نے کہا کہ ابوبکرؓ سے میں کسی معاملے میں آگے نہیں بڑھ سکتا۔[1]

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، باب ۴۰ الرخصۃ فی ذٰلک۔ جامع الترمذی، کتاب المناقب

غزوۂ تبوک ہی کے موقعے پر رسول اللہ ﷺ نے انفاق کی ترغیب دی تو حضرت عثمانؓ کھڑے ہوئے اور فرمایا: اے اللہ کے رسول! میرے ذمے سو اونٹ ہیں، میں انھیں پشت پر ڈالے جانے والے کپڑوں اور کجاووں کے ساتھ فراہم کروں گا۔ دوبارہ آپ نے ترغیب دی تو حضرت عثمانؓ کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ میں اس طرح کے دو سو اونٹ کی ذمے داری لیتا ہوں۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مزید ترغیب دی تو حضرت عثمانؓ نے کہا کہ میں تین سو اونٹ کی ذمے داری لیتا ہوں۔ حدیث کے راوی حضرت عبدالرحمٰن بن خبابؓ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ منبر سے یہ کہتے ہوئے اترے کہ اس کے بعد عثمان کچھ بھی کریں انھیں کوئی نقصان نہ ہوگا۔ (یعنی اس کے بعد ان سے کوئی غلطی سرزد ہو بھی جائے تو اللہ تعالیٰ اس عظیم خدمت کے عوض انھیں معاف فرما دے گا)۔[1]

عبدالرحمٰن بن ابوسمرہؓ اسی غزوے کا ذکر کرتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ اپنی آستین میں ایک ہزار دینار لائے اور رسول اللہ ﷺ کے دامن میں ڈال دیے۔ میں نے دیکھا کہ آپ انھیں الٹ پلٹ رہے تھے اور بار بار فرما رہے تھے کہ عثمان آج کے بعد کچھ بھی کریں انھیں نقصان نہ ہوگا۔[2]

---

[1] جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب فی مناقب عثمان بن عفان

[2] جامع ترمذی، حوالہ سابق، مسند احمد، ۶۳/۵

قربانی

انسانوں کے محسن قربانی دیتے ہیں

دنیا میں جو لوگ نوعِ انسانی پر کسی قسم کا احسان کرتے ہیں وہ ہم ہی جیسے انسان ہوتے ہیں، ہماری ہی طرح جذبات و احساسات رکھتے ہیں، ان کی بھی خواہشیں ہوتی ہیں، ان کو بھی جان و مال سے محبت ہوتی ہے، لیکن وہ اس لیے انسانوں کے محسن سمجھے جاتے ہیں کہ وہ ان کے فائدے کے لیے اپنے جذبات و احساسات کی مسلسل قربانی دیتے ہیں۔ وہ خود کو فنا کر لیتے ہیں تا کہ دوسرے زندگی پا سکیں، ان کا سینہ ظلم کے تیروں سے چھلنی ہو جاتا ہے اور وہ خوشی سے ظلم سہتے ہیں تا کہ ان کی ذات پر دنیا کا سارا ظلم ختم ہو جائے اور ان کے بعد کوئی کسی پر ظلم نہ کر سکے، وہ بھوکے رہتے ہیں اور فقر و فاقہ ان کی قوتوں کو کم زور کر دیتا ہے تا کہ دنیا فقر و فاقہ کی مار سے محفوظ رہے۔

اسلام کی دعوت قربانی چاہتی ہے

جب ہم اسلام کی دعوت کے لیے اٹھے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نوعِ انسانی کے ساتھ سب سے بڑی بھلائی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ کارِ عظیم صحیح معنی میں اسی وقت انجام پائے گا جب کہ ہم اس کے پیچھے اپنے آپ کو گھلا دیں، اس کے لیے اپنی آسائش و راحت کو، اپنے وقت اور اپنے لمحاتِ حیات کو، اپنے مال اور دولت کو غرض

ہر اس چیز کو قربان کر دیں جس کے ہم مالک ہیں۔ اس کے بغیر اس کام کا حق نہ پہلے ادا ہوا ہے اور نہ اب ادا ہو سکے گا۔

مشکل حالات میں بھی دعوت جاری رہے

یہ بات بار بار آپ کے سامنے آ چکی ہے کہ جس دین کو آپ نے حق سمجھ کر قبول کیا ہے، اس کی تبلیغ فرض ہے، اسے بہرحال دوسروں تک پہنچانا ہے۔ حق کو ماننے کے بعد کوئی چیز اس کے اظہار میں مانع نہیں ہونی چاہیے۔ ورنہ یہ اپنی بزدلی کا ثبوت اور حق کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہوگا۔ آپ اللہ تعالیٰ کے دین کے جب داعی ہیں تو آپ کی پوری زندگی داعی کی حیثیت سے بسر ہونی چاہیے۔ آپ کی دعوت سننے کے لیے جب تک دنیا میں انسان موجود ہیں آپ ان کو خدا پرستی کی دعوت دیتے رہیں گے، خواہ اس میں آپ کا سب کچھ چھن جائے اور آپ پر مظلومیت کا عالم چھا جائے، حتیٰ کہ آپ کے جسم و جان کا وہ رشتہ بھی کٹ جائے، جس کا کٹنا دنیا کے ہر شخص کو ناگوار گزرتا ہے۔ خدانخواستہ اگر کبھی وہ وقت بھی آ جائے کہ آپ آزادی سے، جو آپ کا فطری اور قانونی حق ہے محروم کر دیے جائیں اور آپ کو حق کہنے کی اجازت نہ ہو، یا آپ کے اور خدا کی مخلوق کے درمیان قید و بند کی دیواریں حائل ہو جائیں تو آپ کے سامنے یوسف علیہ السلام کا اسوہ ہونا چاہیے، جو بتاتا ہے کہ حصارِ قید بھی دعوتِ حق کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ آپ کو اسی اسوہ پر عمل کرنا ہوگا۔ حضرت یوسف علیہ السلام سے ان کی آزادی چھین لی گئی اور قید کر دیا گیا تو قید خانہ کی فضا دعوتِ حق سے گونجنے لگی، اگر آزاد انسانوں تک ان کی آواز نہیں پہنچ سکتی تھی تو مجرم قیدیوں کو انھوں نے اپنا پیغام سنانا شروع کر دیا:

یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿٣٩﴾ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ	اے قید خانہ کے دونوں رفیقو! بتاؤ کیا بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ خدا جو اکیلا ہے اور سب پر غلبہ رکھتا ہے، اس خدا کو چھوڑ کر تم

اٰبَآؤُکُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

(یوسف:۳۹،۴۰)

جن کی بندگی کرتے ہو وہ تو محض چند نام ہیں جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کے حق میں کوئی سند نہیں نازل کی ہے۔ حکومت تو صرف اللہ کے لیے ہے، اس کا حکم ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی سیدھا طریقۂ زندگی ہے، لیکن بیش تر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

قربانی سے دین غالب ہوگا

آپ کے سامنے بہت بڑا مقصد ہے، آپ اس زمین پر اللہ کی حکومت دیکھنا چاہتے ہیں، اتنے بڑے مقصد کو آپ اسی وقت حاصل کر سکتے ہیں جب کہ آپ اپنا تمام سرمایۂ حیات اس میں لگا دیں اور اپنی ان تمام مصروفیات اور مشاغل سے دست کش ہوجائیں جو اس مقصد کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ جس دن آپ کی یہ قربانیاں اپنی آخری حد کو پہنچ جائیں گی، یقین ہے کہ اسی دن حق کی کامیابی کی علامات بھی نمودار ہونے لگیں گی۔ گرمی جب حد سے بڑھ جاتی ہے اور زمین تپنے لگتی ہے تو بارش ہوتی ہے۔ رات کی تاریکی جب اپنے شباب کو پہنچ جاتی ہے تو صبح کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ اگر حالات سخت ہیں تو اس سے مایوس اور ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں۔ حالات کی سختی ہمیشہ اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اب تبدیلی آنے والی ہے اور حالات بدلنے والے ہیں۔ ایسا بہت ہوا ہے اور اب بھی ہوسکتا ہے کہ انتہائی ناسازگار حالات میں حق کی آواز بلند ہوئی اور حالات کے خلاف لڑتے ہوئے کامیابی کے مقام تک پہنچ گئی، مخالفت کے طوفان اٹھے اور گزر گئے لیکن اس کو مٹا نہ سکے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ یوسفؑ مصر قید خانے کی تاریک کوٹھری سے تختِ حکومت پر پہنچا دیے گئے۔ قوم موسیٰ اپنے ضعف اور بے بسی کے بعد 'ارض مقدس' کی وارث بنائی گئی اور محمد ﷺ کو حق کی مظلومیت

نے مکہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا، لیکن پورے دس سال بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ حق کی کامیابی کا رجز پڑھتے ہوئے آپؐ حرم کعبہ میں داخل ہوئے:

لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ وَحْـدَهٗ اَنْجَـزَ وَعْـدَهٗ وَ نَصَرَ عَبْـدَهٗ وَ هَـزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ[1]

خدائے واحد کے سوا کوئی معبود نہیں، اس نے اپنا وعدہ پورا کیا، اپنے بندے کی مدد کی اور تنہا باطل کے تمام لشکروں کو شکست دی۔

یہ حق کی تاریخ کی مثالیں ہیں۔ اگر آپ کے اندر حالات سے لڑنے کا عزم ہے تو یہ مثالیں آج بھی دہرائی جاسکتی ہیں۔ یہاں کامیابی اربابِ عزیمت کے لیے لکھی جاچکی ہے، اگر آپ یہ فیصلہ کرچکے ہیں کہ حق کے لیے جینا اور مرنا ہے اور حق کے لیے آپ اپنا سب کچھ لٹا سکتے ہیں، تو وہ دن دور نہیں جب کہ آپ اللہ کی زمین پر اپنی آنکھوں سے وہ تاب ناک منظر بھی دیکھ لیں جو دیکھنا چاہتے ہیں۔

وَ اُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَتْحٌ قَرِیْبٌ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۳﴾ (الصف:۱۳)

اللہ تعالیٰ جنت کے سوا ایک دوسری چیز بھی تمھیں دے گا، جسے تم چاہتے ہو اور وہ ہے اللہ کی مدد اور ’فتح قریب‘ اور تم اہل ایمان کو خوش خبری دے دو۔

جدوجہد ہی سے نتائج رونما ہوں گے

یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ یہ دنیا عمل کی دنیا ہے، یہاں عمل کے بعد ہی اس کا نتیجہ ظاہر ہوتا ہے۔ بغیر عمل کے نتیجہ کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اگر آپ نے عمل چھوڑ دیا اور بے دست و پا بن کر بیٹھ گئے تو گویا نتیجہ کا دروازہ بند کر دیا۔ کوشش اور جدوجہد کے بعد تو حق کامیاب ہوسکتا ہے لیکن بغیر کوشش کے کام یابی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ راہِ حق میں جب آپ کی سعی و جہد اپنی تمام شرائط پوری کردے گی تو اللہ کے قانون کے تحت اپنے نتائج بھی ضرور پیدا کرے گی۔ بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جن کے نتائج فوراً ظاہر ہو جاتے ہیں لیکن بعض کام اپنے نتائج کے ظہور کے لیے ایک

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الحج، باب حجة النبی صلی اللہ علیه وسلم

لمبی مدت چاہتے ہیں۔ ان کاموں کے انجام دینے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کا حوصلہ انتہائی بلند ہو، وہ جلد بازی نہ کرے اور صبر و ثبات کی روش اختیار کرے۔ اگر آپ دعوتِ حق کا آغاز کر چکے ہیں تو ساتھ ہی اس کی کامیابی کا بیج بھی بو چکے ہیں۔ اب اپنا خونِ جگر اس پر چھڑک دیجیے، یقین ہے کہ یہ بیج ضائع نہ جائے گا، دیر سویر اپنا پھل ضرور لائے گا اور آپ اس کے اجر سے محروم نہیں رہیں گے۔

فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۭ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا (النساء: ۷۴)

جن لوگوں نے اپنی دنیا کی زندگی کو آخرت کے عوض فروخت کر دیا ہے، انھیں اللہ کی راہ میں لڑنا چاہیے، جو شخص اللہ کی راہ میں لڑے، خواہ وہ مارا جائے یا غلبہ پائے ہم اس کو ضرور اجرِ عظیم دیں گے۔

یہ بات جہاد کے سلسلے میں کہی گئی ہے۔ اسی پر دعوتِ دین اور غلبۂ دین کی جدوجہد کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہ یہ بھی ایک طرح کا جہاد ہی ہے۔

آج دین قربانی کا طالب ہے

آج اللہ تعالیٰ کا دین بے حد مظلوم ہے۔ وہ آپ کی نصرت چاہتا ہے۔ وہ آپ کی عمدہ صلاحیتیں چاہتا ہے۔ وہ آپ کا بہترین وقت اور مال چاہتا ہے۔ وہ آپ کی نیند، آپ کی راحت اور آپ کا سکون چاہتا ہے۔ وہ دن بڑا مبارک دن ہوگا جب کہ ہم دین کے اس مطالبہ کو پورا کرنے کا فیصلہ کریں گے۔ وقت تیزی سے گزر رہا ہے اور موت ہر شخص کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ نہیں معلوم کل جو سورج طلوع ہونے والا ہے وہ ہم میں سے کس کو کہنے اور کس کو سننے کے لیے باقی رکھے۔ خوش نصیب ہے وہ جو اپنے آج کو کل کے انتظار میں ضائع نہ کرے اور اس سے پہلے کہ موت اس سے فیصلہ کا حق چھین لے، دین کی حمایت و نصرت کے لیے کھڑا ہو جائے۔

اخلاص۔ روحِ دین

اخلاص روحِ دین ہے۔ کوئی چیز میل کچیل اور آلائش سے صاف کر دی جاتی ہے تو وہ خالص ہوتی ہے۔ دین بھی باطل افکار و خیالات اور غلط جذبات و محرکات کی گندگیوں سے پاک ہو تو وہ خالص رہتا ہے۔ ورنہ بسا اوقات اس کی شکل وصورت اور ہیئت ہی مسخ ہوجاتی ہے اور وہ لازماً اپنی حقیقی روح کھو دیتا ہے۔ اخلاص میں کسی چیز کو منتخب اور پسند کرنے کے معنی بھی ہیں۔ اللہ کا مخلِص (لام پر زیر) بندہ وہ ہے جو اپنے فکر وعمل میں اس کی ہدایات کا پابند اور اس کی مرضی کا طالب ہو، اس کے سوا کوئی دوسری غرض اس کی نہ ہو۔ بندۂ مخلَص (لام پر زبر) وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ خاص کرلے۔ اسے فکری و عملی ہر طرح کی آلائشوں سے پاک کردے اور اپنی عنایات کا مستحق قرار دے۔ اسی پہلو سے قرآن مجید میں پیغمبروں کو "مخلَصین" کہا گیا ہے۔

عقیدہ کا اخلاص

اخلاص عقیدہ وعمل دونوں میں لازم ہے۔ عقیدہ کا اخلاص یہ ہے کہ آدمی توحید کا قائل ہو، اللہ تعالیٰ کو واحد اور یکتا مانے، اس کی ذات وصفات اور اعمال میں کسی کو اُس کا شریک وسہیم نہ قرار دے۔ قرآن مجید کی فکری اساس ہی توحید ہے۔ اسی محور کے گرد اس کی ساری تعلیمات گردش کرتی ہیں۔ اس نے توحید کا اتنا واضح اور بے آمیز تصور پیش کیا ہے کہ شرک کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہ گئی ہے۔ وہ پوری وضاحت اور زور وقوت کے ساتھ بار بار اعلان کرتا ہے:

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾ (البقرہ:۱۶۳)

تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ بڑا مہربان اور بے حد رحم کرنے والا ہے۔

آیت الکرسی قرآن مجید کی سب سے عظیم آیت ہے۔ اس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ (البقرہ:۲۵۵)

اللہ تعالیٰ کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندہ اور سب کو تھامے ہوئے ہے۔

توحید کی شہادت اللہ کی پیدا کردہ یہ پوری کائنات دے رہی ہے۔ اس نظام کو چلانے والے فرشتے اور اصحابِ علم وفکر دے رہے ہیں۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾ (آل عمران:۱۸)

اللہ نے شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور فرشتوں نے اور علم والوں نے بھی یہی شہادت دی ہے۔ اللہ وہ ہے جو عدل و قسط کو نافذ کیے ہوئے ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہ غالب ہے اور حکمت والا ہے۔

سورۂ اخلاص میں توحید کے اعلان کے ساتھ مشرکانہ عقائد کی تردید بھی ہے۔ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات سب سے بلند و برتر اور ہر طرح کے احتیاج سے پاک ہے۔ سب اس کے تابع اور محتاج ہیں، وہ سب کا ملجا و ماویٰ ہے۔ اس کا کوئی خاندان نہیں جس میں خدائی کا سلسلہ چل رہا ہو۔ وہ اول و آخر یکتا اور منفرد ہے۔ کوئی اس کا مثیل اور نظیر نہیں ہے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴿۱﴾ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ﴿۲﴾ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ﴿۳﴾ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ﴿۴﴾ (الاخلاص)

کہہ دو وہ اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے، اس نے کسی کو جنا نہیں اور نہ کسی نے اسے جنا (وہ کسی کا باپ یا بیٹا نہیں ہے) اور نہ کوئی اس کا ہم سر اور شریک ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات میں وہ تمام خوبیاں اور کمالات ہیں جن کا ہم تصور کر سکتے ہیں۔ سارے 'اسماء حسنیٰ' اس کے ہیں۔ یہ اس کی صفات ہیں۔ اس کا ہر نام اس کی کسی خوبی کو ظاہر کرتا ہے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۝ (طٰہٰ:۸)

وہ اللہ ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اس کے لیے تمام اسماء حسنیٰ ہیں۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ (بنی اسرائیل:۱۱۰)

کہو، اللہ کے نام سے پکارو یا رحمٰن کے نام سے پکارو۔ جس نام سے پکارو سب اچھے نام اسی کے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ذات ہر طرح کے نقائص اور عیوب سے منزّہ اور مبرّا ہے۔ مشرکین نے اللہ تعالیٰ کو اس کی مخلوقات پر قیاس کر کے وہ ساری کم زوریاں اس کی طرف منسوب کردی ہیں جو ان میں پائی جاتی ہیں۔ اللہ کی ذات ان سب سے پاک، برتر و بلند تر ہے:

سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ (الزخرف:۸۲)

پاک ہے آسمان اور زمین کا رب اور عرش کا رب ان باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔

ایک اور جگہ فرمایا:

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ۚ وَ سَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۝ۚ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (الصافات:۱۸۰-۱۸۲)

پاک ہے تمھارا رب، جو عزت اور غلبہ والا ہے۔ ان باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں اور سلامتی ہے رسولوں پر۔ ساری حمد ہے اللہ کے لیے جو تمام عالم کا پروردگار ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے پیغمبروں کے ذریعے توحید کی جو تعلیم ملی ہے وہی برحق ہے۔ اسی میں سلامتی اور نجات ہے۔ جو شرک کی راہ اختیار کرے، اس کی نجات کی کوئی سبیل نہیں ہے۔

عقیدۂ توحید کو ماننے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس بات پر صدقِ دل سے ایمان ہو کہ اللہ تعالیٰ کی ذات قدیم اور ازلی و ابدی ہے، وہ حیّ وقیّوم ہے۔ وہ زمین و آسمان اور پوری کائنات کا خالق ہے۔ وہی اس کا مالک ہے۔ یہاں کی ہر چیز اُسی کی ملکیت ہے۔ وہی اس کائنات کا مدبر و منتظم ہے۔ وہی اسے چلا رہا ہے۔ وہ رب العالمین اور تمام مخلوقات کا پروردگار ہے۔ وہی سب کا رازق، حاجت روا اور مشکل کشا ہے۔ وہی موت و حیات کا مالک ہے۔ وہ علیم وخبیر اور ظاہر و باطن کا جاننے والا ہے۔ وہ رحمٰن و رحیم ہے۔ نفع وضرر اُسی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جسے نفع پہنچانا چاہے اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا اور جسے نقصان پہنچانا چاہے اُسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ اس کے اختیارات غیر محدود ہیں۔ وہ جو چاہے آنِ واحد میں ہو جاتا ہے۔ اس کے فرشتے کائنات میں ہر جگہ موجود ہیں اور بے چوں و چرا اُس کے حکم کی تعمیل میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ شارع اور قانون ساز ہے۔ وہ حاکم حقیقی اور فرماں روائے مطلق ہے۔ اس نے انسانوں کی ہدایت کے لیے رسول مبعوث فرمائے، کتابیں نازل کیں، اپنے احکام و فرامین بھیجے۔ محمد ﷺ اللہ کے آخری رسول اور قرآنِ مجید اس کی آخری کتاب ہے۔ اس میں قیامت تک نوعِ انسانی کی ہدایت کا سامان ہے۔ وہ عادل و منصف او رمحاسب و مجازی ہے۔ اس کے حکم سے ایک روز، قیامت برپا ہوگی اور ہر انسان کو اُس کے عمل کے مطابق ابدی جزا یا سزا ملے گی۔

اللہِ واحد پر ایمان لانے کے بعد اس کی اُن تمام صفات کو لازماً ماننا ہوگا، جو قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں اور یہ بھی ماننا ہوگا کہ ان صفات کی حامل اللہ کے سوا کوئی دوسری ہستی نہیں ہے۔ وہ اپنی ذات و صفات میں وحدہٗ لاشریک ہے۔ اسی سے آدمی کے ایمان میں اخلاص پیدا ہوگا۔

عمل کا اخلاص

یہی اخلاص عبادت میں بھی لازم ہے۔ اس میں شرک کی کسی آمیزش کو اسلام گوارا نہیں کرتا۔ کس قدر واضح فرمان ہے:

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ (الزمر:۲)	بے شک ہم نے آپ پر حق کے ساتھ کتاب نازل کی ہے۔ پس آپ اللہ کی عبادت، اس کے لیے دین کو خالص کر کے کیجیے۔

سورۂ زمر کی ابتدا ہی میں یہ آیت آئی ہے۔ اسی سورہ میں کچھ آگے چل کر رسول اللہ ﷺ کو اسی اخلاص کے اعلان کی ہدایت ہے:

قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهُ دِيْنِيْ ۝ (الزمر:۱۱-۱۴)	آپ کہہ دیجیے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی عبادت اس کے لیے دین کو خالص کرتے ہوئے کروں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سب سے پہلا فرماں بردار بنوں، کہہ دیجیے کہ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے دن (قیامت) کے عذاب کا ڈر ہے۔ کہہ دیجیے کہ میں تو اللہ کی عبادت اپنے دین کو اس کے لیے خالص کرتے ہوئے کرتا ہوں۔

ان آیات میں حکم ہے اللہ تعالیٰ کی عبادت کا، اس بات کا کہ اللہ تعالیٰ کی پرستش اور بندگی ہو، اس کی عظمت و بزرگی اور الوہیت کا تصور دل و دماغ پر چھایا رہے، اس کے سامنے عاجزی اور فروتنی اختیار کی جائے، اس کے لیے نماز، سجدہ، قربانی، دعا اور تسبیح و تہلیل ہو۔ ساتھ ہی یہ حکم بھی ہے کہ اسی کی اطاعت و فرماں برداری ہو، اس کے احکام و ہدایت پر عمل کیا جائے، اس کی نازل کردہ شریعت کی پابندی کی جائے۔ اس سے وہ تعلق ہو جو عبد اور معبود اور غلام اور آقا کا ہوتا ہے۔ اسی کا نام دین ہے۔ اخلاص یہ ہے کہ پورا دین اللہ تعالیٰ کے لیے ہو جائے۔ وہ ہر طرح کے شرک سے پاک ہو۔ اس میں غیر اللہ کا ذرّہ برابر حصہ نہ رہے۔ اسی وجہ سے قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے حکم کے ساتھ شرک سے دور رہنے کی ہدایت کی ہے۔ فرمان ہے:

وَ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ لَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا (النساء:۳٦)

اور اللہ کی عبادت کرو اور کسی چیز کو اس کے ساتھ شریک نہ کرو۔

اسلام کا جہاں یہ مطالبہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت ہو، وہیں وہ اس پر اصرار کرتا ہے کہ اس کائنات کی کسی بھی چھوٹی بڑی چیز کو اس کا شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ عبادت اس کے لیے خالص نہیں ہوگی۔ توحید کا براہِ راست اور لازمی تقاضا یہ ہے کہ عبادت اور اطاعت صرف اللہ کی ہو۔ کسی دوسرے کی اس میں قطعی ساجھے داری نہ ہو۔

...اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾ (الکہف:۱۱۰)

بے شک تمھارا معبود ایک معبود ہے۔ پس جو شخص اپنے رب سے ملنے کی توقع رکھتا ہے، وہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

اسلام عقیدہ اور عبادت میں ذرّہ برابر کسی شائبہ شرک کو برداشت نہیں کرتا۔ دامنِ توحید جس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور جس نے شرک سے وابستگی اختیار کی وہ جہنم کی راہ پر چل پڑا اور اللہ کی مغفرت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوگیا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾ (النساء:۴۸)

بے شک اللہ معاف نہیں کرے گا اس گناہ کو کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے۔ اس کے علاوہ جو دوسرے گناہ ہیں ان کا ارتکاب ہو تو جسے معاف کرنا چاہے معاف کر دے گا۔ جو اللہ کے ساتھ شرک کرے اس نے بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔

رِیا اخلاص کی ضد ہے

اخلاص کی ضد ریا ہے۔ ریا کے معنی نمود و نمائش اور دکھاوے کے ہیں۔ جہاں ریا پائی جائے گی وہاں اخلاص نہ ہوگا اور جس عمل کے پیچھے اخلاص ہوگا وہ ریا سے پاک

ہوگا۔ یہ دونوں جمع نہیں ہوسکتے۔ ریا سے اعمال کا حقیقی حسن ختم ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس وسیع و عریض دنیا میں انسان کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ اس کا عمل ہی نہیں 'حسنِ عمل' دیکھنا چاہتا ہے۔

لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (ہود:۷)

تاکہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کون اچھا عمل کرتا ہے۔

حسنِ عمل کی دو شرطیں بیان کی جاتی ہیں۔ پہلی شرط یہ کہ ٹھیک اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی ہدایت کے مطابق ہو اور دوسری شرط یہ کہ اس میں اخلاص ہو۔ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوش نودی کے لیے ہو، اس کے علاوہ اس کا کوئی دوسرا محرک نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں کسی عمل کا جائز اور درست ہونا ہی کافی نہیں بلکہ اس کے محرک کا صحیح ہونا بھی ضروری ہے۔ جب کوئی عمل، حسنِ عمل کی شکل اختیار کرلے گا تو اس کا اجروثواب کبھی ضائع نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس کی پوری پوری جزا عطا فرمائے گا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ۝ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ يَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّ اِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ نِعْمَ الثَّوَابُ وَ حَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ۝ (الکہف:۳۰،۳۱)

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے (انھیں ان کا اجر ضرور ملے گا) ہم کسی ایسے شخص کا اجر ضائع نہیں کرتے جس نے عمل اچھا کیا۔ ایسے لوگوں کے لیے ہمیشہ کے باغات ہوں گے۔ ان کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، وہاں انھیں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور وہ ریشم کے باریک اور موٹے ہرے رنگ کے کپڑے پہنیں گے۔ تختوں پر تکیے لگائے ہوں گے۔ کتنا اچھا بدلہ ہے اور کتنا اچھا آرام ہے۔

کسی بھی عمل کے پیچھے جذبۂ اخلاص کارفرما ہے یا وہ ریاکاری کے تحت انجام پا رہا ہے اس کا دار و مدار انسان کی نیت اور ارادہ پر ہے۔ اسی بنیاد پر وہ اللہ تعالیٰ کے

دربار میں شرفِ قبولیت حاصل کرے گا یا وہاں سے رد کر دیا جائے گا۔ حضرت عمرؓ کی مشہور روایت ہے۔ فرماتے ہیں:

سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَ اِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوٰى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ مَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلٰى دُنْيَا يُصِيْبُهَا اَوْ اِلٰى اِمْرَاَةٍ يَنْكِحُهَا فَهِجْرَتُهٗ اِلٰى مَا هَاجَرَ اِلَيْهِ[1]

میں نے رسول اللہؐ کو ارشاد فرماتے سنا ہے کہ اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔ ہر شخص کو وہی ملے گا، جس کی اس نے نیت کی۔ جس کسی نے اللہ اور اس کے رسول کی خاطر ہجرت کی تو واقعتاً اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف تھی۔ لیکن جس کی ہجرت دنیا کے حصول کے لیے یا کسی عورت سے شادی کرنے کے لیے تھی تو اس کی ہجرت اسی مقصد کے لیے تھی، جس کے لیے اس نے ہجرت کی۔ (اس کا کوئی اجر و ثواب اسے نہیں ملے گا)۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اعمال کی جزا و سزا کا انحصار انسان کی نیت پر ہے۔ اگر آدمی اللہ کی رضا کے لیے کام کرے تو وہ انعام و اکرام کا مستحق ہوگا اور اگر کوئی دنیوی غرض اس کے پیچھے کارفرما ہو تو اس پر کسی اجر و ثواب کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ ہجرت ایک مقدس اور ارفع و اعلیٰ عمل ہے۔ اس کے لیے بھی اخلاص شرط ہے۔ جس کسی نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہجرت کی ہو اسے بے پایاں اجر و ثواب سے نوازا جائے گا اور جس نے دنیا کمانے یا جنسی جذبہ کے تحت یہ قدم اٹھایا ہو تو ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے، لیکن کل قیامت کے روز وہاں کی نوازشوں سے بہرحال محروم رہے گا۔

پورے اخلاص سے نیک سے نیک اعمال انجام دینے کے باوجود ایمان والے کانپتے رہتے ہیں کہ ان کے خلوص میں کہیں، کوئی کمی نہ رہ جائے اور اللہ تعالیٰ کے دربار میں وہ ناقابلِ قبول نہ ٹھہریں۔ ان کی قلبی کیفیت قرآن میں ایک جگہ ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

---

[1] بخاری، کتاب الایمان، باب ان الاعمال بالنیة۔ مسلم، کتاب الامارة، باب قوله انما الاعمال بالنّیة

وَ الَّذِیۡنَ یُؤۡتُوۡنَ مَاۤ اٰتَوۡا وَّ قُلُوۡبُہُمۡ وَجِلَۃٌ اَنَّہُمۡ اِلٰی رَبِّہِمۡ رٰجِعُوۡنَ ﴿۶۰﴾ اُولٰٓئِکَ یُسٰرِعُوۡنَ فِی الۡخَیۡرٰتِ وَ ہُمۡ لَہَا سٰبِقُوۡنَ ﴿۶۱﴾

(المومنون:۶۰-۶۱)

وہ لوگ جو دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اور اس طرح دیتے ہیں کہ ان کے دل اس خوف سے کانپتے رہتے ہیں کہ انھیں اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ یہی لوگ نیکیوں میں سبقت کر رہے ہیں اور وہ اسے پا کر رہیں گے۔

حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا ان آیات میں غلط کار لوگوں کا ذکر ہے جو شراب پیتے اور چوری کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا:

لَا یَا بِنۡتَ الصِّدِّیۡقِ لٰکِنَّہُمُ الَّذِیۡنَ یَصُوۡمُوۡنَ وَ یُصَلُّوۡنَ وَ یَتَصَدَّقُوۡنَ وَ ہُمۡ یَخَافُوۡنَ اَنۡ لَّا تُقۡبَلَ مِنۡہُمۡ اُولٰئِکَ الَّذِیۡنَ...[1]

اے بنتِ صدیق یہ بات نہیں ہے بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو روزہ رکھتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں اور صدقہ وخیرات کرتے ہیں، لیکن انھیں خوف لگا رہتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے یہ اعمال قبول نہ کیے جائیں۔ ان ہی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ نیکیوں میں سبقت کرنے اور اسے پانے والے ہیں۔

جو عمل ریا کاری سے پاک ہو اور صرف اللہ کے لیے انجام دیا جائے وہ اسے بے حد محبوب ہے، چاہے وہ صدقہ وخیرات ہو، نماز اور عبادت ہو یا میدانِ جہاد کی جاں بازی ہو۔ چناں چہ حضرت ابوذرؓ سے حدیث مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

ثَلٰثَۃٌ یُحِبُّہُمُ اللّٰہُ وَ ثَلَاثَۃٌ یُبۡغِضُہُمُ اللّٰہُ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ یُحِبُّہُمُ اللّٰہُ فَرَجُلٌ اَتٰی قَوۡمًا فَسَأَلَہُمۡ بِاللّٰہِ وَ لَمۡ یَسۡأَلۡہُمۡ لِقَرَابَۃٍ بَیۡنَہٗ وَ بَیۡنَہُمۡ،

تین قسم کے انسانوں سے اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے اور تین قسم کے انسانوں سے نفرت کرتا ہے۔ جن لوگوں سے اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے ان میں ایک کا کردار یہ ہے کہ ایک شخص کچھ لوگوں کے پاس آیا اور اللہ کا واسطہ دے کر ان سے سوال کیا۔ اس کا سوال کسی رشتہ داری کی وجہ سے جو اس

---

[1] ترمذی، ابواب التفسیر، سورۃ المومنون

فَمَنَعُوْهُ فَتَخَلَّفَ رَجُلٌ بِاَعْيَانِهِمْ فَاَعْطَاهُ سِرًّا لَا يَعْلَمُ بِعَطِيَّتِهٖ اِلَّا اللّٰهُ وَالَّذِىْ اَعْطَاهُ وَ قَوْمٌ سَارُوْا لَيْلَتَهُمْ حَتّٰى اِذَا كَانَ النَّوْمُ اَحَبَّ اِلَيْهِمْ مِمَّا يَعْدِلُ بِهٖ فَوَضَعُوْا رُؤُسَهُمْ فَقَامَ يَتَمَلَّقُنِىْ وَ يَتْلُوْ اٰيَاتِىْ وَ رَجُلٌ كَانَ فِىْ سَرِيَّةٍ فَلَقِىَ الْعَدُوَّ فَهُزِمُوْا فَاَقْبَلَ بِصَدْرِهٖ حَتّٰى يُقْتَلَ اَوْ يُفْتَحَ لَهٗ وَ الثَّلَاثَةُ الَّذِيْنَ يُبْغِضُهُمُ اللّٰهُ الشَّيْخُ الزَّانِىْ وَالْفَقِيْرُ الْمُخْتَالُ وَ الْغَنِىُّ الظَّلُوْمُ[1]

کے اور ان کے درمیان ہو، نہیں تھا (اللہ کے واسطہ کے باوجود) ان لوگوں نے اسے کچھ دینے سے انکار کر دیا۔ یہ دیکھ کر اللہ کا ایک محبوب بندہ آگے بڑھا اور اسے خاموشی سے جو دینا تھا دے دیا۔ اس کے عطیہ کو سوائے اللہ تعالیٰ کے اور جسے اس نے عطیہ دیا تھا کوئی نہیں جانتا۔ دوسرا شخص وہ ہے، جس کا حال یہ ہے کہ ایک لشکر رات میں چلا جب (تکان کی وجہ سے) لشکریوں کے لیے نیند اس کے برابر کی چیزوں میں سب سے زیادہ پیاری معلوم ہونے لگی اور وہ سر رکھ کر لیٹ گئے تو وہ کھڑا ہوگیا مجھ سے (نماز میں) مناجات اور سرگوشی اور میری آیات کی تلاوت کرنے لگا۔ تیسرا شخص وہ ہے جو فوج کے دستہ میں تھا۔ دشمن سے مقابلہ ہوا تو دستہ شکست کھا گیا لیکن وہ اپنا سینہ تان کر آگے بڑھا کہ یا تو جان چلی جائے یا فتح و کامرانی حاصل ہو۔ وہ تین قسم کے انسان جن سے اللہ تعالیٰ نفرت کرتا ہے وہ ہیں۔ بوڑھا زانی، متکبر فقیر، اور ظالم تونگر۔

ریا شرک کی ایک قسم ہے

حدیث میں 'ریا' کو شرک سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ اس میں اعمال کا یہی ایک محرک نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کو خوش کیا جائے بلکہ اس کے ساتھ دوسرے محرکات بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ توحید جس اخلاص کا مطالبہ کرتی ہے یہ اس کے منافی ہے۔

---

[1] مسند احمد: ۱۵۲/۵ ۔ ترمذی، ابواب صفة الجنة، باب ماجاء فی صفة انهار الجنة۔ نسائی، کتاب الزکٰوة، باب ثواب من یعطی

حضرت شداد بن اوسؓ نے بعض صحابہ کرامؓ کے درمیان سوال کیا:

لَوْ رَأَیْتُمْ رَجُلاً یُصَلِّیْ لِرَجُلٍ اَوْ یَصُوْمُ لَهٗ اَوْ یَتَصَدَّقُ لَهٗ اَتَرَوْنَ اَنَّهٗ قَدْ اَشْرَکَ؟

اگر تم دیکھو کہ ایک شخص دوسرے کے لیے نماز پڑھتا ہے یا اس کے لیے روزہ رکھتا یا اس کی خاطر صدقہ و خیرات کرتا ہے تو بتاؤ کہ وہ شرک کر رہا ہے یا نہیں؟

سب نے بالاتفاق جواب دیا:

نَعَمْ وَاللّٰهِ اَنَّهٗ مَنْ صَلّٰی لِلرَّجُلِ اَوْ صَامَ لَهٗ اَوْ تَصَدَّقَ لَهٗ لَقَدْ اَشْرَکَ

خدا کی قسم جس نے کسی کے لیے نماز پڑھی، یا روزہ رکھا یا صدقہ کیا، اس نے بلاشبہ شرک کا ارتکاب کیا۔

اس پر حضرت شدادؓ نے فرمایا:

اِنِّیْ قَدْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ صَلّٰی یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ وَ مَنْ صَامَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ وَ مَنْ تَصَدَّقَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ[1]

بے شک میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا ہے کہ جو دکھاوے کے لیے نماز پڑھے اس نے یقیناً شرک کیا، جس نے دکھاوے کے لیے روزہ رکھا اس نے بھی شرک کیا اور جس نے دکھاوے کے لیے صدقہ کیا اس نے بھی شرک کیا۔

ریا کاری میں شرک کا جو پہلو ہے اسے یہ حدیث اچھی طرح واضح کرتی ہے۔ اس سے اس کی شناعت بہت بڑھ جاتی ہے۔

وہ لوگ بھی ریا کاری کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو نہیں مانتے اور ان لوگوں کے اعمال بھی اس سے پاک نہیں ہوتے جو اللہ پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں۔ آخر آدمی ریاکاری کیوں کرتا ہے، اس سے وہ کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ اس کے بہت سے مقاصد ہوسکتے ہیں۔

انسان کے اندر داد و ستائش کی طلب موجود ہے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کا

---

[1] مسند احمد: ۱۲۶/۴

ذکر اچھے الفاظ میں کیا جائے۔ اس کی طرف نیک اعمال اور اچھے اوصاف منسوب ہوں، بری صفات اور برے کلمات سے اسے یاد نہ کیا جائے۔ یہ جذبہ ایک خاص حد کے اندر ناپسندیدہ نہیں ہے، لیکن جب وہ حد سے بڑھ جاتا ہے تو اس کے تمام اعمال پر چھا جاتا ہے۔ وہ کوئی کارِ خیر انجام دیتا ہے تو داد طلب نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگتا ہے۔ وہ توقع رکھتا ہے کہ جب اس نے ایک اچھا کام کیا ہے تو اس کا اعتراف ہونا ہی چاہیے۔ اس کے نزدیک یہ اس کا حق ہے کہ لوگ اس کی تعریف و توصیف اور ثنا خوانی کریں۔ اگر کہیں سے اس کے 'حسنِ عمل' کی داد نہ ملے تو ناقدری کی شکایت کرنے لگتا ہے۔ جب تک داد نہ مل جائے اس کے اس جذبہ کی تسکین نہیں ہوتی۔

بعض اوقات بے عمل اور بدعمل انسان بھی خوب صورت توجیہات کے ذریعے یہی نہیں کہ اپنی غلط کاریوں اور کوتاہیوں پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے بلکہ انھیں ہوش مندی کا تقاضا اور دانائی کے اقدامات ثابت کرکے داد چاہتا ہے۔ یہود اپنی دین فروشی کے باوجود چاہتے تھے کہ انھیں حاملینِ دینِ متین قرار دیا جائے۔ منافقین کی خواہش ہوتی تھی کہ ان کی سازشوں کو فراموش کرکے انھیں ملت کا خادم تصور کیا جائے۔ قرآن مجید نے اس پر تنقید کرتے ہوئے فرمایا:

لَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِيۡنَ يَفۡرَحُوۡنَ بِمَاۤ اَتَوْا وَّ يُحِبُّوۡنَ اَنۡ يُّحۡمَدُوۡا بِمَا لَمۡ يَفۡعَلُوۡا فَلَا تَحۡسَبَنَّهُمۡ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الۡعَذَابِ‌ۚ وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ‏ ﴿۱۸۸﴾ (آل عمران:۱۸۸)

یہ ہرگز مت سمجھو کہ جو لوگ اپنے کیے پر خوش ہیں اور چاہتے ہیں کہ جو انھوں نے نہیں کیا ہے، اس پر بھی ان کی تعریف کی جائے، وہ عذاب سے چھوٹ جائیں گے۔ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔[۱]

حدیث میں اس بات سے منع کیا گیا ہے کہ آدمی 'جھوٹے لباس' میں لوگوں کے سامنے آئے۔ خالی ہاتھ ہو اور تونگر ثابت کرنے کی کوشش کرے، پیٹ خالی ہو اور شکم سیر بتائے، تن ڈھانکنے کی طاقت نہ ہو اور مانگے کے زرق برق جوڑوں سے اونچی

۱۔ آیت کے پس منظر کے لیے ملاحظہ ہو۔ تفسیر ابن کثیر: ۱/۴۳۶

حیثیت کا اعلان کرتا پھرے۔ حضرت اسماءؓ بنت ابوبکرؓ کی روایت ہے:

اِنَّ امرأةً قالت یا رسولَ اللّٰہ اِنَّ لِی ضَـرَّةً فهل علیَّ جنـاحٌ اِن تشبَّعتُ من زَوْجِی غَیْرَ الَّـذِیْ یُعْطِیْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْمُتَشَبِّعُ بِمَا لَمْ یُعْطَ کَلَابِسِ ثَوْبَیْ زُوْرٍ[1]

ایک عورت نے کہا، اے اللہ کے رسول میری ایک سوکن ہے۔ کیا اس میں کوئی گناہ ہے کہ میرے شوہر نے جو مجھے دیا ہے اس پر جھوٹ موٹ کو یہ ظاہر کروں کہ اس کے علاوہ بھی کچھ انھوں نے دیا ہے؟ آپ نے فرمایا۔ کسی کو جو چیز نہ دی گئی ہو اس کے بارے میں یہ ظاہر کرنا کہ وہ اسے دی گئی ہے ایسا ہی ہے جیسے کوئی جھوٹا لباس پہن لے۔

یہ حدیث اس سیاق میں آئی ہے کہ اس طرح کے جھوٹے مظاہرہ سے عورت کی سوکن اور اس کے شوہر کے درمیان نزاع اور اختلاف پیدا ہوسکتا ہے۔ یہ ایک مذموم حرکت ہے۔ علماء کے نزدیک تقویٰ کا جھوٹا مظاہرہ بھی اسی میں آتا ہے۔ وہ دنیادار بھی اس میں داخل ہے جو خدا ترس او رمتقی انسانوں کا لباس پہن کر اپنی نیکی اور تقویٰ کا فریب دیتا پھرتا ہے۔[2]

داد وستائش کی طلب جب حد سے بڑھ جاتی ہے تو شہرت اور نام آوری کی طلب میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ آدمی کی ساری کوششیں اسی مرکز کے گرد گھومنے لگتی ہیں۔ شہرت کی یہ طلب اپنے اندر بے پناہ قوت رکھتی ہے اور آدمی کو متحرک بنانے کے لیے کافی ہے۔ اس کے پیچھے وہ جان اور مال لٹانے کے لیے بھی تیار رہتا ہے۔ شہرت کی طلب میں اس کی قوت وصلاحیت کے حیرت انگیز مظاہرے دیکھنے میں آتے ہیں۔

شہرت کی طلب سے خودستائی کا مرض جنم لیتا ہے۔ شہرت کی بھوک جب نہیں مٹتی تو آدمی خود ہی اپنی شان میں قصیدے لکھنے اور صحیفے مرتب کرنے لگتا ہے۔ اسے اس

---

[1] بخاری، کتاب النکاح، باب التشبع بما لم ینل الخ۔ مسلم کتاب اللباس، باب النهی عن التزویر فی اللباس

[2] نووی، شرح مسلم: ۲/ ۲۰۶

وقت تک چین نہیں آتا جب تک کہ اس کے کارناموں کا برملا اعتراف نہ ہونے لگے۔ حدیث میں آتا ہے کہ جو شخص کوئی کار خیر کرے اور اس کا چرچا کرتا پھرے، قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس کی نیت کے کھوٹ کو عالم آشکارا کرے گا اور وہ برسرِ عام رسوا ہوگا۔

حضرت جندب (ابوعبد اللہ البجلیؓ) کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

من سمَّعَ سَمَّعَ اللّٰهُ بِه و مَنْ يُرائِي يُرائِي اللّٰهُ بِهِ[1]

جس نے اپنے کارنامے دوسروں کو سنائے اور انھیں شہرت دی اللہ تعالیٰ قیامت کے روز سب کو سنادے گا (کہ اس نے کس نیت سے سب کچھ کیا تھا)۔ جو اپنے اعمال دوسرے کو دکھائے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے روز دکھائے گا (کہ اس نے کس نیت سے یہ اعمال کیے تھے)۔

شہرت کے لیے کسی کارِ خیر کو انجام دینا اللہ تعالیٰ کے عذاب کو دعوت دینا ہے۔ اس سے اس کا غضب بھڑکتا ہے۔ اس پر جو وعید آئی ہے اسے بیان کرتے ہوئے حضرت ابوہریرہؓ پر بار بار غشی طاری ہوگئی اور حضرت معاویہؓ سن کر زار و قطار رونے لگے۔

حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ جب بندوں کے اعمال کا فیصلہ کرنے کے لیے نزول فرمائے گا تو سب سے پہلے تین (طرح کے) آدمیوں کا فیصلہ فرمائے گا۔ ان میں سے ایک تو شہید ہوگا۔ وہ پیش ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے اسے دنیا میں جو قوت و صلاحیت اور توانائی عطا کی تھی اسے وہ یاد دلائے گا۔ وہ اس کا اعتراف کرے گا۔ اس پر سوال ہوگا کہ تونے اس احسان کا کیا شکر ادا کیا اور تیری قوت و طاقت کہاں صرف ہوئی؟ عرض کرے گا اے اللہ! تونے جہاد کا حکم دیا تھا، میں نے اس کی تعمیل کی۔ اپنی قوتوں کو تیری راہ میں لگا دیا اور تیرے دشمنوں سے لڑتے ہوئے جان دے دی۔ ارشاد ہوگا تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تم نے جہاد

---

1. بخاری، کتاب الرقاق، باب الریاء والسمعة۔ مسلم کتاب الزهد، باب تحریم الریاء

اس لیے کیا تھا کہ تمھیں جری اور بہادر کہا جائے۔ دنیا میں تمہاری جرأت اور بہادری کے خوب چرچے ہوئے اور تمہاری مراد پوری ہوگئی۔ اس کے بعد حکم ہوگا کہ اسے چہرہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں پھینک دیا جائے۔

دوسرا شخص عالم اور قاری ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اسے یاد دلائے گا کہ کیا ہم نے تمہیں اپنی کتاب کے علم سے نہیں نوازا تھا؟ وہ اسے تسلیم کرے گا۔ سوال ہوگا کہ تم نے اس کا کیا شکر ادا کیا؟ عرض کرے گا کہ تو نے مجھے جو علم دیا تھا میں نے اسے پھیلایا، قرآن مجید پڑھا، حفظ کیا اور شب و روز اس کی تلاوت کرتا رہا۔ ارشاد ہوگا تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تم نے یہ سب کچھ اس لیے کیا تھا کہ تمہیں عالم اور قاری کی حیثیت سے شہرت ملے، تمہاری شہرت ہوچکی۔ تمہارا صلہ تمہیں مل گیا۔ حکم ہوگا کہ منہ کے بل گھسیٹ کر اسے بھی جہنم میں پھینک دیا جائے۔ وہ پھینک دیا جائے گا۔

تیسرا شخص صاحبِ ثروت اور دولت مند ہوگا، وہ پیش ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ کیا ہم نے تمہیں ہر طرح کے مال و دولت سے نہیں نواز ا تھا؟ وہ اللہ کے احسانات کا اعتراف کرے گا۔ سوال ہوگا کہ تم نے ان احسانات کا کیا کیا؟ عرض کرے گا، میں نے صلۂ رحمی کی، نیکی کے کاموں میں خرچ کیا، جس راستہ میں بھی پیسہ صرف کرنا تجھے پسند تھا میں نے اس میں صرف کیا۔ ارشاد ہوگا۔ جھوٹ بول رہے ہو۔ تم نے یہ سب اس لیے کیا تھا کہ تمھیں سخی اور داتا کہا جائے۔ یہ ہوگیا، دنیا میں تمھاری سخاوت کے چرچے ہوگئے۔ پھر اسے بھی منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔[1]

خدا کے ان ریاکار بندوں سے، جن امور کے بارے میں سب سے پہلے سوال ہوگا، ان کا تعلق بعض اہم دینی خدمات سے ہے۔ علم کا پھیلانا، امورِ خیر میں اپنی دولت کا خرچ کرنا اور اللہ تعالیٰ کے دین کو قائم و غالب کرنے اور دنیا سے ظلم و جور کو ختم کرنے کے لیے

---

[1] یہ حدیث مسلم میں کسی قدر اختصار کے ساتھ ہے۔ کتاب الامارۃ، باب من قاتل للریاء والسمعۃ الخ۔ ترمذی میں پوری تفصیل ہے۔ ابواب الزھد، باب ماجاء فی الریاء والسمعۃ۔ نیز ملاحظہ ہو نسائی، کتاب الجھاد، باب من قاتل لیقال فلان جری

جہاد کرنا اور جان کی بازی لگانا جیسی عظیم خدمات کے پیچھے شہرت کی طلب ہو تو صرف یہی نہیں کہ ان کا اجر وثواب رائیگاں جاتا ہے بلکہ آدمی اللہ کے غضب کا نشانہ بنتا ہے۔

جو عمل اخلاص سے خالی اور دوسروں کو خوش کرنے کے لیے ہو، حدیث میں آتا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ نے اپنی برأت اور بے زاری کا اعلان کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَ تَعَالٰی اَنَا اَغْنٰی الشُّرَکَاءِ عَنِ الشِّرْکِ مَنْ عَمِلَ عَمَلاً اَشْرَکَ فِیْہِ مَعِیَ غَیْرِیْ تَرَکْتُہٗ وَ شِرْکَہٗ[1]

اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے کہ میں ساجھے داروں میں سب سے زیادہ ساجھے سے بے نیاز ہوں، جس نے کوئی عمل کیا اور اس میں میرے ساتھ کسی اور کو بھی شریک کر دیا تو میں اُسے اور اس کی شرکت دونوں کو چھوڑ دیتا ہوں۔

مطلب یہ کہ جو عمل اللہ کے ساتھ دوسروں کو بھی پیش نظر رکھ کر کیا جائے اس کی اللہ تعالیٰ کو کوئی حاجت نہیں ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ جو عمل کیا جائے اس کی ہدایت کے عین مطابق اور صرف اسی کے لیے کیا جائے۔ اُس کی غیرت ساجھے دار بننا گوارا نہیں کرتی کہ کچھ اُس کے لیے ہو اور کچھ دوسروں کے لیے۔ جو کام اس لیے کیا جائے کہ اس کے ساتھ دوسرے بھی خوش ہوں وہ اسے ان ہی کے لیے چھوڑ دیتا اور اس سے الگ ہو جاتا ہے۔ اس روایت کا آخری فقرہ ان الفاظ کے ساتھ بھی مروی ہے۔

مَنْ عَمِلَ عَمَلاً اَشْرَکَ فِیْہِ غَیْرِیْ فَاَنَا مِنْہُ بَرِیْءٌ وَھُوَ لِلَّذِیْ اَشْرَکَ[2]

جس نے کوئی عمل کیا اور اس میں میرے ساتھ کسی غیر کو بھی شریک کر دیا تو میں اس سے بری ہوں (میرا اُس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا) وہ عمل اُسی کے لیے ہے جسے اُس نے شریک کیا ہے۔

---

[1] مسلم: کتاب الزھد، باب تحریم الریاء

[2] ابن ماجہ: ابواب الزھد، باب الریاء والسمعة۔ مسند احمد: ۲/۳۰۱، ۴۳۴

اللہ تعالیٰ بے حد غیور ہے، وہ شرک کو برداشت نہیں کرتا۔ وہ ہر عمل میں اخلاص چاہتا ہے۔ جس عمل کے پیچھے صرف اس کی رضا ہی نہیں دوسروں کی خوش نودی بھی مطلوب ہو وہ اس کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوتا۔ اس سے ہوسکتا ہے دوسرے خوش ہوجائیں لیکن اللہ تعالیٰ کی رضا نہیں حاصل ہوسکتی۔[1]

---

[1] اخلاص کے موضوع پر مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب 'اسلام میں خدمت خلق کا تصور' بحث 'اخلاص ضروری ہے'۔

استقامت

ایمان اور استقامت

'ایمان' اور 'استقامت' یہ دو لفظ اسلام کا حاصل ہیں۔ اسلام جو انسان کی پوری زندگی پر پھیلا ہوا ہے، ان دو لفظوں میں سمٹ کر آ گیا ہے۔ ایمان کا تعلق عقیدہ سے ہے اور استقامت کا تعلق عمل سے ہے۔ عقیدہ اور عمل کو ملانے کے بعد انسان کے دین کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ اب اس کو اپنے دین کے سلسلے میں کسی چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔ ہماری جدوجہد کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا اور آخرت کی کامیابی ہے۔ قرآن نے صراحت کی ہے کہ یہ چیز ایمان و استقامت ہی سے مل سکتی ہے۔ آنے والے ہول ناک دن کے خوف سے وہی شخص محفوظ ہوگا اور اسی کو اللہ تعالیٰ کے فرشتے جنت کی خوش خبری دیں گے جسے اس دنیا میں ایمان و استقامت کی زندگی نصیب ہوگی۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ﴿٣٠﴾ نَحْنُ أَوْلِيَاؤُكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۖ وَلَكُمْ فِيهَا مَا

جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر جم گئے تو ان پر فرشتے اتریں گے کہ تم نہ خوف کھاؤ اور نہ غم کرو۔ تمھارے لیے خوش خبری ہے جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ ہم تمھارے دوست رہے ہیں دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں بھی رہیں گے اور تمھارے لیے جنت میں وہ سب کچھ

تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَ لَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۞ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ۞ — ہے جو تمہارا جی چاہے اور جو کچھ تم مانگو وہ تم کو (یہاں) ملے گا۔ یہ مہمانی ہے غفور و رحیم کی طرف سے۔ (حٰمٓ السجدۃ: ۳۰-۳۲)

حضرت سفیان بن عبد اللہ ثقفیؓ نے اپنے اور ہمارے اور ساری دنیا کے محسن حضرت محمد ﷺ سے درخواست کی، حضور! اسلام کے بارے میں مجھے ایک ایسی بات بتادیجیے کہ آپؐ کے بعد پھر کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ رہے۔ آپؐ نے فرمایا:

قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ[1] — کہو کہ میں خدا پر ایمان لایا اور پھر اس پر جم جاؤ۔

اسلام کی دعوت کے لیے جو بنیادی اوصاف ضروری ہیں ان کا آغاز ایمان باللہ سے کیا گیا تھا۔ اب ان کے آخر میں استقامت کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

ایمان اور استقامت کا تعلق

اللہ تعالیٰ پر ایمان ایک زبردست انقلاب ہے، جو انسان کے فکر و عمل کی دنیا میں نمودار ہوتا ہے اور اسے یکسر بدل کر رکھ دیتا ہے۔ یہ انقلاب کسی وقتی جوش کا نام نہیں ہے، بلکہ صحیح معنی میں جب یہ رونما ہوتا ہے تو آخر وقت تک باقی رہتا ہے۔ ایمان کی زندگی حق پر ثابت قدمی کی زندگی ہے۔ اگر کوئی شخص پورے شعور کے ساتھ ایمان لائے تو اسے استقامت بھی نصیب ہوگی۔ اسے ایسی روح ملے گی، جس کے عزائم کو دنیا کی کوئی بھی قوت شکست نہ دے سکے۔ وہ ہر حال میں حق پر جما رہے گا۔ کوئی بڑے سے بڑا خوف اور کوئی بڑے سے بڑا لالچ اسے حق کی راہ سے نہ ہٹا سکے گا۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان کا تقاضا ہے کہ آدمی کے پورے وجود پر اس کی حکومت قائم ہو جائے اور اس کا ہر اقدام اللہ کی مرضی کے تابع ہو کر رہ جائے۔ انسان کی زندگی اس کی سب سے قیمتی متاع ہے، ایک صاحبِ ایمان کے اندر یہ عزم اور حوصلہ ہونا چاہیے کہ ضرورت پڑنے پر اس قیمتی متاع کو وہ اللہ کے نام پر قربان کر دے گا۔ ہر انسان اس دنیا

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب جامع اوصاف الاسلام

میں آسائش و راحت کا طالب ہے، مرد مومن کے اندر یہ جذبہ ہونا چاہیے کہ وہ اللہ کے لیے اپنی ہر راحت کو ترک کردے گا۔ مال و دولت، جس کی طلب میں ہر شخص سرگرداں ہے اور جسے کوئی بھی فرد کھونا نہیں چاہتا، اس کا فیصلہ ہونا چاہیے کہ اس میں اس کا دامن نہیں الجھے گا۔ زندگی کی تمنا، مال کی محبت اور آرام کی طلب انسان کو قربانی سے باز رکھتی ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ ایمان کے درجات مسلسل قربانی ہی سے طے ہوتے ہیں۔ یہاں پاتا وہ شخص نہیں ہے جو اپنے لیے سب کچھ سمیٹ کر رکھتا ہے بلکہ وہ شخص پاتا ہے جو اپنا سب کچھ لٹاتا ہے۔ مبارک ہے وہ جس کی اللہ تعالیٰ سے محبت ہر دوسری محبت پر غالب آجائے اور اللہ کی رضا کے لیے وہ ہر اس چیز سے دامن کش ہوجائے جو اس کی ناخوشی کا سبب بنے۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں اور آپ کو اس طرح نہیں پیدا کیا ہے کہ ایمان کی راہ بالکل آسان کردی گئی ہو، بلکہ ہمارے نفس کے اندر اس راہ سے بغاوت اور سرکشی کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ ہمیں ایمان کی زندگی اس وقت نصیب ہوگی، جب کہ ہم نفس کی اس بغاوت کو کچلنے میں کامیاب ہوجائیں۔ ایمان جس قسم کی زندگی چاہتا ہے وہ راحت اور آسائش کے ساتھ حاصل نہیں ہوتی، بلکہ اس کے لیے سخت ریاضت اور شدید کشمکش کرنی پڑتی ہے۔ انسان کے نفس کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ وہ آزاد رہے اور اس کو اپنی خواہشات کے پورا کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو، لیکن ایمان بے قید زندگی گزارنے کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی مرضیات کا پابند بناتا ہے۔ یہ دنیا جو ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے اس میں بڑی کشش اور جاذبیت ہے۔ ہمارا نفس چاہتا ہے کہ ہر قیمت پر اس کو حاصل کیا جائے خواہ اس کے لیے اپنا ایمان ہی کیوں نہ فروخت کرنا پڑے۔ اگر ہمارے لیے ایمان سب سے قیمتی متاع ہے تو اس لذیذ اور پرکشش دنیا کے ترک و اختیار میں اللہ کے احکام کا پابند ہونا پڑے گا۔ یہ یقیناً ایک مشکل کام ہے لیکن جو شخص اللہ کو خوش کرنا چاہے اسے لازماً یہ مشکل کام انجام دینا ہوگا اور زندگی بھر انجام دیتے رہنا ہوگا۔

دعوت دین استقامت چاہتی ہے

دعوتِ دین استقامت کی طالب ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان کو اپنے نفس پر پوری طرح قابو حاصل ہو۔ اس کے عزم میں اتنی پختگی ہو کہ نفس کی خواہشات اپنی طرف کھینچ رہی ہوں تو وہ ان کو ٹھکرا کر حق سے چمٹا رہے۔ اسے اپنے ایمان سے اتنی محبت ہو کہ دنیا اسے کسی قیمت پر خرید نہ سکے۔ اس کے بغیر زبان پر تو بار بار دین کا نام آتا رہے گا، لیکن اس راہ کو عملاً اختیار کرنا اور پامردی اور استقلال کے ساتھ اس پر چلنا آسان نہ ہوگا۔

استقامت تا دمِ آخر

اللہ تعالیٰ کی راہ میں یہ استقامت وقتی طور پر مطلوب نہیں ہے۔ اس کو زندگی کی آخری سانس تک باقی رہنا چاہیے۔ وقتی جوش و خروش تو دنیا کا ہر گھٹیا مقصد پیدا کرسکتا ہے، لیکن اسلام انسان کے اندر ٹھوس اور پائے دار انقلاب چاہتا ہے۔ وہ کسی خاص وقت یا کسی خاص معاملہ میں قربانی کا طالب نہیں ہے، بلکہ ہر حال میں اور ہر معاملے میں قربانی کا مطالبہ کرتا ہے۔ وقتی جوش اور جذبہ کے تحت بڑی سے بڑی قربانی آسان ہے لیکن کسی بھی چھوٹی سے چھوٹی چیز کو ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی سے خارج کر دینا آسان نہیں ہے۔ ایسا بہت دیکھا گیا ہے کہ ایک شخص کسی ہنگامی فضا سے متاثر ہو کر حیرت انگیز ایثار اور قربانی کا مظاہرہ کرتا ہے، لیکن زیادہ زمانہ گزرنے نہیں پاتا کہ اس کا یہ جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ جس کو نہ اپنے مال کی پروا تھی اور نہ اپنی جان کی، وہ ہر وقت اپنی جان و مال کے لیے فکر مند رہنے لگتا ہے، جو سینہ جذباتِ ایمان سے سرشار تھا وہ اپنی حرارت کھو بیٹھتا ہے، جو سپاہی دین کی محبت میں رات بھر جاگ سکتا تھا، اب اس کے اوقات اتنے گھر جاتے ہیں کہ وہ اسی دین کی خاطر ایک گھنٹہ نہیں نکال سکتا، جو شخص اپنی انتہائی مصروفیت میں دین سے غافل نہیں ہوتا تھا وہ لمحاتِ فرصت میں بھی اللہ کو اور اس کے دین کو کم ہی

یاد کرتا ہے۔ جو شخص غربت اور تنگی میں دین کے تقاضوں سے غافل نہیں تھا وہ وسعت اور فراخی کے باوجود ان تقاضوں کو فراموش کر جاتا ہے، جو شخص دین کی فکر میں اپنی راحت اور چین کو بھول جاتا تھا وہ اپنے معمولات تک میں کوئی تبدیلی کرنا نہیں چاہتا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ قربانیاں وقتی جوش وخروش اور کسی ہنگامی محرک کا نتیجہ تھیں، لیکن وہ اس کو ایمان کی محبت کا ثمرہ سمجھ رہا تھا۔ ایمان جب صحیح معنی میں دل میں اتر جاتا ہے تو ہر قدم پر ذوقِ شہادت بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ ایمان کی لذت صبح وشام کی گردش کے ساتھ کم نہیں ہوتی بلکہ ہر آنے والا دن اس میں اور اضافہ کرتا ہے۔ ع

یاں وہ نشے نہیں جنہیں ترشی اُتار دے

اللہ کا دین آج اپنے ماننے والوں کو آواز دے رہا ہے کہ وہ اس کی دعوت وتبلیغ اور سربلندی کے لیے کمر کس لیں، اس راہ میں اپنی پوری قوت صرف کردیں اور اپنے آپ کو اس میں کھپادیں۔ ایمان کی زندگی رہبانیت کی زندگی نہیں ہے کہ آدمی کسی گوشے میں بیٹھ کر اللہ کی یاد میں مست ہوجائے اور اپنے باطن کی کیفیات میں اس طرح گم رہے کہ اسے باہر کی دنیا کی خبر تک نہ ہو۔ ایمان دل و جان سے اللہ تعالیٰ کی عبادت و اطاعت میں لگ جانے اور اس کی راہ میں مسلسل جدوجہد کا نام ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی باطنی کیفیات میں اس طرح کھو جائے کہ اللہ کے دین کی بھی اسے فکر نہ ہو تو گویا اس نے ان کیفیات کی پرستش شروع کردی۔ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا پابند نہیں اپنی کیفیات کا غلام بن گیا۔

دعوت ـ ایک مسلسل عمل

اللہ تعالیٰ پر ایمان اپنے اندر بہت بڑا انقلابی پیام رکھتا ہے۔ جو شخص ایمان لاتا ہے وہ فطری طور پر اس انقلاب کا داعی بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کے اندر فکر و عمل کی جو تبدیلی دیکھنا چاہتا ہے وہ اس تبدیلی کا واسطہ ہو جاتا ہے۔ کلمۂ حق جن انسانوں تک نہیں پہنچ سکا ہے یہ اس کی ذمے داری قرار پاتی ہے کہ اسے ان تک پہنچائے، خدا کی

مخلوق جو غفلت کی نیند سو رہی ہے اس کا فرض ہے کہ اسے بیدار کرے اور جن حقیقتوں سے وہ بے خبر ہے اسے حکم ہے کہ ان حقیقتوں سے اسے باخبر کرے۔ ایمان کا دعویٰ کر کے اس نے کچھ چیزوں کو پایا ہے اور کچھ چیزوں کو کھویا ہے۔ یہ پانا اور کھونا اس کا شعوری عمل ہے۔ اس نے جو کچھ پایا وہ اس کے ارادے کے بغیر اسے نہیں مل گیا اور جو کچھ کھویا غفلت اور بے شعوری میں اس نے نہیں کھویا ہے۔ یہ دنیا جس کی تمنا میں بے شمار انسان اپنے رات اور دن کاٹ رہے ہیں اس کو اس نے بے وجہ اس سے کنارہ کشی نہیں اختیار کی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی طلب میں اسے ترک کی ہے۔ اس نے اپنے نفس کی غلط خواہشات کو بے مقصد نہیں کچلا اور روندا ہے، بلکہ اللہ کی محبت میں روندا اور کچلا ہے، اس نے اپنے اور اپنے خاندان کے مفاد کو بے سبب نقصان نہیں پہنچایا ہے، بلکہ اللہ کی رضا کی طلب میں نقصان پہنچایا ہے۔ اگر وہ اپنے اس اقدام کو حق سمجھتا ہے تو اس حق کا تقاضا ہے کہ اسے دوسروں تک پہنچایا جائے۔ اس کے اندر اس بات کی بے پناہ تڑپ ہونی چاہیے کہ جو انقلاب اس کی ذات کے اندر رونما ہو چکا ہے وہ دوسروں کے اندر بھی رونما ہو۔ اس نے جن افکار و اعمال کو ترک کیا ہے ساری دنیا ان سے کنارہ کش ہو جائے اور جس فکر و عمل سے اسے تب و تاب ملی ہے، اس سے ہر ایک کی زندگی چمک اٹھے۔ یہ بات ایمانی غیرت کے منافی ہے کہ آدمی کے کانوں میں اللہ سے بغاوت کی آواز گونج رہی ہو اور اس کے اندر اسے مٹانے کے لیے کوئی اضطراب اور بے چینی نہ پائی جائے۔

دعوتِ دین کا یہ فرض جو ایمان لانے کے بعد آدمی پر خود بہ خود عائد ہو جاتا ہے، زبردست استقامت چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کے دین کا علم اٹھانا کوئی معمولی اقدام نہیں ہے۔ یہ دنیا بھر کی شیطانی قوتوں کو چیلنج کرنے کے ہم معنی ہے۔ یہ باطل کو دعوتِ مبارزت دینا ہے۔ اس لیے کچھ بعید نہیں کہ باطل اپنی تمام قوتوں کے ساتھ اسے کچلنے کے لیے میدان میں آجائے، داعی دین کو سخت سے سخت حالات سے

گزرنا پڑے اور ہر ممکن طریقہ سے اس کا امتحان لیا جائے۔ آج ہر طرف آزادیِ فکر و عمل کا راگ الاپا جا رہا ہے، اس کے باوجود سر کی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے کہ دنیا اللہ کے دین کو اس کی صحیح شکل میں برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ وہ اسے نماز، روزے اور انسان کی نجی زندگی تک محدود رکھنا چاہتی ہے۔ کاروبارِ حیات سے دین کا تعلق اسے کسی قیمت پر گوارا نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ باطل کے مزاج کے خلاف ہے کہ وہ حق کو برداشت کرے اور اسے پھلنے پھولنے کا موقع فراہم کرے۔ وہ ان حق پرستوں کو کبھی چین کی نیند سونے نہیں دے گا جو اپنے عقیدہ کے مطابق فرد کی اصلاح اور معاشرہ کی تعمیر کی جدوجہد کریں گے۔ خدا کی یہ وسیع زمین ان کے لیے تنگ کر دی جائے گی اور دوستی کا دم بھرنے والے بھی دشمن کی صف میں جا کھڑے ہوں گے۔ ایسے ہی نازک موقع کے لیے رسولِ خدا ﷺ نے اپنے ایک قریب ترین صحابی حضرت معاذؓ کو نصیحت فرمائی تھی۔

لَا تُشْرِکْ بِاللّٰہِ شَیْئًا وَّ اِنْ قُتِّلْتَ اَوْ حُرِّقْتَ[1]	اللہ کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہ کرو، چاہے تمھیں قتل کر دیا جائے یا جلا دیا جائے۔

داعیِ دین کے اندر یہ عزم ہونا چاہیے کہ وہ اللہِ واحد کا بندہ بن کر رہے گا اور جیتے جی اس کے احکام سے سرتابی نہیں کرے گا، اس کے نتیجے میں خواہ اس کا سر تن سے جدا ہو جائے اور اسے جلا کر خاکستر کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا جائے۔

استقامت کی راہ دشوار گزار ہے

استقامت کی راہ بڑی کٹھن راہ ہے۔ اس میں بڑے بڑے اربابِ عزیمت کے قدم لغزش کھا جاتے ہیں۔ انسان پر جب ہر طرف سے مصیبتیں آن پڑتی ہیں اور اللہ کے فیصلے کے تحت اس کو آزمایا جاتا ہے تو وہ گھبرا اٹھتا ہے، وہ حق کو چھوڑنا نہیں چاہتا لیکن قربانی کے جذبات اس کے اندر سرد پڑ جاتے ہیں۔ وہ آزمائشوں کے بغیر اللہ کی

---

[1] مسند احمد: ۵/۲۳۸

جنت میں پہنچنا چاہتا ہے حالاں کہ اللہ کا قانون ہے کہ وہ آزمائے بغیر کسی کو اس نعمت بھرے گھر میں داخل نہیں کرتا۔ انسان کا تعلق جب حق سے کم زور پڑ جاتا ہے تو اس کے سوچنے کا انداز بدل جاتا ہے اور اس کی نفسیات میں تبدیلی آجاتی ہے۔ وہ طبعی طور پر گو زندہ ہوتا ہے لیکن اس کی جذباتی موت واقع ہوچکی ہوتی ہے۔ وہ اب یہ نہیں دیکھتا کہ حق کا اس سے کیا مطالبہ ہے، بلکہ یہ دیکھنے لگتا ہے کہ دوسرے کیا کر رہے ہیں۔ اس کو اگر اس کی ذمے داریاں یاد دلائی جائیں تو وہ ان ذمے داریوں کا انکار نہیں کرے گا بلکہ وہ نصیحت کرنے والے کی زندگی کا جائزہ لینے لگے گا تاکہ بتا سکے کہ وہ بھی اپنی ذمے داریوں سے غافل ہے اور وہ اس کو نصیحت کرتے ہوئے خود کو بھول رہا ہے۔ اگر کوئی اس سے کہے کہ دینِ حق تم سے تمھاری جان و مال کی قربانی چاہتا ہے تو وہ یہ نہیں کہے گا کہ اس کو جان و مال اللہ کے دین سے زیادہ محبوب ہیں بلکہ اس کا جواب یہ ہوگا کہ فلاں صاحب بھی تو سو رہے ہیں آپ ان کو کیوں نہیں جگاتے، اگر وہ اپنے کاروبار میں مگن ہیں تو میں نے ہی کون سا جرم کیا ہے اگر اپنا وقت نہ نکال سکا؟ ایسا شخص دینِ حق سے تعلق رکھے گا بھی تو اپنے لیے عزیمت کی راہ پسند نہ کرے گا۔ اس کی زندگی میں اس کی اپنی ذات کا فائدہ مقدم ہوگا اور وہ دین کے تقاضوں کو بہ آسانی پسِ پشت ڈال دے گا۔ اس کی پستی اس حد کو پہنچ سکتی ہے کہ اس کی زبان کلمۂ حق کے اظہار سے عاجز ہو جائے۔ وہ جب دیکھے گا کہ حق کی صحیح ترجمانی اس کو آزمایشوں میں ڈال رہی ہے اور باطل اپنے غصے کا اظہار کر رہا ہے تو وہ ایسی راہیں تلاش کرے گا جو حق کو باطل سے قریب کردیں۔ وہ قدم قدم پر باطل کو یقین دلانے کی فکر کرے گا کہ وہ اس کا ساتھی ہے۔ وہ اس کو اکھاڑ پھینکنا اور اللہ کا دین قائم کرنا نہیں چاہتا، بلکہ اس کے سائے میں جینے کا آرزو مند ہے۔ حکمتیں اور مصلحتیں اس کی آواز کو کم زور کردیں گی، وہ راہِ حق پر چلتے چلتے تھک سا جائے گا، اس کے قدم لڑکھڑانے لگیں گے اور اس کے عزائم ضعف کا شکار ہوجائیں گے۔ اس نے جن حوصلوں اور ارادوں کے ساتھ اپنے سفر کا آغاز کیا تھا وہ سارے حوصلے اور ارادے پست

ہوجائیں گے۔ وہ سکون و راحت کا جویا اور آرام کا طالب ہوگا۔ وہ اپنی منزل کی دوری اور راہ کی خوف ناکی سے گھبرا اٹھے گا۔ اب اس کی زبان پر کلماتِ عزیمت کے بجائے حالات کی ناسازگاری کا شکوہ ہوگا، وہ بعض اوقات اپنی 'مجبوریوں' اور 'معذوریوں' کی ایک لمبی فہرست سامنے رکھنے کے بعد یہ کہہ کر خوش اور مطمئن ہوجائے گا کہ ان حالات میں دین کی جو کچھ بھی خدمت ہورہی ہے وہ بہت ہے۔

استقامت کے تقاضے

حقیقت یہ ہے کہ دعوت دین بہت ہی صبر آزما کام ہے۔ یہ بڑی دشوار گزار گھاٹی ہے جسے ہر شخص آسانی سے پار نہیں کرسکتا۔ اس پر وہی شخص چل سکتا ہے جو قدموں کے زخمی ہونے اور دست و بازو کے شل ہونے کی شکایت نہ کرے، جو راہ کی ٹھوکروں سے گھبرا کر اپنی راہ نہ کھوٹی کرے، بلکہ ہر ٹھوکر پر اپنے اندر نئی توانائی محسوس کرے، جو مخالفت کے طوفان میں پیچھے نہ ہٹے، بلکہ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ جما رہے، دشمن کو دیکھ کر جس کا ایمان متزلزل نہ ہو، بلکہ ہر آزمائش کو اپنی کامیابی کا ذریعہ سمجھے۔

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَ اتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ (آلِ عمران: ۱۷۲)

جو زخم کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسول کی آواز پر حاضر ہوگئے۔ ان میں جو نیک اور متقی ہیں ان کے لیے بڑا اجر ہے۔

ع بڑھتا ہے ذوقِ گناہ یاں ہر سزا کے بعد

دعوتِ دین اللہ کے پیغمبروں کا کام ہے۔ جو شخص اس کے لیے اٹھے اسے ان مراحل سے بھی گزرنا پڑ سکتا ہے، جن مراحل سے پیغمبروں اور ان کے ساتھیوں کو گزرنا پڑا۔ ان کی قوموں نے ان کے ساتھ وہ معاملہ کیا جو دشمنوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ انھیں ہر طرح ستایا اور دق کیا گیا، ان کو بے دین قرار دیا گیا، وہ گھر سے بے گھر کیے گئے، ان کی اپنی کمائی ہوئی دولت ان سے چھین لی گئی، حتیٰ کہ ان میں سے کتنوں کے سر

تن سے جدا کردیے گئے۔ یہ سب کچھ محض اسی ایک جرم کی پاداش میں تھا کہ وہ اللہِ واحد پر ایمان رکھتے تھے اور اسی کے دین کی طرف دعوت دیتے تھے:

الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ (الحج:۴۰)

جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے، محض اس وجہ سے کہ وہ اللہ کو اپنا رب اور آقا کہتے ہیں۔

آج کا دور بھی اپنی روح کے اعتبار سے پیغمبروں کے ادوار سے مختلف نہیں ہے۔ دشمن بہت قوی ہے اور دین کے داعی اور اس کے خادم بہت کم زور ہیں، لیکن یاد رکھیے کہ راہِ خدا میں آنے والی آزمائشوں سے گھبرا کر جو شخص اپنے قدم پیچھے ہٹاتا ہے وہ اپنے دعویٰ ایمان کی توہین کرتا ہے۔ اس نے اپنے عمل سے اس چیز کی تکذیب کی ہے، جس کی تصدیق اپنے قول سے کرچکا ہے۔ اس نے وہ ناپاک روش اختیار کی ہے جس سے اس کے پاک عقیدہ کی رسوائی ہوتی ہے۔ اس نے حق کے مقابلے میں دنیا کو ترجیح دے کر اس بات کا ثبوت فراہم کیا ہے کہ حق کی قدر و قیمت اس کی نگاہ میں یہ نہیں ہے کہ اس کے لیے دنیا قربان کی جاسکے۔ اس کے نزدیک حق محبوب نہیں رہا بلکہ دنیا محبوب بن گئی ہے۔ اس نے ایمان کے ذریعے اس بات کا اظہار کیا تھا کہ زندگی اس کی نہیں، اللہ کی عطا کردہ ہے، اب وہ راہِ حق سے پسپائی اختیار کر کے یہ ظاہر کر رہا ہے کہ زندگی اس کے نزدیک قیمتی متاع ہے، جسے وہ اللہ کے ہاتھ بھی بیچنا نہیں چاہتا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت معاذؓ کو نصیحت فرمائی تھی۔ یہی نصیحت میرے اور آپ کے لیے بھی ہے۔

اِيَّاكَ وَ الْفِرَارَ مِنَ الزَّحْفِ وَ اِنْ هَلَكَ النَّاسُ[1]

میدانِ جہاد سے ہرگز مت فرار اختیار کرو، خواہ سب لوگ ہلاک ہی کیوں نہ ہوجائیں۔

داعیانِ دین کو اچھی طرح سمجھنا چاہیے کہ حالات سخت ہوجائیں، زمانہ کا رخ بدل جائے، دین کی محبت پر دنیا کی محبت غالب آجائے، لوگ دنیا بنانے کی فکر میں لگ جائیں اور خواہشات کے پیچھے دوڑنے لگیں، مدعیانِ علم و دانش اور اصحابِ فضیلت بھی دین کے

---

[1] مسند احمد: ۲۳۸/۵ حدیث نمبر ۲۱۵۷۰

لیے اپنی راحت اور آسائش چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہوں، اس سے آگے دینِ حق کی گواہی دینے والے ایک ایک کر کے ختم ہو رہے ہوں اور اللہ کا نام لینے والے میدان چھوڑ کر بھاگ رہے ہوں، تو بھی داعیانِ دین کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آنی چاہیے۔ یہ ان کی بہت بڑی خوش بختی ہے کہ حق و صداقت کے لیے تگ و دو اور قربانی کی سعادت انھیں مل رہی ہے۔ اللہ کے دین کی راہ میں پیش آنے والی آزمائشیں فوز و فلاح کا ذریعہ ہیں۔ یہ ارتقا کے زینے ہیں جو اس لیے فراہم کیے گئے ہیں کہ ان کے ذریعہ اللہ کے بندے اور اس کے دین کے خادم اس کی رضا کے بلند ترین مقام تک پہنچ سکیں۔ حالات بدلتے رہتے ہیں۔ جہاں کہیں کھلی فضا ہے، اللہ کے بندوں کو اس کے دین کی دعوت اور اس کی سربلندی کے لیے جدوجہد کے مواقع حاصل ہیں اور داعیانِ دین کی راہ میں زیادہ آزمائشیں نہیں ہیں تو انھیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے انھیں کسی بڑے امتحان میں نہیں ڈالا اور آزمائشوں سے محفوظ رکھا ہے، لیکن فرض کیجیے کبھی حالات بد سے بدتر ہو جائیں، آپ کو سخت ترین آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑے، قید خانوں کی تاریک کوٹھریاں آپ کا انتظار کرنے لگیں، آگ کے شعلوں کے درمیان سے آپ کو گزرنا پڑے یا آپ کے لیے تختۂ دار سجنے لگے تو سمجھ لیجیے کہ آپ کامیابی سے ہم کنار ہونے والے ہیں۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نظرِ عنایت آپ پر ہے۔ اس نے اپنی بے پایاں نوازشات کے لیے آپ کو منتخب کیا ہے۔ حق وہ سب سے قیمتی متاع ہے جو کسی انسان کو ملتی ہے اس کے لیے اگر جان بھی دینی پڑے تو یہ معمولی قربانی ہوگی، اگر آپ راہِ حق کو اس لیے چھوڑتے ہیں کہ یہ اجنبیت کی راہ ہے اور کوئی آپ کا ساتھ دینے والا نہیں ہے تو آپ نے حق کی قدر نہیں پہچانی۔ اسی طرح اگر آپ حق کی اطاعت اس وجہ سے قبول کرتے ہیں کہ آپ کا ماحول حق پرست ہے یا باطل آپ کا قدر شناس نہیں ہے تو یہ حق کی اتباع نہیں بلکہ ماحول کی اتباع ہے۔ خوب یاد رکھیے کہ اللہ کی عدالت میں یہ بڑا جرم ہے کہ حق کی راہ میں آپ اپنا بڑھایا ہوا قدم

واپس لیں۔ جب اللہ کا دین آپ سے آپ کی زندگی چاہ رہا ہو اور جب آپ کو یہ موقع ملا ہو کہ اپنی عزیز ترین متاع کو دے کر اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم کے مستحق ہو جائیں تو یہ آپ کے ایمان کے منافی ہے کہ آپ اس موقعے کو کھودیں۔ آپ کی کامیابی اسی میں ہے کہ حق کی راہ میں اپنی ساری پونجی لٹادیں اور دامن جھاڑ کر اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچ جائیں، کیوں کہ اس طرح کل آپ کے حصے میں وہ دولت آنے والی ہے، جس سے بہت سے وہ انسان محروم ہوں گے جنھیں آج اپنی خوش بختی پر ناز ہے اور جو روزِ قیامت آپ کی کامیابی کو دیکھ کر حسرت کے ساتھ کہیں گے کاش کہ ہم نے بھی اپنے مولا کو خوش کیا ہوتا۔ کاش کہ ہماری دنیا ہم سے چھین لی جاتی۔ کاش کہ ہماری آخرت برباد نہ ہوتی۔

دعوت اور تنظیم

- دعوت اور تنظیم
- تنظیم کیسے مستحکم ہوتی ہے؟

دعوت اور تنظیم

تنظیم کی ضرورت

کسی بھی تحریک اور دعوت کے لیے تنظیم بہت ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اس لیے عقل کہتی ہے کہ اسلام کی دعوت کے لیے بھی تنظیم لازماً ہونی چاہیے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ہمارے مختلف حلقوں میں اس کام کے لیے تنظیم کی ضرورت اور اہمیت محسوس نہیں کی جاتی۔ دنیا کے کسی بھی نظریہ کی اساس پر اٹھنے والی دعوت اپنی تنظیم قائم کرسکتی ہے لیکن اسلام کی دعوت کے لیے اگر کوئی تنظیم وجود میں آئے تو بعض لوگ اس پر ناگواری کا اظہار کرتے ہیں اور بعض حضرات کو اس پر سخت اعتراض ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک اسلام کی دعوت کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس میدان میں جو شخص جو کام انجام دے سکتا ہے بہ طورِ خود انجام دے یا پھر زیادہ سے زیادہ یہ کہ وقتِ ضرورت کچھ افراد مل جل کر اسلام کی کوئی خدمت انجام دے لیں۔ وہ اس بات کو صحیح نہیں سمجھتے کہ محض اس غرض سے ایک مستقل تنظیم وجود میں آئے جو اسلام کی دعوت اور اس کے غلبہ کی تدابیر سوچے، اس کے لیے کوئی منصوبہ تیار کرے، اس منصوبے کے تحت افراد کو کام پر لگائے اور اس طرح کام کرے، جس طرح دنیا کی دوسری تحریکیں کام کرتی ہیں۔ چناں چہ آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے بہت سے افراد دل سے چاہتے ہیں کہ اسلام کے بارے میں جو غلط فہمیاں ہیں وہ دور ہوں اور وہ خوب پھیلے، ان میں ایسے افراد کی بھی کمی نہیں ہے جو بڑی محنت سے اسلام پر ریسرچ کرتے ہیں، اس کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی مقالے بھی تصنیف فرماتے ہیں، اس کے اصول ونظریات کو ثابت کرنے میں اپنی بہترین صلاحیتیں بھی صرف کرتے ہیں، غیر اسلامی افکار پر تنقید کرنے اور ان کی خامیاں واضح کرنے میں بھی پیش پیش ہیں۔

اس سے آگے جو لوگ ان کے ذوق کے مطابق اسلام کی خدمت کرتے ہیں وہ ان کی ہمت افزائی اور ستائش بھی کرتے ہیں اور اپنی حد تک ان کے ساتھ تعاون کرنے میں بھی انھیں دریغ نہیں ہوتا، لیکن اسلام کی یہی خدمت اگر افراد کے بجائے کوئی جماعت کرنا چاہے تو اس کا سارا کام ان کی نظر میں غلط قرار پاتا ہے اور وہ اس کے ساتھ کسی تعاون کے روادار نہیں ہوتے۔ گویا افراد کا اپنی شخصی حیثیت میں اسلام کے لیے جدوجہد کرنا تو درست ہے، لیکن ان کا اپنی قوتوں کو یکجا کر کے اس راہ پر لگانا نا درست ہے۔ ان کے اس اندازِ فکر اور طرزِ فکر کی کوئی دلیل آپ پوچھیں تو شاید وہ ایک ہی جواب دے سکیں گے اور وہ یہ کہ اسلام کی دعوت کے لیے تنظیم سازی کا کتاب وسنت اور دور اول میں کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اگر آپ ان کے اس استدلال کو تسلیم نہ کریں اور دلائل کے ذریعے تنظیم کی اہمیت ثابت کرنا چاہیں تو وہ فوراً کہیں گے کہ تمھارا ذہن غیر اسلامی تحریکات سے متاثر ہے۔ آج کل چوں کہ کسی بھی تحریک کے لیے تنظیم کو ضروری خیال کیا جاتا ہے، اس لیے تمھاری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ بغیر تنظیم کے اسلام کی دعوت کا کام کیسے کیا جائے؟

لیکن یہ اندازِ فکر عقلی لحاظ سے بھی غلط ہے اور جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے، قرآن، حدیث اور اسلامی تاریخ میں بھی اس کے لیے کوئی سند نہیں ہے۔ موجودہ دور کی تحریکیں تنظیم کو اگر ضروری سمجھتی ہیں تو اس کے یہ معنی کہاں سے نکل آئے کہ اسلام تنظیم کا مخالف ہے۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ دعوت خواہ اسلام کی ہو یا کفر کی، تنظیم دونوں کے لیے ناگزیر ہو۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انسان چلنے کے لیے پیر کا اور کسی چیز کو گرفت میں لینے کے لیے ہاتھ کا جس قدر محتاج ہے، اس سے زیادہ دعوت اپنی کامیابی کے لیے تنظیم کی محتاج ہے۔ تنظیم کے بغیر کوئی بھی تحریک کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ دنیا میں غلط اور صحیح ہر طرح کے نظریات اٹھتے رہتے ہیں۔ ان میں سے بعض نظریات نے بڑے زبردست انقلاب برپا کیے ہیں، لیکن پوری تاریخ میں کسی ایسے انقلاب کی نشان دہی نہیں کی جاسکتی جو غیر منظم اور منتشر افراد کی کوششوں سے وجود میں آیا ہو۔ اگر آپ مختلف تحریکوں کے آغاز اور ارتقاء کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ جس

طرح یہ ایک واقعہ ہے کہ نظریات پہلے افراد ہی کے ذہنوں میں پیدا ہوتے ہیں اور افراد ہی لوگوں کو ان کی طرف دعوت دیتے ہیں، اسی طرح یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ جب ان میں سے کسی نظریہ سے کچھ لوگ اتفاق کر لیتے ہیں تو ان کی ایک تنظیم بن جاتی ہے۔ اگر یہ تنظیم جان دار ہو تو اس میں آنے والے افراد اپنی فکر کو اس کی فکر میں، اپنے اعمال کو اس کے اعمال میں حتیٰ کہ اپنی شخصیت کو اس کی شخصیت میں گم کر دیتے ہیں۔ ان ہی افراد کی مدد سے تنظیم آگے بڑھتی اور پھیلتی ہے، دوسروں کو قریب کرتی اور ان پر غالب آنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ اگر کسی دعوت کے پیچھے اس طرح کی مضبوط تنظیم نہ ہو تو اس کی آواز فضا میں تحلیل ہو کر رہ جاتی ہے اور وہ وقت کے افکار و خیالات پر اپنا کوئی اثر چھوڑے بغیر ختم ہو جاتی ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ غلط نظریات بھی، اگر ان کو پھیلانے اور غالب کرنے کی منظم کوشش کی گئی، تو کامیاب ہو گئے اور صحیح فکر کو بھی اس وجہ سے غلبہ نہ حاصل ہو سکا کہ اس کو اچھی تنظیم میسر نہیں تھی۔

کسی دعوت کے غلبے کے لیے ضروری ہے کہ جس وقت جو کام کرنا اس کے لیے ضروری ہو اسے وہ انجام دے سکے، جو تدبیر سوچے اس کو اختیار کرنا اس کے لیے ممکن ہو، جو ذرائع و وسائل اس کو حاصل ہوں ان کا بہترین استعمال جانتی ہو، اس کے پاس اتنی طاقت ہو کہ علم و ادب، تہذیب و اخلاق اور حکومت و سیاست کا رُخ موڑ سکے۔ اتنی بڑی اور وسیع طاقت آج تک کسی ایک فرد کو نہ حاصل ہوئی ہے اور نہ آئندہ اس کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اس لیے کہ کسی بھی شخص کے اندر ہر کام کی صلاحیت اور طاقت نہیں ہوتی، وہ زیادہ سے زیادہ دو ایک ہی کام کر سکتا ہے اور جو کام بھی کر سکتا ہے وہ اتنے بڑے پیمانے پر نہیں کر سکتا کہ وہ ہر پہلو سے مکمل ہو اور تمام ضرورتیں پوری ہو جائیں۔ لیکن ایک اچھی تنظیم کے لیے یہ سب کچھ ممکن ہے۔ پانی کی ایک بوند سے سیلاب نہیں آتا لیکن بوند بوند پانی جمع ہو کر دریا کی شکل اختیار کر لے تو وہ سینۂ زمین کو چیرتا اور پہاڑوں کو کاٹتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح فرد کی صلاحیتیں گو محدود ہوتی ہیں لیکن بہت سے افراد جب کسی نظریہ کے تحت منظم ہو جائیں تو ان میں اتنی طاقت آ جاتی ہے کہ

وہ مخالف نظریات کو اکھاڑ پھینک کر فکر و نظر کی ایک نئی دنیا آباد کرسکتے ہیں۔ ایک اچھی اور مضبوط تنظیم میں مختلف صلاحیتوں کے افراد کا پایا جانا ناممکن نہیں ہے۔ اس وجہ سے جس کام کے لیے جن صلاحیتوں کی ضرورت ہے وہ ان صلاحیتوں کے افراد کو اس میں لگا سکتی ہے اور یہ بھی اس کے لیے ممکن ہے کہ جس محاذ پر ایک شخص ناکافی ثابت ہو وہاں وہ دس اشخاص کو بھیج دے۔

صحیح بات یہ ہے کہ جو لوگ اسلام کی دعوت کے لیے تنظیم کی مخالفت کرتے ہیں وہ غالباً یہ نہیں جانتے کہ یہاں کوئی دعوت کس طرح کامیاب ہوتی ہے اور اس کے لیے اسے کیا طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے؟

عجیب وغریب حیلے

بعض لوگ اسلام کی دعوت کے لیے تنظیم کو غلط نہیں سمجھتے، بلکہ اس کی اہمیت کو محسوس کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ اس کے لیے نہ تو کوئی عملی قدم اٹھانے کے لیے تیار ہوتے ہیں اور نہ کسی ایسی تنظیم ہی میں شامل ہونا چاہتے ہیں جو یہ کام کر رہی ہو۔ اپنی اس علاحدگی کے لیے ان کے پاس کچھ عذرات ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہاں ان عذرات پر بھی تھوڑی سی گفتگو ہو جائے۔ اس سے اندازہ ہو سکے گا کہ جو شخص فی الواقع اسلام کی خدمت کرنا چاہتا ہو اس کے لیے ان عذرات کی بنا پر بغیر تنظیم کے کام کرتے رہنا کہاں تک صحیح ہے؟

۱- ایک عذر تو یہ کیا جاتا ہے کہ بلاشبہ دعوت کے لیے تنظیم ضروری ہے، لیکن موجودہ حالات میں اس طرح کی تنظیم سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوگا۔ کیوں کہ ہم ایسے ماحول میں گھرے ہوئے ہیں جہاں غیر اسلامی افکار کی حکم رانی ہے اور اسلام کے خلاف شدید جذبات پائے جاتے ہیں۔ اس ماحول میں اسلام کو پھیلانے اور اس کو غالب کرنے کی منظّم جدوجہد میں اس بات کا سخت خطرہ ہے کہ برسرِ اقتدار نظریات اس کو اپنا حریف سمجھ بیٹھیں اور ماحول اسے برداشت کرنے سے قطعاً انکار کردے۔ اس خطرے سے اسی

طرح بچا جاسکتا ہے کہ افراد اپنے طور پر دعوت کا فرض انجام دیتے رہیں اور اسے کسی ایسی منظّم کوشش میں تبدیل نہ کریں، جس سے اقتدارِ وقت سے تصادم کی شکل پیدا ہو۔ اس لیے حکمت و دانائی کا تقاضا یہ ہے کہ کام کی وہی صورت اختیار کی جائے جس کے جاری رہنے کے امکانات ہوں اور اس طریقے کو اختیار نہ کیا جائے جو اصل مقصد ہی کو سرے سے ختم کر دے۔

غور کیجیے، کیا یہ کوئی معقول عذر ہے؟ ظاہر بات ہے کہ اسلام کی دعوت کے لیے اگر تنظیم ضروری ہے اور بغیر تنظیم کے اس کا حق ادا نہیں ہوسکتا ہے تو لازماً تنظیم کو وجود میں لانا ہوگا، خواہ حالات سازگار ہوں یا ناسازگار۔ پھر یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ مخالفت صرف منظّم دعوت ہی کی ہوگی، انفرادی کوشش کی نہ ہوگی۔ کیوں کہ اسلام کی دعوت بہرحال ایک انقلابی دعوت ہے وہ اس بات کا اعلان بن کر سامنے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس زمین پر تنہا اسی کا اقتدار ہونا چاہیے۔ سوائے اس کے اقتدار کے کسی کا اقتدار جائز نہیں ہے۔ یہ بات جب بھی کہی جائے گی، خواہ اس کے کہنے والی زبان ایک ہی کیوں نہ ہو، وقت کا اقتدار اس کو اپنے خلاف بغاوت ہی سمجھے گا اور اس کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جو کسی باغی کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔ آپ کسی ایسے دور کی نشان دہی نہیں کرسکتے جس میں اسلام کی دعوت اٹھی ہو اور اقتدارِ وقت نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کام میں آزمائشیں ہیں اور بڑی سخت آزمائشیں ہیں۔ ان سے کسی بھی حال میں بچا نہیں جاسکتا۔ اس کا حوصلہ وہی لوگ کرسکتے ہیں جن میں اقتدارِ وقت کے طیش کو برداشت کرنے کی ہمت ہو۔ کم ہمت انسان اس راہ میں دو قدم بھی نہیں چل سکتا۔

۲- دوسرا عذر یہ کیا جاتا ہے کہ ہمارے اندر بڑی خامیاں ہیں۔ ان خامیوں کے ہوتے ہوئے ہم کسی ایسی تنظیم میں شرکت کے اہل نہیں ہیں جو اسلام کی دعوت کا مقدس فریضہ انجام دے رہی ہو۔ جب تک ہم اپنی ان خامیوں کو دور نہ کرلیں اس کا ساتھ نہیں دے سکتے۔

اس عذر کو اگر عذرِ لنگ کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ خامیوں کا وجود کسی دعوتی تنظیم میں عدم شرکت کا جواز نہیں فراہم کرتا، بلکہ یہ ذمے داری عائد کرتا ہے کہ انھیں جلد سے جلد دور کیا جائے۔ اگر کسی شخص کے کپڑے پاک نہیں ہیں تو اس کے لیے صحیح روش یہ نہ ہوگی کہ وہ نماز ہی چھوڑ بیٹھے، بلکہ صحیح بات یہ ہوگی کہ اپنے کپڑے پاک کرے اور نماز پڑھے۔ ٹھیک اسی طرح جس شخص کی خامیاں اس نوعیت کی ہیں کہ وہ کسی اسلامی تنظیم میں شامل نہیں ہوسکتا تو اس کو ہر کام چھوڑ کر فوراً اپنی اصلاح کی طرف توجہ کرنی چاہیے اور اپنے آپ کو اسلام کی منظّم خدمت کے لیے تیار کرنا چاہیے۔ ان خامیوں کی موجودگی میں بے فکری اور سکون کے ساتھ زندگی گزارنا اس کے لیے درست نہیں ہے۔

خامیوں کے دور کرنے کا جب ذکر آتا ہے تو بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں اپنی کم زوریوں کا احساس ہے اور ہم ان کی اصلاح سے غافل نہیں ہیں۔ لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ زمانہ گزرتا چلا جاتا ہے اور ان کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ اپنی خامیوں کا عذر ان کو زندگی بھر اسلام کی راہ میں اپنا حصہ ادا کرنے سے باز رکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فی الواقع انھیں اپنی خامیوں کا احساس ہی نہیں ہے اور وہ اس اعتراف کو فرائض سے بچنے کے لیے ایک ڈھال کے طور پر استعمال کر رہے ہیں کیوں کہ صحیح احساس کے پیدا ہونے کے بعد ممکن نہیں ہے کہ انسان مستقل طور پر اپنی غلطیوں پر جما رہے اور ان پر قابو نہ پاسکے۔

۳- تیسرا عذر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ پہلے وہ تنظیم وجود میں آنی چاہیے جو صحیح خطوط پر اسلام کی دعوت کا کام کر رہی ہو اور جس کے اندر تقویٰ، خداترسی، اعلیٰ اخلاق، دین سے محبت، اس کے لیے ایثار و قربانی جیسے اوصاف لازماً موجود ہوں اور وہ اپنی خوبیوں کی وجہ سے ممتاز نظر آنے لگے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت کے لیے ایسی ہی تنظیم کی ضرورت ہے۔ چوں کہ اس دور میں ایسی کوئی تنظیم ہی نہیں پائی جاتی، لہٰذا ہم اسلام کے لیے منظّم جدوجہد کرنا چاہیں بھی تو نہیں کرسکتے۔

ہمارے خیال میں یہ بات غلط ہے کہ آج کوئی اسلامی تنظیم ہی موجود نہیں

ہے۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ اس وقت دنیا کے مختلف گوشوں میں بہت سی تنظیمیں صحیح نہج پر اسلام کی خدمت کر رہی ہیں۔ ان تنظیموں کے بارے میں اگر انسان بلاوجہ سوءِ ظن میں مبتلا نہ ہو تو دیکھ سکتا ہے کہ ان میں وہ اوصاف بھی ایک حد تک یقیناً موجود ہیں جو اسلام کی دعوت کے لیے مطلوب ہیں۔ اس لیے جو شخص اسلام کی دعوت کا کام کرنا چاہے اس کے لیے صحیح طریقہ کار یہ ہے کہ وہ خلوص کے ساتھ اپنے قریب کے ماحول کا جائزہ لے اور اس میں جو تنظیم اسلام کی دعوت کا فرض انجام دے رہی ہو اس سے وابستہ ہو جائے۔ اس طرح کی تنظیم سے الگ رہنا اس کے لیے اسی وقت صحیح ہوگا جب کہ اس کے اندر کوئی ایسی نمایاں خرابی ہو کہ اس کے بعد وہ دعوتِ دین کی اہل ہی نہ رہے۔ لیکن اگر اس میں چھوٹی موٹی خامیاں پائی جاتی ہوں تو ایک مومن کے شایانِ شان نہ تو یہ بات ہے کہ اس کو کم زور کرنے یا رسوا کرنے کی کوشش کرے اور نہ یہ بات کہ اس سے کنارہ کشی اختیار کرلے، بلکہ اس کے لیے صحیح رویہ یہ ہے کہ اس کے پاکیزہ مقصد میں اس کا ساتھ دے اور ساتھ ہی اس کی خامیوں کی اصلاح کی جدوجہد بھی کرتا رہے۔

تھوڑی دیر کے لیے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ کسی ملک میں بلکہ ساری دنیا میں ایسی کوئی تنظیم ہی نہیں ہے جس کو خالص اسلامی تنظیم کہا جاسکے، تو اس کی وجہ سے اسلام کے لیے اجتماعی جدوجہد کی جو ذمے داری اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مسلمان پر عائد ہوتی ہے وہ ساقط نہیں ہو جائے گی، بلکہ بدستور باقی رہے گی اور دہری ہو جائے گی۔ کیوں کہ اس وقت دو کام کرنے ہوں گے۔ ایک یہ کہ پہلے صحیح خطوط پر اسلام کی خدمت کرنے والی تنظیم قائم کرنے کی اَن تھک کوشش کی جائے۔ دوسرے یہ کہ جب ایسی تنظیم وجود میں آجائے تو اس کے ساتھ مل کر فریضۂ دعوت انجام دیا جائے۔ اس لیے کہ جس طرح اسلام کی دعوت فرض ہے اسی طرح اس فرض کو انجام دینے کے لیے جو وسائل درکار ہیں ان کا اختیار کرنا بھی ضروری ہے۔

قرآن و حدیث کی ہدایت

اب آیئے یہ دیکھیں کہ قرآن و حدیث نے اسلام کی دعوت کا کیا طریقہ بتایا ہے؟

سب سے پہلی بات یہ کہ قرآن و حدیث دونوں ہی نے بالکل واضح الفاظ میں مسلمانوں کو نظم و اتحاد کا حکم دیا ہے اور افتراق و انتشار سے منع کیا ہے۔ قرآن کی ہدایت ہے:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا (آل عمران: ۱۰۳) — سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑو اور الگ الگ نہ ہو جاؤ۔

اس موضوع سے متعلق حدیثیں بہ کثرت موجود ہیں۔ یہاں صرف ایک حدیث پیش کی جا رہی ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں:

علیکم بالجماعة و ایاکم والفرقة[1] — جماعت کو مضبوطی سے پکڑے رہو اور انتشار سے بچو۔

قرآن و حدیث کی ان ہدایات کے ساتھ آپ اس حقیقت کو بھی سامنے رکھیں کہ اسلام کی دعوت ایک ایسا وصف یا عمل ہے جو مسلمانوں کو کفر و شرک کے داعیوں سے الگ کرتا ہے۔ جو لوگ دنیا کو ضلالت کی راہ دکھاتے ہیں، ان میں اور مسلمانوں میں فرق یہ ہے کہ وہ ضلالت سے بچا کر اسلام کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ ان دونوں باتوں کو سامنے رکھ کر اب اس سوال پر غور کیجیے کہ اسلام کی دعوت کا صحیح طریقہ کیا ہوگا؟ کیا یہ قرآن و حدیث کے نزدیک ہر فرد کا اپنا کام ہے یا اس کے لیے وہ منظّم جدوجہد کو ضروری قرار دیتے ہیں؟ اس سوال کا ایک ہی جواب دیا جائے گا اور وہ یہ کہ اسلام کی دعوت کے لیے تنظیم ناگزیر ہے۔ کیوں کہ مسلمانوں کو جس نظم و اتحاد کا یہ عام و ہمہ گیر حکم دیا گیا ہے اس کا تعلق قدرتی طور پر نہ صرف یہ کہ اس عمل سے بھی ہونا چاہیے، بلکہ سب سے پہلے ہونا چاہیے جو ان کے اور دوسروں کے درمیان خط امتیاز کھینچتا ہے اور جو یہ بتاتا کہ ان کی جداگانہ حیثیت کیا ہے اور سب سے الگ ان کی اپنی شناخت کیا ہے؟ اگر ان کی تنظیم اس کارِ عظیم کے لیے نہ ہو تو اور کس مقصد کے لیے ہوگی؟ پھر یہ ممکن بھی کیسے ہے کہ کفر و شرک کے لیے جدوجہد کرنے والے تو منظّم ہوں اور اسلام کے داعیوں کو یہ

---

[1] جامع ترمذی، ابواب الفتن، باب ماجاء فی لزوم الجماعة، مسند احمد، ۵/۳۷۰، ۳۷۱

ہدایت دی جائے کہ اپنی دعوت کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے وہ اپنی قوتوں کو یک جا نہ کریں اور اپنی اپنی انفرادی کوششوں ہی پر اکتفا کیے رہیں؟ قرآن تو صاف صاف کہتا ہے کہ جس طرح اہلِ کفر و شرک اسلام کے خلاف متحد ہیں اسی طرح مسلمانوں کو بھی متحد ہو کر ان سے نبرد آزما ہونا چاہیے:

وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً (التوبۃ:۳۶)	مشرکوں سے سب مل کر لڑو، جس طرح وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں۔

غرض قرآن و حدیث کے الفاظ کا کھلا ہوا منشا یہ ہے کہ مسلمانوں میں اتحاد و تنظیم ہو اور یہ اصلاً اسلام کی دعوت کے لیے ہو۔ اس لیے اگر وہ دعوت کی سعی تو کریں لیکن اس کے لیے اپنی قوتوں کو مجتمع نہ کریں تو یہ کام اس نہج پر ہرگز نہ ہوگا، جس نہج پر قرآن و حدیث چاہتے ہیں۔ اسی طرح ان کی تنظیم تو ہو مگر وہ اسلام کی دعوت کے بجائے کسی اور غرض کے لیے ہو تو یہ وہ تنظیم نہ ہوگی جس کی اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کو تاکید کی ہے۔ یہی بات قرآن کی اِن دو آیتوں میں بیان ہوئی ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران:۱۱۰)	تم بہترین امت ہو جسے لوگوں (کی ہدایت و رہنمائی) کے لیے وجود میں لایا گیا ہے۔ تم معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو۔
وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرۃ:۱۴۳)	اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک بہترین امت بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر (اللہ کے دین کی) شہادت دینے والے ہو اور خدا کا رسول تم پر شہادت دینے والا ہو۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ مسلمان ایک 'امت' ہیں۔ ایسی امت جس کو پہلی آیت میں 'خیر امت' اور دوسری آیت میں 'امتِ وسط' کا خطاب دیا گیا ہے۔ 'امت' کا لفظ ظاہر کرتا ہے کہ مسلمان ایک شیرازے میں بندھے ہوئے ہیں اور ان کی زندگی منظّم اجتماعی زندگی ہے۔ کیوں کہ امت منتشر اور بے جوڑ افراد کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ لفظ ایسی

جماعت کے لیے بولا جاتا ہے، جس کو کسی مقصد نے ایک مرکز پر جمع کیا ہو۔ قرآن کے الفاظ میں دنیا کی یہ بہترین اور عدل پرور امت جس مقصد کے لیے وجود میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کو معروف کا حکم دے اور منکر سے منع کرے اور ان کے درمیان اللہ کے دین کی شہادت دے۔ اسی کو ہم سادہ الفاظ میں اسلام کی دعوت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسلام کی دعوت کے لیے ایک امت کا برپا کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کام تنظیم چاہتا ہے۔ کیوں کہ کسی بھی مقصد کے لیے تنظیم اسی وقت وجود میں آتی ہے جب کہ وہ اس کی تکمیل کے لیے ضروری ہو۔ جو کام انفرادی طور پر پورا ہوسکتا ہو اس کے لیے جماعت وجود میں نہیں آتی۔

محمد ﷺ کا اسوہ

اب یہ بھی دیکھئے کہ رسولِ خدا حضرت محمد ﷺ نے اسلام کی دعوت کا فرض کس طرح انجام دیا اور اس کے لیے کیا صورت اختیار فرمائی؟ کیوں کہ اس دعوت کے لیے وہی طریقہ صحیح ہوسکتا ہے جسے آپؐ نے پسند کیا اور اختیار فرمایا۔ تاریخ کے مطالعے سے آپؐ کا جو طریقۂ کار سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ آپؐ نے ایک طرف اسلام کی دعوت دی اور دوسری طرف اس دعوت کو جن لوگوں نے قبول کیا ان کو جوڑ کر ایک امت بنائی۔ یہ دعوت جیسے جیسے پھیلتی گئی اس کا دائرہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا رہا۔ ابتدا میں یہ امت گنتی کے چند افراد پر مشتمل تھی، لیکن جب آپؐ کا انتقال ہوا تو لاکھوں نفوس اس کا حصہ بن چکے تھے۔

آپؐ نے ایک منظّم امت برپا کی

بعض لوگ جب دیکھتے ہیں کہ آج کل جماعتوں کی تشکیل جن طریقوں سے ہوتی ہے، آپؐ کی امت کی تشکیل ان میں سے کسی طریقے سے نہیں ہوئی تھی اور جس طرح وہ منظّم ہوتی ہیں اس طرح آپؐ کی امت کی تنظیم نہیں ہوئی تھی تو خیال کر بیٹھتے ہیں کہ آپ کی امت ایک منظّم جماعت تھی ہی نہیں۔ لیکن یہ خیال تنظیم کی حقیقت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ محمد ﷺ کی امت میں، جیسا کہ آج کل کی

جماعتوں کا طریقہ ہے، داخلہ کی کوئی فیس نہیں تھی، اس کے لیے کوئی فارم پُر کرنا نہیں پڑتا تھا اور اس کا کوئی خاص یونیفارم نہیں تھا، لیکن اس طرح کی سطحی باتوں کی بنا پر یہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا کہ آپؐ کی امت غیر منظّم اور منتشر تھی۔ کیوں کہ ان باتوں کا تنظیم کی اصل اور حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کے بغیر بھی ایک اعلیٰ درجے کی تنظیم وجود میں آسکتی ہے اور ان کے ہوتے ہوئے بھی تنظیم کھوکھلی رہ سکتی ہے۔

افراد کو دو چیزیں منظّم کرتی ہیں۔ ایک ہے مقصداور اس سے تعلق اور دوسری چیز ہے قیادت اور اس کی اتباع۔ مقصد کے گرد لوگ اپنی جگہ سے اٹھ اٹھ کر جمع ہوتے ہیں اور اس سے جتنا تعلق ہوتا ہے اتنا ہی اس کو پانے کی تمنا ان میں ہوتی ہے اور وہ اس کے لیے جدوجہد کرتے اور قربانیاں دیتے ہیں۔ مقصد نہ ہوتو مختلف افراد کے درمیان کوئی ایسی قدر مشترک نہ ہوگی جو ان کو جوڑ سکے اور اس سے تعلق نہ ہوتو اس کی طرف بڑھنے اور اسے حاصل کرنے کا جذبہ مفقود ہوگا اور اس کے لیے کوئی کوشش نہیں کرسکیں گے۔ قیادت وہ متعین راہ دکھاتی ہے، جس سے مقصد حاصل ہوسکتا ہے اور افراد اس کی اتباع اس لیے کرتے ہیں تاکہ فی الواقع وہ مقصد ان کو حاصل ہوجائے۔ قیادت کے بغیر تنظیم میں یا تو جمود ہوگا یا انارکی۔ قیادت سے افراد میں حرکت بھی پیدا ہوتی ہے اور ان کی کوششوں کو ایک خاص رُخ بھی نصیب ہوتا ہے۔

افراد کو منظّم کرنے والی یہ دونوں چیزیں محمد ﷺ کی برپا کردہ امت میں پوری طرح موجود تھیں۔ وہ ایک عظیم مقصد کے لیے وجود میں آئی تھی۔ اسی مقصد کو ہم اسلام کی دعوت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس مقصد سے اس کو شدید محبت تھی، اس کی تبلیغ کا اس میں بے پایاں جوش تھا، اس کو پھیلانے اور غالب کرنے کی انتہائی تڑپ تھی اور اس کے لیے ایثار وقربانی کا بے پناہ جذبہ تھا۔ چناں چہ یہ ایک حقیقت ہے اور اس حقیقت سے اسلامی تاریخ سے واقف کوئی بھی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ اس امت نے اسلام اور اس کی دعوت کو کامیاب بنانے کے لیے اپنی پوری قوت صرف کی، اپنا بہترین سرمایہ لگایا، اس کا ہر فرد اس کو پھیلانے میں مستقل لگا رہا اور جس شخص میں اس کے جس مطالبہ کو پورا

کرنے کی صلاحیت تھی اس نے اسے فوراً پورا کیا۔ اس امت نے اس طرح کی مثالیں بھی پیش کیں کہ جس دین کو اس نے قبول کیا ہے اس کو مال کی ضرورت ہوئی تو ایک فرد نے اپنی آدھی دولت پیش کردی، اور دوسری شخصیت نے اٹھ کر اپنا کل اثاثہ ہی اس کے حوالے کر دیا۔ ایک موقع پر تنہا ایک شخص نے پورے لشکر کو ساز وسامان سے لیس کر دیا۔ امت کے جن اصحاب کے پاس دولت تھی وہ تو اس طرح اپنی دولت لٹا رہے تھے اور جو نادار تھے وہ اس غم میں آنسو بہا رہے تھے کہ انھیں اس راہ میں خرچ کرنے کی استطاعت نہیں ہے۔ اس امت کو جب آواز دی گئی تو وہ اپنی سرسبز وشاداب کھیتیوں، چلتے ہوئے کاروبار، محبوب اولاد اور چہیتی بیویوں سے منہ پھیر کر میدانِ جنگ کی طرف اس طرح دوڑ پڑی جیسے ان میں سے کسی چیز سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ امت کے ایک ایک فرد کو اس دعوت سے اتنی محبت تھی کہ جو اس سے محبت کرتا وہ اس کا دوست ہوتا اور جو اس سے عداوت رکھتا وہ اس کا دشمن قرار پاتا۔ خونی رشتہ دار بھی اگر اس دعوت کو مٹانے کے لیے آگے بڑھتے تو وہ ان کے خلاف صف آرا ہو جاتا اور جانی دشمن بھی اس کی تائید کے لیے کھڑا ہوتا تو وہ اس کو اپنا بچھڑا ہوا ساتھی سمجھ کر سینے سے لگا لیتا۔ غرض اس امت نے اور اس کے ایک ایک فرد نے اس دعوت کے لیے وہ سب کچھ کیا جو کوئی بھی انسانی گروہ کرسکتا ہے۔ بڑی بڑی قربانیاں دیں۔ رات کی نیند چھوڑی، دن کی مصروفیت چھوڑی، جان مانگی تو جان نذر کردی، مال چاہا تو مال پیش کردیا، یہی نہیں بلکہ جس وقت جس قسم کے تعاون کی اس کو ضرورت پڑی انھوں نے وہ تعاون اس طرح پیش کیا جیسے ان کی کوئی مراد بر آئی ہو اور جیسے وہ پہلے سے اس کے لیے تیار ہوں۔

پھر اس پورے کام میں محمد ﷺ بہ نفسِ نفیس اس امت کی قیادت فرما رہے تھے، بلکہ اس امت میں وہی شخص داخل ہوتا تھا جو اس حقیقت کا دل سے اعتراف کرچکا ہوتا کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں اور آپ کا ہر حکم واجب الاتباع ہے۔ اس طرح ایک ایسی امت تشکیل پا رہی تھی، جس میں لوگ آپؐ کے زیرِ قیادت صدقِ دل سے جمع ہو رہے تھے اور آپؐ کی ہدایت کے مطابق عمل کر رہے تھے۔ اس امت کے سمع و اطاعت کا یہ

حال تھا کہ محمد ﷺ کی طرف سے جس شخص کو جو حکم دیا جاتا وہ اس کی تعمیل کے لیے بے چین ہو جاتا۔ آپؐ نے انھیں ہجرت کا حکم دیا تو ان کو وطن چھوڑنے میں کوئی پس و پیش نہ ہوا، خاندان اور قبیلے سے ترکِ تعلق کا حکم دیا تو بہ خوشی الگ ہوگئے۔ مصائب پر صبر کی تلقین کی تو زبان سے حرفِ شکایت نکالنا بھول گئے، جہاد کا حکم دیا تو سر کٹانے میں فخر محسوس کرنے لگے۔ اطاعتِ امر کا یہ جذبہ نہ تو اس سے پہلے کسی تنظیم میں دیکھا گیا اور نہ اس کے بعد ایسی کوئی مثال وجود میں آئی۔ اس پہلو سے دیکھئے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس امت میں وہ تمام خصوصیات بدرجۂ اتم موجود تھیں جو کسی معیاری تنظیم کے لیے مطلوب ہیں۔ ان خصوصیات نے پوری امت کو جسدِ واحد بنا دیا تھا اور اس میں اس سے زیادہ نظم و اتحاد پیدا کر دیا تھا جتنا دنیا کی کسی دوسری تنظیم میں ہوسکتا ہے۔ اس امت کا ہر فرد اسی مقصد کے لیے سرگرداں تھا جو امت کا مقصد تھا اور امت وہی کام انجام دے رہی تھی جو اس کا ایک ایک فرد انجام دے رہا تھا۔ جب پوری امت نے محمد ﷺ کی قیادت میں شب و روز اس طرح جاں فشانی کی تو اسلام کو غلبہ اور اس کی دعوت کو کام یابی حاصل ہوئی۔

دعوت کی کامیابی کا مفہوم صرف یہ نہیں ہے کہ وہ مخالف قوتوں کو زیر کر کے برسرِ اقتدار آجائے بلکہ اس کی کامیابی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اقتدار پانے کے بعد اپنے نقشے کے مطابق کاروبارِ زندگی کو چلا کر دکھائے۔ یہ کام اسی وقت ممکن ہے جب کہ اس کے پاس ایسے افراد ہوں جو اقتدار کے نشے میں اپنے نظریات کو بھول نہ جائیں، جو خوشی اور غم اور راحت اور تنگی کسی بھی حال میں اپنے فلسفۂ حیات سے دست بردار نہ ہوں، جو یہ ماننے کے لیے کبھی تیار نہ ہوں کہ دنیا کا کوئی نظامِ فکر و عمل ان کے نظامِ فکر و عمل سے بہتر ہے اور اسے اختیار کیا جاسکتا ہے۔ جن کو یہ یقینِ کامل ہو کہ وہ حق پر ہیں اور اس حق کو نافذ کرنا ان کا فرض ہے۔ اگر اس طرح کے افراد کسی تنظیم کے پاس نہ ہوں تو وہ سیاسی انقلاب برپا کرنے میں کامیاب ہونے کے باوجود فکری اور تہذیبی انقلاب لانے میں ناکام رہے گی اور جن نظریات کو قائم و غالب کرنے کے لیے وہ دنیا سے جنگ کر رہی تھی، اپنے ہی ہاتھوں سے ان کو مٹانے لگے گی۔

اللہ کے رسول محمدﷺ کے زیر قیادت جو تنظیم وجود میں آئی اس کا کمال یہ ہے کہ اس میں صرف سیاسی انقلاب لانے ہی کی صلاحیت نہیں تھی، بلکہ وہ ایک فکری اور تہذیبی انقلاب لانے میں بھی کامیاب رہی۔ کیوں کہ اس انقلاب کے لیے جتنے اونچے درجے کے افراد مطلوب تھے وہ سب اس تنظیم سے فراہم ہونے لگے اور زندگی کے کسی گوشے میں یہ محسوس نہیں ہوا کہ وہ اپنا فکر نافذ کرنے میں ناکام ہے۔ جب آپؐ کی دعوت غالب ہوئی تو معلوم ہوتا تھا کہ اس کو چلانے کے لیے پوری طرح تربیت یافتہ معلّم اور مدرّس بھی ہیں، قاضی اور جج بھی ہیں، خطیب اور شاعر بھی ہیں، گورنر اور وائسرائے بھی ہیں، فوج کے کمانڈر اور سپہ سالار بھی ہیں، سفیر اور ترجمان بھی ہیں، سیاست داں اور حکم راں بھی ہیں۔ غرض ایک پوری جماعت ہے جو دعوت کی ہر ضرورت پوری کرسکتی ہے۔ غور کیجیے! کیا یہ سب کچھ بغیر تنظیم کے ہوا؟ اگر اس میں بھی تنظیم نہیں تھی تو کہنا چاہیے کہ آج تک اس دنیا میں کوئی تنظیم ہی وجود میں نہیں آئی۔

امت کی تنظیم کا زوال

یہ ہے وہ طریقۂ کار جو محمدﷺ نے اسلام کی دعوت کے لیے اختیار فرمایا۔ جب آپؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے تو آپؐ کی امت ہر پہلو سے منظّم اور متحد تھی۔ آپؐ کے بعد بھی امت کی یہ تنظیم باقی رہی اور اس کے ذریعے اسلام کی توسیع و تبلیغ زبردست خدمت انجام پائی۔ اس نے دور دراز ملکوں میں اسلام کی تبلیغ کی، اسے پھیلایا، اس کے لیے جہاد کیا، یہاں تک کہ متمدن دنیا کے ایک بڑے حصے میں اسلام کی حکومت قائم کردی۔ لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا امت کی اس تنظیم کو کم زوری لاحق ہوتی چلی گئی۔ بالآخر ایک وقت آیا جب کہ امت تو موجود تھی لیکن اس کا نظم و اتحاد ختم ہو چکا تھا۔ حالاں کہ رسول اللہﷺ نے بار بار تاکید فرمائی تھی کہ لوگ جماعت سے وابستہ رہیں۔ کیوں کہ جماعت سے علاحدگی انسان کو اسلام سے دور کردیتی ہے۔ چناں چہ آپؐ کا ارشاد ہے۔

اَنَّهُ مَنْ خَرَجَ مِنَ الْجَمَاعَةِ قِيدَ شِبْرٍ فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْإِسْلَامِ مِنْ عُنُقِهِ[۱]

جو شخص جماعت سے بالشت بھر بھی باہر نکل آیا اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے اتار پھینکا۔

آپؐ کی ہدایت تو یہ تھی کہ مسلمانوں کی چھوٹی سے چھوٹی جماعت کو حتیٰ کہ جنگل میں رہنے والے تین افراد کو بھی منظم ہونا چاہیے۔ لیکن مسلمان کروڑوں کی تعداد میں ہوتے ہوئے بھی اس طرح بکھر گئے جیسے کوئی چیز ان کو جوڑنے والی نہیں ہے۔ آپؐ کتنے صاف الفاظ میں فرماتے ہیں:

لَا يَحِلُّ لِثَلٰثَةِ نَفَرٍ يَكُوْنُوْنَ بِاَرْضِ فَلَاةٍ اِلَّا اَمَّرُوْا عَلَيْهِمْ اَحَدَهُمْ[۲]

ایسے تین آدمیوں کے لیے بھی جو بیابان میں ہوں (بغیر کسی نظم کے رہنا جائز نہیں ہے، ان کے لیے) ضروری ہے کہ وہ اپنے میں سے کسی ایک کو اپنا امیر بنائیں اور اس کے ماتحت رہیں۔

آپؐ نے فرمایا کہ اگر مسلمانوں میں اتحاد ہے اور وہ ایک جماعت بن گئے ہیں تو کوئی بڑے سے بڑا شخص بھی ان کے نظم و اتحاد میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کرے تو اس کا سر قلم کر دیا جائے۔

مَنْ اَرَادَ اَنْ يُّفَرِّقَ اَمْرَ هٰذِهِ الْاُمَّةِ وَ هِيَ جَمِيْعٌ فَاضْرِبُوْهُ بِالسَّيْفِ كَائِنًا مَنْ كَانَ[۳]

یہ امت جب متحد ہو تو جو شخص اس میں انتشار پیدا کرنا چاہے اس کو تلوار سے اڑا دو خواہ وہ کوئی بھی ہو۔

افسوس ہے ان ہدایات پر عمل نہیں ہوا، ورنہ مسلمانوں کی جمعیت نہ ٹوٹتی اور وہ ان نقصانات سے محفوظ رہتے جو اس جمعیت کے ٹوٹنے سے ان کو لاحق ہوئے۔ کیا آپ نے سوچا کہ مسلمانوں کی جماعت میں انتشار پیدا کرنے والا اس قدر ناقابل برداشت کیوں ہے کہ اس کا خون تک حلال ہو جائے؟ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اسلام دنیا کا نظام جس ڈھنگ سے چلانا چاہتا ہے وہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ اس کے ماننے والے منظم اور متحد ہوں۔ ان کے اندر تنظیم نہ ہو تو اس نظام کے چلنے کا بھی کوئی امکان

---

۱ جامع ترمذی، ابواب الأدب، باب ماجاء فی مثل الصلوٰة والصیام و الصدقة، مسند احمد: ۱/۲۷۵، ۲۹۷ ۲ مسند احمد: ۲/۱۷۷

۳ صحیح مسلم، کتاب الأمارة، باب حکم من فرق امر المسلمین

نہیں ہے۔ اس لیے جو شخص مسلمانوں کے اتحاد کو ختم کر رہا ہے وہ حقیقت میں اسلام کے قائم کردہ نظام کو پارہ پارہ کر رہا ہے۔ چناں چہ آپ دیکھیں گے کہ مسلمانوں کا اتحاد ختم ہوتے ہی اسلام جو ایک وسیع خطۂ ارض میں غالب تھا مغلوب ہوکر رہ گیا۔ اس کے ساتھ دوسرا نقصان یہ ہوا کہ مسلمانوں کی توجہ بحیثیت ایک امت اسلام کی دعوت و تبلیغ اور توسیع و ترقی کی طرف نہیں رہی۔ اس میں شک نہیں کہ ہر دور میں کارِ دعوت انجام پاتا رہا لیکن اس کو انجام دینے والے زیادہ تر افراد تھے یا مسلمانوں کے چند چھوٹے چھوٹے گروہ۔ ان سب کی خدمات کے اعتراف کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ امت اگر پوری کی پوری اس طرف متوجہ ہوتی اور اس کے لیے اس کی مساعی جاری رہتیں تو اس کے نتائج ان نتائج سے یقیناً بدرجہا بہتر ہوتے جو افراد اور چند چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی کوششوں سے رونما ہوئے۔

کرنے کا کام

امت کی تنظیم جب ٹوٹ گئی تو اس کے لیے صحیح صورت یہ تھی کہ وہ جلد سے جلد اپنی سابقہ حالت کی طرف لوٹتی اور ازسرِ نو اسلام کی دعوت میں لگ جاتی۔ لیکن یہ ایک افسوس ناک واقعہ ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ اس سلسلے میں بعض کوششیں ہوئیں بھی تو وہ پوری طرح کامیاب نہیں ہوسکیں۔ اس کے اسباب جو کچھ بھی ہوں، لیکن امت کی یہ حالت بہرحال وہ حالت نہیں تھی، جس میں محمد ﷺ نے اسے چھوڑا تھا اور جس پر اسے قائم رہنے کی تاکید فرمائی تھی۔ اب جن لوگوں کو اس صورتِ حال کا احساس ہے ان کے کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ پہلے وہ خود ہر طرف سے کھنچ کر منظم ہوں جس کے لیے ان کے اسلاف محمد ﷺ کے زیرِ قیادت منظم ہوئے تھے، پھر امت کے دیگر افراد اور گروہوں کو اسی مقصد کے لیے مجتمع کرنے کی کوششیں کریں۔ اگر یہ امت صحیح معنی میں متحد ہوجائے اور اس کا یہ اتحاد اسلام کے لیے ہو تو کچھ بعید نہیں کہ دنیا میں پھر وہی انقلاب آئے، جس کا نمونہ وہ چودہ سو سال پہلے ایک مرتبہ دیکھ چکی ہے۔ وَّ مَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ۝٢٠

تنظیم کیسے مستحکم ہوتی ہے؟

تنظیم کو طاقت اندر سے ملتی ہے۔ اگر وہ داخلی طور پر مضبوط ہے تو اسے ختم کرنا آسان نہیں ہے، لیکن جو تنظیم اندر سے کھوکھلی ہو وہ بغیر کسی مزاحمت کے بھی ختم ہوسکتی ہے۔ تنظیم کا حقیقی سرمایہ اس سے وابستہ افراد ہیں۔ جو شخص تنظیم سے باہر ہے وہ اس کا خیرخواہ تو ہوسکتا ہے لیکن اس کی تقویت کی حقیقی اساس اور اصل ذریعہ نہ ہوگا۔ اس لیے تنظیم کو باقی رکھنا، اسے مضبوط بنانا اور اسے ترقی دینا تنظیم سے باہر کے افراد کا کام نہیں بلکہ ان لوگوں کا فرض ہے جو اس میں داخل ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر وہ شخص جو کسی تنظیم سے تعلق رکھتا ہو اس کے استحکام کا ذریعہ نہیں بن جاتا بلکہ ان ہی افراد سے تنظیم کو طاقت حاصل ہوتی ہے جن میں کچھ خصوصیات ہوں۔ یہاں ان ہی خصوصیات کو بیان کرنے کی کوشش ہوگی۔ اس کے براہِ راست مخاطب وہ افراد ہیں جو اللہ تعالیٰ کے دین کی ٹھیک ٹھیک اتباع اور اس کی ہمہ جہت دعوت کے لیے اپنے آپ کو منظّم کرچکے ہیں۔

اجتماعیت کا احساس

گزشتہ صفحات میں یہ بات دلائل کے ساتھ اور پوری تفصیل سے سامنے آچکی ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے مسلمانوں کے لیے انفرادی زندگی نہیں، بلکہ اجتماعی زندگی پسند کی ہے، ان کو مختلف جماعتوں میں تقسیم نہیں کیا ہے، بلکہ ایک جماعت بنایا

ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ مسلمان عرصۂ دراز سے اس ہدایت کو فراموش کر چکے ہیں۔ وہ ایک ملت تھے لیکن گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ ان کو ایک منظّم جماعت ہونا چاہیے تھا، لیکن وہ منتشر اور پراگندہ ہیں۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ ان کو جوڑنے اور متحد کرنے والی چیز اللہ کی کتاب تھی۔ اس کتاب کو انھوں نے اپنی زندگی سے عملاً خارج کر دیا۔ اس کے ساتھ انھوں نے اس طرح سلوک کیا جیسے وہ ان کے لیے نہیں ہے۔ اللہ کا حکم تھا کہ وہ اپنے اختلافات میں اس کتاب کو 'حَکَم' بنائیں، لیکن انھوں نے اپنے اختلافات کے حل کے لیے وہ سب طریقے اختیار کیے جو دنیا والے اختیار کرتے ہیں اور اس کتاب کی طرف رجوع نہیں کیا۔ ان کو حکم تھا کہ وہ اپنی پوری زندگی اللہ کی کتاب کے مطابق بسر کریں، لیکن انھوں نے زندگی کی تعمیر کے لیے اللہ کے دشمنوں کے بتائے ہوئے طریقے اختیار کیے اور اس کی کتاب کے احکام چھوڑ دیے۔ ان کو ہدایت تھی کہ عبادت، اخلاق، معاشرت، حکومت غرض ہر کام میں اللہ کی کتاب کو راہ نما بنائیں، لیکن انھوں نے ان تمام معاملات میں اپنے نفس کی، خاندان اور قبیلے کی، رسم و رواج کی، اقتدار وحکومت کی اتباع کی اور اللہ کی کتاب کو نظر انداز کر دیا۔ ان حالات میں آپ اللہ تعالیٰ کی کتاب کی بنیاد پر جمع ہوئے ہیں اور مل جل کر اس کی رسی کو مضبوط پکڑنے کا عزم کیا ہے۔ یہ بہت بڑی سعادت ہے جو آپ کو ملت کے اس دورِ انتشار میں ملی ہے۔ اس کی دل سے قدر کرنا اور اس کو مضبوط بنانا آپ کا فرض ہے۔

آپ کی اجتماعیت کا ایک دوسرا رُخ بھی ہے۔ وہ یہ کہ آپ اللہ کی کتاب کے ذریعے صرف اپنی زندگی ہی سنوارنا نہیں چاہتے بلکہ دنیا کو اس کتابِ ہدایت کی طرف دعوت دینا بھی چاہتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ عام مسلمان گو اللہ کے دین سے بہت دور ہیں۔ لیکن اس کے باوجود آج بھی ان میں اللہ کی عبادت و اطاعت کا جذبہ رکھنے اور اس کے دین کی خدمت کرنے والے موجود ہیں۔ ان میں جس چیز کی کمی ہے وہ یہ ہے کہ ان میں اجتماعیت نہیں ہے۔ وہ متحد و متفق اور منظّم ہوکر یہ خدمت انجام نہیں دے رہے

ہیں۔ اسی وجہ سے اس کے وہ نتائج نہیں نکل رہے ہیں جو فی الواقع نکل سکتے تھے۔ آج بدی اس قدر منظّم اور طاقت ور ہے کہ کوئی بڑی سے بڑی شخصیت بھی تنہا اسے ختم نہیں کرسکتی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ نیکی بھی منظّم ہو۔ یہی کام آپ کے پیش نظر ہے۔

جب اللہ کے دین کے خادم بکھرے ہوئے ہیں آپ نے دین کی خدمت کے لیے اجتماعیت کا فیصلہ کیا ہے اور جب آپ کے چاروں طرف بدی منظّم ہے تو آپ نیکی کے لیے منظّم ہوئے ہیں۔ آپ کا یہ اقدام اللہ اور اس کے رسولؐ کی مرضی کو پورا کرنے والا ہے۔ اس پر اللہ کا شکر ادا کیجیے اور استقامت کی دعا کیجیے۔

آپ ایک ایسی تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں جو دین کی خدمت کے لیے وجود میں آئی ہے، جو دنیا سے شر کو مٹانا اور خیر کو پھیلانا چاہتی ہے۔ اس کو کسی بھی پہلو سے نقصان پہنچانا دین کو نقصان پہنچانا ہے۔ اس لیے کوئی بھی کام کرنے سے پہلے آپ کو یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ اس تنظیم کے لیے نقصان دہ تو نہیں ہے۔ اگر آپ اپنے کاموں میں اس کے نفع وضرر کو بھول جائیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے اندر اس کی اہمیت کا وہ احساس نہیں ہے جو ہونا چاہیے۔

کوئی بھی تنظیم یا جماعت اسی وقت مضبوط ہوتی ہے جب کہ افراد کو اس کے استحکام کی فکر ہو۔ یہ فکر اجتماعیت کے احساس سے پیدا ہوتی ہے۔ اجتماعیت کا احساس جتنا قوی ہوگا تنظیم سے تعلق بھی اسی قدر مضبوط ہوگا۔ اگر یہ احساس کم ہوجائے تو اس سے تعلق بھی کم زور ہوجائے گا۔ اجتماعیت کا احساس زندہ اور قوی ہے تو آدمی نہ صرف یہ کہ تنظیم کی خاطر بڑے سے بڑا نقصان برداشت کرلیتا ہے بلکہ وہ ہر اس کوشش کو پوری قوت سے ناکام بنا دیتا ہے جو اس کے شیرازے کو منتشر کرنے والی ہے۔ لیکن اگر اجتماعیت کے احساس میں کمی ہے تو معمولی بات پر بھی آدمی تنظیم سے الگ ہوجانا چاہتا ہے۔ اس سے آگے اگر اجتماعیت کا احساس ہی ختم ہوجائے تو انسان تنظیم کی پابندیوں سے گھبرا کر اس سے علاحدگی کے لیے عذرات تلاش کرنے لگتا ہے۔

یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض لوگ تنظیم کے اندر جب کوئی بات اپنے مزاج کے خلاف دیکھتے ہیں یا اس کا کوئی فیصلہ ان کی رائے اور خواہش کے علی الرغم ہوتا ہے تو وہ اس سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ گویا تنظیم کے ساتھ ان کی رفاقت اس شرط کے ساتھ ہے کہ اس کے فیصلے ان کی مرضی کے مطابق ہوں۔ وہ اپنی شخصیت کو تو اس کی رائے کے سامنے جھکا نہیں سکتے، البتہ اس کو ان کی رائے اور فیصلے کے مطابق جھک جانا چاہیے۔ اگر کسی جماعت کا ہر فرد اس چیز کا مطالبہ کرنے لگے تو جماعت نہ کوئی فیصلہ کرسکتی ہے اور نہ کسی معاملے میں اقدام اس کے لیے ممکن ہے۔

بعض لوگوں کے نزدیک جماعت سے علاحدگی کے لیے اتنی بات کافی ہوتی ہے کہ انہیں فلاں شخص سے شکایت ہے۔ اگر ان کی اس شکایت کو صد فی صد درست بھی مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جماعت کے لیے کسی کے غلط رویے یا کسی کی سخت کلامی کو بھی برداشت نہیں کرسکتے۔ ایسے لوگ قطعاً اس قابل نہیں ہیں کہ کسی جماعت کے ہم رکاب ہوں۔ وہ جماعت کے لیے بوجھ ہیں۔ ان کا جماعت سے الگ ہونا خود جماعت کے لیے مفید ہے۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگ اپنی شخصی خامیوں کو تنظیم کی طرف منسوب کرکے اس سے بے زاری کا اعلان کر دیتے ہیں۔ مثلاً اگر ان میں تنظیم کے مقصد سے انحراف ہے تو اسے وہ اپنی غلطی سمجھنے کے بجائے تنظیم کو اپنے مقصد سے منحرف قرار دیں گے۔ اگر ان میں بے عملی ہے تو اس بے عملی کو دور کرنے کے بجائے تنظیم ہی کو بے عمل ثابت کریں گے، اگر ان میں تقویٰ، نیکی اور دیانت و امانت کی کمی ہے تو بجائے اپنی اصلاح کے پوری تنظیم ہی کو خدا کے خوف سے بے نیاز اور دیانت و امانت سے خالی ثابت کریں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھیں اپنی اصلاح سے زیادہ تنظیم کو بدنام کرنے کی فکر ہے۔ حالاں کہ اگر وہ اپنی اصلاح کرسکیں تو یہ ان کی ذات کے لیے بھی بہتر ہے اور اس تنظیم کے لیے بھی جس سے وہ وابستہ ہیں۔

یہ تمام خرابیاں نتیجہ ہیں اس بات کا کہ آدمی میں اجتماعیت کا شعور نہیں ہے اور اگر ہے تو بہت کم زور ہے۔ اگر اجتماعیت کا صحیح معنی میں شعور ہو اور دین کی خدمت کے لیے انسان اجتماعیت کو ضروری سمجھے تو وہ اس نعمت کی قدر کرے گا کہ اسے اجتماعیت مل رہی ہے۔ وہ کبھی بھی اس سے فرار کی راہ اختیار کرنے کی تدبیر نہیں کرے گا، بلکہ اس کی کوشش یہ ہوگی کہ وہ ہر حال میں اس سے وابستہ رہے۔ اگر اس میں کوئی ایسی خامی ہے جس کی وجہ سے وہ اس اجتماعیت کے لیے موزوں نہیں ہے تو اپنی خامی کو دور کرے گا تا کہ اس کا اہل قرار پائے اور کبھی کوئی ایسا اقدام نہیں کرے گا، جس سے ایک ایسی تنظیم کو نقصان پہنچے جو کسی دنیوی غرض کے لیے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت کے لیے اٹھی ہے۔

اطاعتِ امر

ہر تنظیم اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اس کا کوئی سربراہ ہو۔ بغیر سربراہ کے تنظیم کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ کوئی بھی تنظیم اسی وقت وجود میں آتی ہے، جب کہ کچھ لوگ کسی کو اپنا قائد اور راہ نما مانیں اور اس کی اطاعت کے لیے تیار ہو جائیں۔ تنظیم کا فطری تقاضا یہ ہے کہ قائد جو حکم دے تنظیم کے افراد اس کی اطاعت کریں۔ اگر تنظیم کا کوئی فرد اپنے قائد کا حکم نہ مانے تو تنظیم اسے برداشت نہیں کرسکتی۔ کیوں کہ اسے برداشت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تنظیم ختم ہوگئی اور اس میں کوئی حکم دینے والا اور کوئی حکم کا ماننے والا نہیں رہا۔

ہر تنظیم کے کچھ اصول ونظریات ہوتے ہیں، جن کے لیے وہ وجود میں آتی اور تگ و دو کرتی ہے۔ تنظیم کے قائد کا فرض ہے کہ خود بھی ان اصول ونظریات پر عمل کرے اور دوسروں کو بھی ان پر لے کر چلے۔ جب تک وہ یہ کام کر رہا ہے تنظیم کے ہر فرد کو اس کے ہر حکم کی اطاعت کرنی چاہیے۔ خواہ وہ اسے پسند ہو یا ناپسند، خواہ وہ اس کے رجحان کے خلاف ہو یا موافق۔ بلکہ بعض اوقات اس کے سامنے بہت سی چیزیں ایسی بھی آئیں گی جن کو وہ اپنی ذات ہی کے لیے نہیں بلکہ جماعت کے لیے بھی مضر

سمجھے گا۔ اگر یہ چیزیں ان اصول ونظریات کے تحت ہیں جن پر تنظیم کی اساس ہے تو اسے ان چیزوں کو بھی گوارا کرنا ہوگا۔ امیر یا سربراہ کی اطاعت سے انحراف کا حق صرف اسی وقت اسے حاصل ہے جب کہ اس کا کوئی حکم ان اصول ونظریات کے صریح خلاف ہو جن کے لیے تنظیم وجود میں آئی ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

اَلسَّمْعُ وَالطَّاعَةُ عَلَى الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ فِيْ مَا اَحَبَّ وَ كَرِهَ مَا لَمْ يُؤْمَرْ بِمَعْصِيَةٍ فَاِذَا اَمَرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ [1]

مردِ مسلم پر اپنے حاکم کی اطاعت لازم ہے۔ اس معاملے میں بھی جس کو وہ پسند کرتا ہے اور اس معاملے میں بھی جسے وہ ناپسند کرتا ہے۔ جب تک کہ اس کو معصیت کا حکم نہ دیا جائے اگر معصیت کا حکم دیا جائے تو اس کے لیے سمع و طاعت صحیح نہیں ہے۔

اسی مفہوم کی حدیث حضرت امّ الحصین رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اِنْ اُمِّرَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ مُجَدَّعٌ يَقُوْدُكُمْ بِكِتَابِ اللّٰهِ فَاسْمَعُوْا لَهٗ وَ اَطِيْعُوْا [2]

کوئی غلام جس کے ناک کان کٹے ہوں اگر وہ بھی تمھارا امیر بنا دیا جائے تو اس کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو اگر وہ اللہ کی کتاب کے مطابق تمھاری قیادت کر رہا ہے۔

حضرت عبادہ بن صامتؓ فرماتے ہیں:

بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِى الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ

ہم نے رسولِ اکرمؐ سے بیعت کی کہ ہم اپنے امیر کا حکم مانیں گے اور اس کی اطاعت کریں گے۔ خواہ ہم راحت میں ہوں یا تکلیف میں، خواہ اس کے حکم سے خوش ہوں یا ناخوش، اور خواہ ہمیں نظر انداز کیا جائے اور ہمارے مقابلے

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الجهاد و کتاب الاحکام، صحیح مسلم، کتاب الامارة باب وجوب طاعة الامراء فی غیر معصية

[2] صحیح مسلم، کتاب الحج، باب استحباب رمی جمرة العقبة ... الخ

وَ عَلٰی أُثْرَةٍ عَلَیْنَا وَ عَلٰی اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَهٗ وَ عَلٰی اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا كُنَّا لَا نَخَافُ فِی اللّٰہِ لَوْمَةَ لَائِمٍ و فی روایة و عَلٰی اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمر اَھْلَهٗ اِلَّا ان تَروا كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَكُمْ مِنَ اللّٰہِ فِیْهِ بُرْھَانٌ[1]

میں دوسروں کو ترجیح دی جائے۔ ہم نے اس بات کی بھی بیعت کی کہ ہم اپنے حاکم سے حکومت چھیننے کی کوشش نہیں کریں گے۔ (اس کے ساتھ یہ بھی کہ) ہم حق بات کہیں گے جہاں بھی ہوں گے اور اللہ کے (دین کے) معاملہ میں کسی ملامت گر کی ملامت کی پروا نہیں کریں گے۔ ایک روایت کے الفاظ اس طرح ہیں کہ ہم صاحبِ امر سے اقتدار چھیننے کی کوشش نہیں کریں گے سوائے اس کے کہ تم اس سے صریح کفر دیکھو جس کے کفر ہونے پر تمھارے پاس اس کی طرف سے واضح دلیل ہو (تو تمھیں اس سے حکومت چھیننے کا بھی حق ہے)۔

اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان کے لیے دیکھنے کی بات صرف یہ ہے کہ اس کے حاکم کا کوئی حکم اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم کے خلاف ہے یا نہیں؟ اگر خلاف نہیں ہے تو اس کی اطاعت اس پر فرض ہے لیکن اگر اس کا حکم اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم کے خلاف ہے تو وہ قطعاً اس کی اطاعت نہیں کرے گا بلکہ اس کو اس کے منصب سے ہٹانے کا جواز بھی اسے حاصل ہوگا۔

ان حدیثوں میں اصلاً مسلمانوں کے اندر وجود میں آنے والی کسی ایسی جماعت کے راہ نما کی حیثیت نہیں بیان ہوئی ہے، جس کو سیاسی اقتدار حاصل نہیں ہے، بلکہ ان میں اس مسلم فرماں روا کا ذکر ہے جو مسلمانوں کے دینی و دنیوی معاملات میں ان کی صحیح قیادت کا قانوناً ذمے دار ہو اور بزور ان کو قرآن و حدیث کے احکام کا پابند بنا سکتا ہو۔ لیکن ان احادیث سے بہرحال اس تعلق کی نوعیت سمجھی جاسکتی ہے جو اس سے کم تر درجے کے مسلمان راہ نما اور اس کی اتباع کرنے والوں کے درمیان ہونا چاہیے۔ مسلمانوں کا سیاسی حاکم قوت کے ذریعے ان پر اپنا حکم نافذ کرسکتا ہے لیکن سیاسی اقتدار کے بغیر جو

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الفتن، باب قول النبیؐ سترون بعدی امورا تنکرونها۔
صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب وجوب طاعة الامراء فی غیر معصیة... الخ

شخص ان کا رہبر اور قائد ہوگا اس کے لیے بزور ان پر اپنا حکم چلانا ممکن نہیں ہے۔ اس کا اثر بالکل اخلاقی ہوگا۔ لیکن جب کوئی شخص کسی کو یہ حیثیت دے دے کہ وہ اس کا دینی رہنما ہے تو جب تک اس کی رہنمائی دین کے خلاف نہ ہو اس کے لیے اس کی اطاعت ضروری ہے۔ ورنہ یہ اس عہد کی خلاف ورزی ہوگی جو اس نے اپنے راہ نما سے کیا ہے۔ ایک مسلمان کے لیے یہ بہت بڑا امتحان ہے کہ وہ کسی شخص کو بہ رضا وخوشی اپنا امیر قرار دے اور بغیر کسی سیاسی دباؤ کے محض اس لیے اس کی اطاعت کرتا رہے کہ اللہ تعالیٰ نے جماعتی زندگی کو پسند کیا ہے اور جماعت کے بغیر دین کی صحیح خدمت نہیں ہوسکتی۔ یہ امتحان گو بہت سخت ہے لیکن جو لوگ دین کی خدمت کے لیے ایک جماعت بن گئے ہیں ان کو اس امتحان میں کامیاب ہونا پڑے گا، ورنہ کبھی وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔

حسنِ ظن

شریعت نے لوگوں کے دین و اخلاق کے بارے میں خواہ مخواہ کی قیاس آرائی اور ظن وگمان سے منع کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ:

اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (الحجرات:۱۲) بے شک بعض گمان گناہ ہوتے ہیں

جو شخص بلا وجہ کسی کے بارے میں شک وشبہ اور گمان سے کام لے، وہ اس کی طرف ایسی باتیں بھی منسوب کرسکتا ہے جن کی کوئی بنیاد نہ ہوگی۔ ظاہر ہے اس کا اسے کوئی حق نہیں ہے۔ بغیر کسی جرم کے کسی کو مجرم سمجھنا آدمی کی دینی و اخلاقی کم زوری کی دلیل ہے، جس سے ایک مومن کو بچنا چاہیے۔ قرآن کے الفاظ میں اہلِ ایمان بھائی بھائی ہیں۔ بھائیوں کے درمیان جس قسم کا تعلق مطلوب ہے اس کی بنیاد حسنِ ظن ہے۔ اگر حسنِ ظن ختم ہوجائے تو بھائی بھائی کا دشمن بن جاتا ہے اور باپ کو بچے پر اعتماد نہیں رہتا۔ حسنِ ظن سے بگڑے ہوئے تعلقات سنور جاتے ہیں اور بدگمانی سے اچھے تعلقات بھی خراب ہونے لگتے ہیں۔

ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان پر اصولاً اعتماد ہونا چاہیے۔ وہ اس کو اپنا خیر خواہ، رازدار، ہم درد اور امین تصور کرے اور اس کی طرف سے اپنی جان، مال اور اپنی عزت و آبرو کے لیے کوئی خطرہ نہ محسوس کرے۔ رسولِ اکرمؐ فرماتے ہیں ”مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ وہ نہ تو اس پر ظلم کرتا ہے، نہ اس کو بے یار و مددگار چھوڑتا ہے اور نہ اس کی تحقیر کرتا ہے۔ ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کی ہر چیز حرام ہے۔ اس کا خون بھی، اس کا مال بھی اور اس کی عزت و آبرو بھی۔“[1]

حسنِ ظن سے اعتماد پیدا ہوتا ہے اور بدگمانی اس اعتماد کو ختم کر دیتی ہے۔ جب کوئی شخص کسی سے بدگمان ہوجائے تو اس کی ہر چیز اسے کھٹکنے لگتی ہے۔ کبھی یہ بدگمانی اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ آدمی جس شخص سے بدگمان ہو اس کی تقریر کو، اس کی تحریر کو، اس کی بات چیت کو، اس کی سعی و جدوجہد کو، غرض اس کی ہر حرکت کو اس نظر سے دیکھنے لگتا ہے کہ وہ اسے نقصان پہنچانے یا رسوا کرنے کی تدبیر ہے۔ وہ پہلے سے اپنے ذہن میں یہ مفروضہ قائم کرلیتا ہے کہ اس کی ہر بات اور ہر کام لازماً اس کے خلاف ہوگا۔ پھر وہ اسی مفروضے کے تحت اس شخص سے اپنا رویہ متعین کرتا ہے۔ جب یہ بیماری کسی جماعت میں پیدا ہوجاتی ہے تو اس کے نظم کو درہم برہم کرکے رکھ دیتی ہے۔ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ گویا جماعت کا ہر فرد دوسرے کے خلاف سازش کر رہا ہے اور جماعت کسی اونچے مقصد کے لیے مصروف نہیں ہے بلکہ اس کا کام صرف یہ ہے کہ اپنے ساتھیوں کے خلاف سازش تیار کرے اور انھیں برسرِ عام رسوا کرے۔ یہ چیز جماعت کے وقار اور اس کی سرگرمیوں کے لیے سمِّ قاتل ہے اور انھیں ختم کرکے رکھ دیتی ہے۔

جماعت کے اندر ایسی فضا ہونی چاہیے کہ ہر شخص دوسرے کو اپنا مخلص، دوست، بھی خواہ اور ہم درد تصور کرے۔ یہ فضا حسنِ ظن کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ جماعت کا کوئی بھی فرد کسی فرد کو غلط کار نہ تصور کرے بلکہ نیک اور مخلص سمجھے۔ اگر اس کے خلاف اس تک کوئی بات پہنچے تو فوراً اس پر یقین نہ کرلے، بلکہ اس

---

[1] صحیح مسلم، کتاب البر و الصلة، باب تحریم ظلم المسلم ... الخ

کی کوئی اچھی سی تاویل کردے، یا اس کو بیان کرنے والے کی غلط فہمی سمجھ کر نظر انداز کر جائے۔ کسی شخص کی خامیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ضروری ہو تو جب تک قطعی معلومات حاصل نہ ہوں ان خامیوں کا ہرگز ذکر نہ کرے۔ کیوں کہ بلا تحقیق بات کہنا سخت گناہ ہے اور اگر معلومات حاصل کرنا اس کی دنیا و آخرت کے لیے مفید نہ ہو تو خاموشی اختیار کرلے۔ اسی میں اس کے دین اور اس کی دنیا دونوں کا فائدہ ہے۔

جماعت کے افراد کے درمیان چند خاص پہلوؤں سے حسنِ ظن کا پایا جانا ضروری ہے۔

۱- جو جماعت دین کی اتباع کے لیے وجود میں آئی ہے اس کے افراد کو ایک دوسرے کے دین و اخلاق اور سیرت و کردار کے بارے میں لازماً حسنِ ظن ہونا چاہیے۔ کیوں کہ اس میں جو لوگ بھی داخل ہوتے ہیں وہ اس قصد و ارادے کے ساتھ داخل ہوتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی کو دین کے سانچے میں ڈھالیں گے۔ ہمیں ان کو اپنے اس ارادے میں مخلص سمجھنا چاہیے۔ اس لیے کہ ہمارے پاس ان کے غیر مخلص ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ یہاں ہمیں اس حقیقت کو بھی نہیں فراموش کرنا چاہیے کہ جماعت میں ضعیف ارادے اور کم زور طبیعت کے لوگ بھی ہوتے ہیں جو خواہش اور کوشش کے باوجود دین پر پوری طرح عمل نہیں کر پاتے۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کے اندر ایک دینی جماعت سے وابستہ ہونے کے باوجود بعض مخالفِ دین خیالات اور رجحانات غیر شعوری طور پر موجود ہوتے ہیں، اس وجہ سے شعوری اور غیر شعوری طور پر ان سے مختلف خامیوں کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ یہ اصلاح کی کمی کا نتیجہ ہے۔ اگر ان کی اصلاح ہوجائے تو توقع ہے کہ وہ خود ہی اپنی خامیوں پر قابو پالیں گے۔ سب سے بڑی بات جسے کسی بھی وقت ہمیں نظر انداز نہیں کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ نیکی کے عزم کی وجہ سے انسان فرشتہ نہیں بن جاتا بلکہ انسان ہی رہتا ہے۔ اس لیے وہ غلطیوں سے بالکل پاک نہیں ہوسکتا۔ اس سے بھول چوک یقیناً ہوگی۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اس کے اندر دین کی اتباع کا جذبہ ہے یا نہیں۔ اگر یہ جذبہ ہے تو بڑی سے بڑی غلطی کے بعد بھی وہ

دین سے دور نہیں ہوگا بلکہ دین ہی کی طرف پلٹے گا اور کبھی اتنی قوت سے پلٹے گا کہ اپنی تمام کم زوریوں پر قابو پالے گا۔ اس لیے جس شخص کے اندر دین کی اتباع کا جذبہ موجود ہے اس کی کسی غلطی کو دیکھ کر آپ اس کے دین و ایمان کے بارے میں بدگمان نہ ہوں، بلکہ اسے انسانی کم زوری سمجھ کر اس کی اصلاح کی کوشش کریں۔ یہ آپ کے حق میں بھی مفید ہے اور اس کے حق میں بھی۔

۲- جماعت کے اندر اختلافِ رائے کا پایا جانا فطری ہے۔ یہ اختلاف اگر خلوص پر مبنی ہو تو جماعت کے لیے نقصان دہ نہیں ہے، بلکہ جماعت کے فکری ارتقاء کے لیے ایک حد تک ضروری بھی ہے۔ جماعت کے اندر اگر کوئی اختلافِ رائے ہی نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جماعت کی فکری قوت ختم ہوگئی ہے۔ جب بھی سوچنے سمجھنے والے چار افراد کسی مسئلے پر بحث کریں گے تو ان کے خیالات میں مکمل ہم آہنگی نہیں ہوسکتی۔ وہ اگر کسی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں تو اصول کی حد تک ان کے درمیان اتفاق ہوگا بلکہ لازماً اتفاق ہونا چاہیے۔ لیکن تفصیلات میں ضروری نہیں ہے کہ اتفاق ہی ہو۔ یہاں اختلاف بھی ہوسکتا ہے۔ اصول میں اختلاف ہونے لگے تو جماعت باقی نہیں رہ سکتی اور تفصیلات میں بھی اختلاف رائے کی راہیں بند کردی جائیں تو آزادانہ غور وفکر کی صلاحیت ختم ہوجائے گی اور جماعت میں فکری جمود پیدا ہوجائے گا۔

جماعت میں ایسی فضا ہونی چاہیے کہ جن مسائل میں ایک سے زیادہ رائیں ہوں ان میں ایک دوسرے کی رائے کا احترام کیا جائے اور اس کے بارے میں کسی بدگمانی کو جگہ نہ دی جائے۔ آپ کو یہ حق ہے کہ اپنی رائے کو صحیح اور دوسرے کی رائے کو غلط کہیں، لیکن یہ حق نہیں ہے کہ آپ اپنی رائے کو تو خلوص پر مبنی سمجھیں اور دوسرے کی رائے کو اخلاص سے خالی تصور کریں۔ کیوں کہ جماعت کے بارے میں جس طرح آپ مخلص ہیں اسی طرح وہ شخص بھی مخلص ہے جس کی رائے سے آپ کو اختلاف ہے۔ اس سے جماعتی معاملات میں اجتہادی غلطی تو ہوسکتی ہے، دیدہ و دانستہ انحراف نہیں ہوگا۔ آپ اس پر جماعتی نظریات سے انحراف اور بغاوت کا الزام بھی لگا سکتے ہیں لیکن اس

کے لیے مضبوط دلائل کی ضرورت ہوگی۔ محض ظن وتخمین کافی نہیں ہے۔

۳- عمل کے میدان میں جماعت کے تمام افراد ایک سطح پر نہیں ہوتے۔ بعض سست رفتار ہوتے ہیں اور بعض کی رفتار تیز ہوتی ہے۔ بعض جماعت کے کام میں شب و روز مصروف ہوتے ہیں اور بعض اس کے لیے کم وقت نکال پاتے ہیں۔ جماعت میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو جماعت کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرسکتے ہیں اور ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے اندر جذبۂ انفاق کم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جماعت کے تمام افراد اس مقصد کو یکساں جذب نہیں کرتے بلکہ ان میں اس پہلو سے کمی بیشی ہوتی ہے۔ اس کمی بیشی کا اظہار عمل سے ہوتا ہے۔ جہاں یہ کم زوری ہو آپ اس کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن اسے جماعت سے بے وفائی اور عدمِ تعلق کی دلیل نہ قرار دیں۔ ہاں بعض اوقات یہ کم زوری جماعت سے بے وفائی کا سبب بھی بن سکتی ہے۔ اس وقت یقیناً آپ کو اس پر تنقید کرنی چاہیے تاکہ جماعت اس کے ضرر سے محفوظ رہے۔ اگر یہ صورت نہیں ہے تو محض کسی کی عملی کم زوری کو اس کی نیت کا بگاڑ نہ کہیے اور یہ نہ سمجھئے کہ ہر غلط کام جماعت سے دوری یا غداری ہے۔ اس سے کسی کی کم زوری تو دور نہیں ہوگی البتہ اس کی اصلاح کے دروازے بند ہوجائیں گے۔

نصح وخیر خواہی

حضرت تمیم داریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے تین مرتبہ فرمایا:

اَلدِّیْنُ اَلنَّصِیْحَۃُ — دین نصیحت اور خیر خواہی ہے۔

ہم نے عرض کیا خیر خواہی کس کے ساتھ ہو؟ آپؐ نے فرمایا:

لِلّٰہِ وَلِکِتَابِہٖ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِاَئِمَّۃِ الْمُسْلِمِیْنَ وَ عَامَّتِہِمْ [1] — خیر خواہی ہو اللہ کے ساتھ، اس کی کتاب کے ساتھ، اس کے رسول کے ساتھ، مسلمانوں کے اماموں اور ان کے عوام کے ساتھ۔

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان ان الدین النصیحۃ۔ اس پر مزید بحث راقم کی کتاب 'معروف ومنکر' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

یہ ایک جامع حدیث ہے۔ اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جو جماعت دین کی خدمت اور اس کے احیاء کے لیے وجود میں آئی ہے اس کے لیے نصیحت اور خیر خواہی پر عمل کس قدر ضروری ہے۔

خیر خواہی کے معنی محدود نہیں ہیں، بلکہ یہ لفظ اپنے اندر وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ آپ کسی ایسے تعلق کو اپنے سامنے رکھیے جو خیر خواہی پر مبنی ہو۔ اس سے آپ کو اس کی وسعت کا اندازہ ہوگا۔ آپ جانتے ہیں، باپ اپنے بچے کا خیر خواہ ہوتا ہے۔ اس خیرخواہی کا تجزیہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ وہ بچے کی راحت و آسائش کو اپنی راحت اور آسائش پر مقدم رکھتا ہے، خود تکلیف اٹھاتا اور بچے کو آرام پہنچاتا ہے، اس کی ترقی، اس کی تعلیم و تربیت اور اس کی صحت کا فکر مند ہوتا ہے اور پھر یہ کہ ان تمام معاملات میں وہ بے غرض اور مخلص ہوتا ہے۔ وہ اس کی بے لوث خدمت کرتا ہے اور کسی پہلو سے بھی اس کی برائی نہیں چاہتا۔

خیر خواہی کا یہ جذبہ اگر جماعت کے اندر ابھر آئے تو ہر طرف محبت، ہم دردی، غم خواری اور یگانگت کی فضا چھا جائے اور تعلقات کی وہی نوعیت پیدا ہو جائے جو باپ اور بیٹے کے درمیان ہوتی ہے۔ خیر خواہی جماعت کا سرمایہ ہے۔ اس کے بغیر جماعت زندہ نہیں رہ سکتی۔ جماعت کے اندر مختلف پہلوؤں سے خیر خواہی کے جذبہ کا پایا جانا ضروری ہے۔

نظریات کے ساتھ خیر خواہی

ہر جماعت کا ایک نصب العین ہوتا ہے۔ وہ اپنے سامنے کچھ اصول و نظریات رکھتی ہے۔ ان ہی کی وجہ سے دوسری جماعتوں سے اس کا امتیاز قائم ہوتا ہے۔ جب تک اس کے سامنے اس کا نصب العین ہوگا اور وہ اپنے اصول و نظریات کی پابند رہے گی، اسے توانائی حاصل ہوگی، وہ زندہ رہے گی اور آگے بڑھے گی ورنہ ختم ہوجائے گی۔ اور اگر باقی رہی بھی تو اس میں اور دوسری جماعتوں میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ جو

جماعت دین کی دعوت اور اس کی سربلندی کے لیے قائم ہوئی ہے اس کے ساتھ خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے نصب العین اور نظریات کی حفاظت کی جائے اور اس بات کی پوری کوشش کی جائے کہ جماعت اپنے نظریات سے منحرف نہ ہونے پائے۔ اگر جماعت اپنے نظریات کو ترک کردے اور آپ اس پر خاموش ہوجائیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کو جماعت سے محبت نہیں ہے۔ آپ نہ تو اس کی نظریاتی بقا سے دل چسپی رکھتے ہیں اور نہ عدم بقا سے۔ آپ کو جماعت کے ہر اقدام کو اس پہلو سے دیکھنا ہوگا کہ آیا وہ اس کے نظریات کے موافق ہے یا مخالف؟ جہاں آپ جماعت کا کوئی قدم اس کے نظریات سے ہٹا ہوا دیکھیں، آپ کا فرض ہے کہ اسے جماعت کے نظریات کے تابع بنانے کی کوشش کریں۔ جب تک جماعت کے افراد جماعت کے نظریات کی حفاظت کے لیے چوکس نہ ہوں جماعت کا اپنے نظریات پر قائم رہنا دشوار ہے۔

جماعتی کام کے ساتھ خیر خواہی

جماعت کے ساتھ خیر خواہی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آپ جماعت کے کاموں میں پورا تعاون کریں۔ جماعت کی خدمت اس طرح انجام دیں، جیسے آپ اپنا کوئی ذاتی کام انجام دیتے ہیں۔ جماعت میں آپ کو جس محاذ پر لگایا جائے پوری ثابت قدمی اور مضبوطی کے ساتھ جمے رہیں اور جو کام آپ کے حوالے کیا جائے اسے دل جمعی، سکون اور اطمینان کے ساتھ انجام دیں۔ آپ جماعت کے بہترین خیر خواہ ہیں اگر آپ کے دل و دماغ پر صرف ایک فکر چھا جائے، وہ یہ کہ جماعت جس دعوت کو لے کر اٹھی ہے وہ دنیا میں پھیلے، فروغ پائے اور غالب و سربلند ہو۔ اگر آپ کی اس کیفیت میں کمی ہے تو جماعت کے ساتھ آپ کی خیر خواہی مکمل نہیں ہے۔

امیر کے ساتھ خیر خواہی

خیر خواہی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آپ اپنے امیر اور حاکم کے خیر خواہ ہوں، اس کی بھلائی چاہیں، اس کی کامیابی کے خواہش مند ہوں اور اس کے لیے دعا کریں،

اسے نیک مشورے دیں اور خوش دلی کے ساتھ اس کی اطاعت کریں، جس طرح صحیح کاموں میں اس کی معاونت نہ کرنا اس کے ساتھ بدخواہی ہے، اسی طرح غلط کاموں پر اسے نہ ٹوکنا بھی بدخواہی ہے۔

ماموریں کے ساتھ خیر خواہی

جماعت کے امیر اور حاکم کا بھی فرض ہے کہ وہ ماتحت افراد کا خیر خواہ ہو۔ انھیں دین پر قائم رکھے، ان کی صحیح رہنمائی کرے، ان کے ساتھ مساوات برتے، کسی کو کسی پر فوقیت نہ دے، کسی کی بدخواہی نہ کرے، کسی کے خلاف اپنے دل میں عناد نہ رکھے اور سب کے ساتھ محبت سے پیش آئے۔ امیر اور مامور کے درمیان جس قسم کا خلوص اور محبت اور جذبۂ خیر خواہی ہونا چاہیے اس کی وضاحت حضرت عوف بن مالک اشجعیؓ کی ایک روایت سے ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

خِيَارُ اَئِمَّتِكُمُ الَّذِيْنَ تُحِبُّوْنَهُمْ وَ يُحِبُّوْنَكُمْ وَ يُصَلُّوْنَ عَلَيْكُمْ وَ تُصَلُّوْنَ عَلَيْهِمْ وَ شِرَارُ اَئِمَّتِكُمُ الَّذِيْنَ تُبْغِضُوْنَهُمْ وَ يُبْغِضُوْنَكُمْ وَ تَلْعَنُوْنَهُمْ وَ يَلْعَنُوْنَكُمْ[1]

تمہارے بہترین امام وہ ہیں، جن سے تم محبت کرتے ہو اور جو تم سے محبت کرتے ہیں اور جو تم کو دعائیں دیتے ہیں اور جن کو تم دعائیں دیتے ہو تمہارے بدترین امام وہ ہیں، جن کو تم ناپسند کرتے ہو اور جو تم کو ناپسند کرتے ہیں، جن پر تم لعنت بھیجتے ہو اور جو تم پر لعنت بھیجتے ہیں۔

عام افراد کے درمیان خیر خواہی

جماعت کے عام افراد کے درمیان بھی خیر خواہی کا جذبہ ہونا چاہیے۔ وہ ایک دوسرے کو بھلائی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں۔ راہِ راست پر چلنے کی ترغیب دیں اور دین پر ثابت قدم رکھنے کی کوشش کریں۔ دینی معاملات ہی میں نہیں، دنیوی کاموں میں بھی ایک دوسرے کے ساتھی، بہترین مشیر اور مددگار ہوں، ان کے درمیان بھائیوں کے سے تعلقات پائے جائیں اور وہ ایک دوسرے کی دل سے بھلائی چاہنے والے اور سچے ہم درد و غم خوار بن کر رہیں۔

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الامارة، باب خیار الائمة و شرارهم

جب آپ دین کی خدمت کے لیے کسی جماعت سے منسلک ہیں تو یہ بات آپ کو نہیں بھولنی چاہیے کہ اس کی اصلاح و تربیت اس کے ذمے داروں ہی کا نہیں بلکہ آپ کا بھی فرض ہے۔ یہ آپ کا بھی کام ہے کہ جماعت کے کسی فرد میں کوئی خامی دیکھیں اسے دور کرنے کی کوشش کریں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بہت مشکل کام ہے لیکن یہ مشکل کام آسان ہوسکتا ہے اگر آپ کے اندر افرادِ جماعت کے ساتھ خیر خواہی کا مخلصانہ جذبہ موجود ہو اور آپ ان کے عیب چیں اور ناقد بن کر نہیں بلکہ ان کے ہم درد اور بہی خواہ بن کر ان کی اصلاح کی کوشش کریں۔ اس جذبے کے بغیر آپ ان کی اصلاح کی کوئی پائے دار کوشش نہیں کرسکتے اور کسی وقتی جذبے کے تحت کریں بھی تو اس کے اچھے نتائج نہیں نکل سکتے۔ جب تک کوئی شخص آپ کو اپنا خیر خواہ نہ سمجھے، آپ کی بات نہیں سنے گا اور سنے گا تو اس سے وہ اثر نہیں لے گا جو لینا چاہیے۔ لیکن اگر خدانخواستہ وہ آپ کو اپنا بدخواہ تصور کرے تو آپ کی بات کا اس پر الٹا اثر پڑے گا۔ خیر خواہی ایسی چیز نہیں ہے کہ آپ اس کا دعویٰ کریں اور مخاطب اس پر فوراً ایمان لے آئے بلکہ اس کے لیے آپ کو اپنا پورا رویہ بدلنا ہوگا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ اپنی بات چیت سے، اپنے کردار سے اور اپنے عمل سے خیر خواہ ہونا ثابت کریں۔ اصلاح کا وہ انداز اختیار کریں جس میں دل آزاری نہ ہو، بلکہ محبت اور ہم دردی ہو اور یہ محسوس ہو کہ آپ فی الواقع اصلاح چاہتے ہیں۔ کسی میں کوئی خامی دیکھیں تو برملا اس کا اظہار نہ کریں بلکہ تنہائی میں اسے بتائیں۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ "جو نصیحت تنہائی میں ہو وہ یقیناً نصیحت ہے، اور جو نصیحت لوگوں کے درمیان ہو وہ فضیحت ہے۔" یاد رکھیے کسی کی پردہ دری کرنا بہت بڑا گناہ ہے، جو شخص کسی کو رسوا کرنا چاہے، اللہ تعالیٰ اس کو رسوا کر دیتا ہے اور جسے اللہ رُسوا کرے اس کی آبرو کوئی نہیں بچا سکتا۔

جلال الدین
۱۶/اپریل ۲۰۱۶ء